۵۰

حمید دلوائی

نیر مسعود

سیمین دانشور

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ ۵۰

اگست ۲۰۰۵ء

طباعت: ذکی سنز پرنٹرز، کراچی

رابطے کے لیے پتا

آج کی کتابیں

316 مدینہ مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 5213916 5650623

ای میل: city_press@email.com, aajquarterly@gmail.com

سالانہ خریداری

پاکستان: ایک سال (چار شمارے) ۳۰۰ روپے (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) ۳۰ امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک خریداری کے لیے پتا:

Dr. Baidar Bakht

21 White Leaf Crescent

Scarborough, Ontario M1V 3G1, Canada.

Phone: (416) 292 4391

Fax: (416) 292 7374

E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

ترتیب

حمید دلوائی

۷

ایندھن

(ناول)

***

نیر مسعود

۱۳۷

آزاریان

۱۴۷

دُنبالہ گرد

***

Scanned with CamScanner

سیمین دانشور
۱۶۵
بی بی شہر بانو
۱۸۳
بہشت جیسا شہر
۲۰۵
کسے سلام کروں؟
۲۱۹
پیدائش

Scanned with CamScanner

نئی کتابیں

گم شدہ خطوط
اور دیگر تراجم
انتخاب اور ترجمہ: محمد عمر میمن
پیپر بیک: Rs. 90

منتخب تحریریں
نرمل ورما
ترتیب: اجمل کمال
مجلد: Rs. 280

منتخب کہانیاں
ویکوم محمد بشیر
ترتیب: مسعود الحق
مجلد: Rs. 180

Scanned with CamScanner

نئی کتابیں

لغاتِ روزمرہ

شمس الرحمٰن فاروقی

پیپر بیک: Rs. 150

مجلد: Rs. 250

کارل اور اینا

(منتخب ترجمے)

انتخاب اور ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن

پیپر بیک: Rs. 80

خیمہ

میرال طحاوی

ترجمہ: اجمل کمال

پیپر بیک: Rs. 75

Scanned with CamScanner

حمید دلوائی

ایندھن

(ناول)

مراٹھی سے ترجمہ:
گوری پٹ وردھن
اجمل کمال

Scanned with CamScanner

اگلے صفحات میں حمید دلوائی (۱۹۳۲ء-۱۹۷۷ء) کے مراٹھی ناول "ایندھن" کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ حمید دلوائی بھارتی ریاست مہاراشٹر کے دیہی خطے کونکن کے مقام چپلن کے رہنے والے تھے، اور زیرِ نظر ناول کا محلِ وقوع بھی یہی علاقہ ہے۔ جاگیرداری نظام کے خاتمے سے پہلے اس علاقے میں زمیندار مسلمان تھے اور ذات پات کے ہندو نظام میں شامل، اور اس نظام سے خارج مختلف طبقے ان کے لیے کام کیا کرتے تھے۔ اس ناول کے واقعات ۱۹۶۰ء کی دہائی کے اوائل برسوں میں پیش آتے ہیں جب آزادی اور تقسیم ہند کو لگ بھگ پندرہ برس کا عرصہ گزر چکا ہے اور ہندوستانی معاشرے میں آنے والی گہری اور دور رس تبدیلیوں اور سیاست کے بدلتے ہوئے خدوخال نے مختلف مذہبوں اور ذاتوں سے تعلق رکھنے والی برادریوں کے باہمی رشتوں کو اپنے اپنے طور پر متاثر کیا ہے۔ کہانی کے راوی میں خود سوانحی عنصر موجود ہے، جس سے واقعات کو غیر جانبداری سے بیان کرنے میں مدد ملی ہے، جبکہ کرداروں کی تشکیل میں مشاہدے اور تخیل سے بھرپور کام لیا گیا ہے۔ ایک روایتی معاشرہ تبدیلی کے عمل سے گزرتے ہوئے کس قسم کے دباؤں اور کشیدگیوں سے دوچار ہوتا ہے اور تبدیلی کے عمل کو کیونکر انسانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان نفرت کی آگ بھڑکانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اس ناول میں اسے پورے فنی ضبط اور مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول کا ایک خاص پہلو اس کے دیہی زرعی محل وقوع کے آتے جاتے موسموں کا گہرا احساس ہے جسے بڑی خوبی کے ساتھ افسانوی بیانیے میں سمویا گیا ہے۔

حمید دلوائی نے اس ناول کے علاوہ مراٹھی میں کہانیاں بھی لکھیں جن کا ایک مجموعہ "لاٹ" (لہر) کے عنوان سے شائع ہوا۔ وہ اپنی سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر زیادہ معروف، اور ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف طرزِ فکر رکھنے والے گروہوں کے درمیان خاصے متنازعہ رہے ہیں۔ انھوں نے بمبئی میں سوشلسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی، لیکن پھر اسے چھوڑ کر خود کو ہندوستانی مسلم سماج میں اصلاحات لانے، خصوصاً مسلمان عورتوں کو حقوق دلوانے کی مہم کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے انڈین سیکولر سوسائٹی اور مسلم ستیہ شودھک منڈل نامی تنظیموں کی بنیاد رکھی اور ۱۹۴۷ء کے بعد کے ہندوستان میں مسلمانوں کے ممکنہ سیاسی رول کے بارے میں اپنا موقف، جسے مسلمانوں میں بہت کم پذیرائی حاصل ہوئی، کئی کتابوں میں پیش کیا، جن میں ان کی انگریزی کتاب *Muslim Politics in India* زیادہ مشہور ہے۔

اس ناول کا ترجمہ براہِ راست مراٹھی سے کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ناول کے انگریزی اور ہندی ترجموں کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس مشترکہ ترجمے کا پہلا مسودہ اکتوبر-نومبر ۲۰۰۴ء میں نیپال میں مکمل کیا گیا۔

Scanned with CamScanner

۱

میں اسٹیٹ ٹرانسپورٹ کی بس سے بازار میں اترا اور قصبے کی طرف چلنے لگا۔

سورج کو بادلوں نے یوں ڈھانپ رکھا تھا جیسے دیے کے کانچ پر مکڑیوں کے جالے لگے ہوں۔ راستہ ٹیڑھا میڑھا اور چڑھائی والا تھا، جس کے بعد گہری ڈھلان تھی۔ سڑک کے کنارے پر مہندی کی جھاڑیاں تھیں جن کے پتوں پر بارش کی بوندیں اب تک لگی ہوئی مسلسل چمک رہی تھیں۔ راستے کے دونوں طرف اگے ہوئے دھان کے کھیتوں میں جھولتے زرد خوشوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ دن ڈوبنے سے پہلے ہی اندھیرا چھا گیا تھا اور لوگ بازار سے قصبے کی طرف یوں لپک رہے تھے جیسے کوئی وحشی بیل رسی تڑا کر حملہ آور ہو رہا ہو۔

مجھے ان میں سے کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ میں بھی ان کو نہیں پہچانتا تھا۔ مگر میں اس علاقے سے واقف تھا... بازار کی سڑکیں اب تارکول کی بن چکی تھیں۔ لیکن آگے کی سڑک کی پرانی شان اب بھی برقرار تھی۔ کچھ جھونپڑیوں جیسے مکانوں کی چھتیں اب منگلوری کھپریلوں سے ڈھک چکی تھیں۔ لیکن ان کے گرد لگی ہوئی کانٹے دار باڑھ اب بھی پرانی وضع پر قائم تھی... راستے میں پڑنے والے ہمارے قصبے کے قبرستان میں پیر کی نئی تربت ابھری دکھائی دے رہی تھی۔ پچھلے دس برسوں میں قبرستان میں کتنی ہی قبریں کھودی گئی ہوں گی۔ قبرستان بھر جانے کی وجہ سے قصبے والے دوسری جگہ کی تلاش میں ہیں، میں نے بمبئی میں سنا تھا: لیکن یہ اب تک استعمال میں تھا۔ بارش سے وہاں گھنٹوں تک اونچی گھاس ہر

Scanned with CamScanner

طرف پھیل گئی تھی اور وہ تین بھینسیں پونچھ ہلاتی ہوئی چر رہی تھیں۔

مجھے چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ میرا بیگ زیادہ وزنی نہیں تھا، پھر بھی اسے سنبھالنا بھاری لگ رہا تھا۔ ساری جان درد کے مارے چھاتی میں جمع ہو گئی تھی۔ ہر قدم لگتا تھا دل کی دھڑکن کے ساتھ لڑکھڑا رہا ہے۔ یہ احساس کہ اب اپنے کمزور دل کو مسلسل سنبھالنا پڑے گا، میرے ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا۔ اور اب پندرہ برس کے بعد اس مرض سے نمٹنے کے لیے آرام کرنے کی غرض سے میں قصبے کو لوٹ رہا تھا۔

سڑک کی تیکھی چڑھائی چڑھ کر اوپر پہنچا تو مجھے اپنا دم نکلتا محسوس ہوا۔ میں ہانپتا ہوا کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ آگے سڑک بل کھا کر نیچے اتر رہی تھی۔ وہیں آگے پہاڑی کی ڈھلان پر ایک کے اوپر ایک بنے ہوئے قصبے کے مکان دکھائی دینے لگے تھے۔ پہاڑی کے قدموں کو چاٹ کر سڑک سانپ کی طرح لہرا کر غائب ہو گئی تھی، اور داہنے ہاتھ پر واشِشٹھی ندی کا، دھنک کی کمان جیسا خم دار، لبالب بھرا ہوا پاٹ پھیلا تھا۔ اسے روک کر کمان کا خم دینے والی پچھم کے پہاڑوں پر سے آنے والی ہوا اب میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ میں ڈھلان اتر کر آگے چل پڑا۔

دھیرے دھیرے اندھیرا چھانے لگا اور میرے گھر پہنچتے پہنچتے بالکل اندھیرا ہو گیا۔ سڑک پار کرتے میں قصبے کی گلی میں داخل ہوا اور اینٹوں کے بنے راستے پر چڑھ کر گھر پہنچ گیا

گھر کا صدر دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

''کون ہے؟'' اندر سے والد کی آواز سنائی دی۔ ''دروازہ کھلا ہے۔''

میں نے دروازے کو دھکیلا۔ دالان میں بڑی آرام کرسی پر ان کا دبلا بدن پڑا ہوا تھا۔ اندھیرے میں صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے سیڑھی چڑھ کر اندر قدم رکھا۔ لگتا تھا دالان کے فرش کی بہت دنوں سے پتائی نہیں ہوئی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ گھر کی جھاڑ پونچھ بھی اب کوئی پہلے کی طرح مستعدی سے نہیں کرتا۔ فرش پر ہر طرف چڑیاں سی بکھری ہوئی تھیں۔ وہیں بابا کی پی ہوئی بیڑیوں کے ٹوٹے بھی پھیلے ہوئے تھے۔

میری موجودگی کو محسوس کرتے انھوں نے گردن میری طرف گھمائی۔ اس اندھیرے میں مجھے پہچاننے کے لیے انھوں نے اپنی آنکھیں بار بار جھپکیں، پھر دونوں ہاتھوں کا چھجا بنا کر غور سے میری

Scanned with CamScanner

طرف دیکھ۔ پھر بھی وہ مجھے نہ پہچان سکے۔

''کون ہے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''میں...''

تب انھوں نے مجھے پہچانا۔ شاید انھیں میری آواز سے پتا چلا ہوگا۔ ''تم؟'' انھوں نے پوچھا، پھر بڑبڑا کر خود سے بولے، ''لگتا ہے آ گیا!'' پھر میری طرف مخاطب ہو کر زور سے پوچھا، ''آ گئے؟''

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ اچانک خاموش ہو گئے۔ مجھے گمان ہوا کہ ان کی آنکھیں بھر آئی ہیں۔ آنسو کچھ دیر ان کے جھریوں بھرے گالوں پر بہتے رہے۔ میں نے سوچا ان کا غبار نکل جائے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے اپنی لنگی کے کنارے سے چہرہ پونچھا۔ پھر پوچھا

''کب نکلے تھے؟''

''صبح، ایس ٹی سے۔''

''طبیعت کیسی ہے اب؟''

''ٹھیک ہے۔''

''دل کی بیماری ہے؟''

''ہاں۔ مگر فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے آرام کرنے کو کہا ہے۔''

''اچھا۔ اب آ گئے ہو تو آرام کرنا۔''

''ہاں۔''

وہ پھر چند لمحے ساکت رہے۔ پھر بولے، ''جاؤ، اندر جاؤ۔ بھابی کھانا پکا رہی ہے۔ نہا دھو، کھانا کھا کر آرام کرو۔ آنے کی چٹھی کیوں نہیں لکھی؟''

''اچانک طے کیا۔''

''مگر تار تو کر سکتے تھے۔ بھائی تمھیں لینے بازار نہ آتا...''

میں کچھ نہ بولا۔ میں خود ہی اپنے آنے کا ڈھول نہیں پیٹنا چاہتا تھا۔ اب پندرہ برس بعد یہی واپسی کا اعلان کرتے ہوئے مجھے ڈر لگ رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

"اچھا، اب جاؤ۔"

میں اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا گھر میں گیا۔ باورچی خانے میں مٹی کے تیل کے چراغ کی ٹمٹماتی روشنی میں بھابی کھانا پکانے میں جٹی ہوئی تھی۔ میں اس کے اوپر کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ بھابی چونک کر کچھ دیر مجھے پہچانے بغیر تکتی رہی، پھر ایک دم اٹھ کر میرے پاس آ گئی۔

"تم کب آئے؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"ابھی۔"

اسے جیسے یقین نہ آیا۔ "اور بتایا بھی نہیں؟ بیگ یہاں تک خود اٹھا کر لائے؟ تمھیں لینے کوئی نہ آتا کیا؟"

"ارے، مگر میرا آنے کا ارادہ ہی کب تھا۔"

"وہ تو مجھے پتا ہے۔ پندرہ برس بعد آنے کو جی چاہا، یہی ہماری خوش نصیبی ہے۔" اپنے شوہر کو مخاطب کر کے وہ اونچی آواز میں بولی: "اجی، دیکھو کون آیا ہے۔"

بھائی پچھلے دروازے میں ٹانگیں باہر لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پھر اٹھ کر اندر آیا۔ اس کا بدن ڈھلتا ہوا لگ رہا تھا۔ گزرے ہوئے پندرہ برسوں کے زخموں کے نشان اس کے پورے بدن پر محسوس ہوتے تھے۔ وہ عید کے دن کی طرح مجھے گلے لگا کر ملا۔ پھر الگ ہو کر اسی جگہ جا بیٹھا۔

"لگتا نہیں تھا اب تم آؤ گے،" بھابی پھر چولھے کے پاس جا کر روٹی تھاپتے ہوئے بولی۔

"مگر کیوں؟" میں نے احمقوں کی طرح پوچھا۔

"لگتا کیسے؟ پندرہ برس میں کتنی بار آئے ہو؟"

"پندرہ برس میں کبھی یہاں آنا ہی نہیں ہوا..."

"طبیعت کا کیا حال کر لیا ہے۔"

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ پھر کچھ دیر بعد پوچھا، "تمھاری طبیعت کیسی ہے؟"

"کیسی دکھتی ہے؟"

Scanned with CamScanner

بھائی بہت ڈھل گیا تھا۔ لیکن وہ پہلے جیسی ہی دکھائی دیتی تھی۔ اور میں اسے اتنے برسوں بعد دیکھ رہا تھا۔ یہ پندرہ برس بھائی کو رگیدتے ہوئے گزرے تھے، لیکن بھابی کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے یہ وقت گزرا ہی نہ ہو۔ وہ شادی کے بعد گھر میں آئی تھی کہ میں نے گھر چھوڑا۔ اس دوران میں گھر نہ آیا اور وہ، بہت سے نشیب و فراز جھیل کر، اس گھر کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے برتاؤ کو کسی کی یاد کھ سے آلودہ نہیں ہونے دیا تھا۔

اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ایک بار بازار کے ڈاکٹر نے بھائی کو بمبئی میں کسی اسپیشلسٹ کو دکھانے کا مشورہ دیا تھا۔ اس پر بھائی اسے لے کر ایک بار بمبئی آیا تھا۔ مگر اس کو بھی اب دس سال ہو چکے تھے۔ اس کے بعد میں نے اسے دیکھا تک نہ تھا۔ لیکن وہ باقاعدگی سے محرم کا میدہ مجھے ہر سال بمبئی بھیجتی تھی۔ جب میں بیمار پڑا تو اس نے کسی بمبئی آنے والے کے ہاتھ مجھے گھر کا بنا ہوا گھی بھجوایا تھا۔ اور اسی کے ہاتھ گھر آنے کا پیغام بھی بھیجا تھا۔ ان پندرہ برسوں میں اس نے مجھے کوئی چٹھی نہیں لکھی۔ مگر بابا یا بھائی کی لکھی ہوئی چٹھی پڑھتے ہوئے مجھے لگتا کہ اس کا مضمون اسی کا ہے۔ میں نے ہنس کر کہا:

''تمہاری طبیعت تو پہلے جیسی لگتی ہے۔ لیکن بھائی ایسا کیوں دکھائی دے رہا ہے؟''

''دیکھو...'' اس نے تاکید سے کہا، ''دیکھو کیا ہوا ہے۔''

بھائی آپ ہی آپ مسکرایا۔ اس کا نرخرہ اوپر نیچے ہونے لگا۔ اور میں نے سوچا اس کی اس حالت کا میں بھی تو ذمے دار ہوں۔ میں نے گھر کی تمام ذمے داری ٹال دی۔ اپنی زندگی بھی تباہ کر لی اور اسے بھی مصیبت میں ڈال دیا۔ گھر میں میری چھوڑی ہوئی کمی بھی اسی نے پوری کی۔ اپنے بوجھ کے ساتھ ساتھ میری جھٹکی ہوئی ذمے داریوں کا بوجھ بھی اسی نے اٹھایا۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے کام چور بیل کے ساتھ گاڑی کھینچنے والے دوسرے بیل کی ہوتی ہے۔ جوے کا پورا بوجھ اس نے اپنے جھکے ہوئے کاندھے پر اٹھائے رکھا۔

وہ ہنسا اور مجھے کسی ایسے بیل کا خیال آیا جو دکھتے ہوئے کندھے پر کمر توڑ بوجھ فرمانبرداری سے اٹھائے ہوئے، رکی ہوئی گاڑی کو پھر سے کھینچنا شروع کر رہا ہو۔ مجھے بے بسی اور اذیت کا احساس ہوا۔ اس کی ہنسی تھمی تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا کچھ دیر بعد بولا:

"یقین نہیں آتا کہ تم واقعی آگئے ہو... لوگوں کو خبر ملی تو حیرت میں پڑ جائیں گے..."

"حیرت کی کیا بات ہے؟ انھیں تو میں یاد بھی نہیں ہوں گا۔"

"واہ، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تمھاری تصویریں دیکھتے رہتے ہیں۔"

بھابی آٹا گوندھتے ہوئے بیچ میں بولی، "آج کل تو بچے بھی اخبار پڑھنے لگے ہیں۔ گاؤں میں دسیوں اخبار آتے ہیں۔"

"لوگ اخبار خرید کر پڑھتے ہیں؟"

"ہاں۔ پہلے کی طرح نہیں جب اخبار پڑھنے کے لیے چپلون جانا پڑتا تھا،" بھائی نے زور دے کر کہا۔ "جب تمھاری خبر چھپتی ہے تو لوگ اور زیادہ خریدتے ہیں۔ وہ بابا کو لا کر دکھاتے ہیں۔"

"مجھے بابا کیا کہتے ہیں؟" میں نے مذاق میں پوچھا۔

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر چہرے کے سنجیدہ تاثر کو کوشش سے بدل کر بولا، "کچھ خاص نہیں۔ بس کہتے ہیں حمید ٹھیک ہے... مگر خدا کو نہیں مانتا یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

اور وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔

جب مجھے دل کا دورہ پڑا تو ڈاکٹر نے مجھے بمبئی سے باہر جا کر آرام کرنے کی صلاح دی تھی۔ لیکن اس وقت علاج چل رہا تھا اور مجھ میں فوری سفر کی طاقت نہ تھی۔ اس لیے میں کہیں نہ گیا۔ کچھ دن بعد جب میری حالت کچھ بہتر ہوئی تو ڈاکٹر نے دوبارہ مجھے کہیں جا کر آرام کرنے کو کہا۔ "شہر سے باہر کہیں چلے جائیے،" اس نے کہا۔ "لمبا آرام کیے بغیر آپ کی حالت نہیں سنبھلے گی۔"

تب بھی مجھے اپنے گاؤں لوٹنے کا خیال نہیں آیا۔ میں نے پونا جانے کا ارادہ کیا۔ تب تک میری بیماری کی خبر گھر پہنچ گئی اور والد نے خط لکھ کر مجھے گھر آنے کو کہا۔

ان کے خط باقاعدگی سے آیا کرتے تھے۔ شروع شروع میں مجھے ان خطوں میں میرے دور جانے کی تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ بعد میں میرا یہ احساس دھیما پڑتا گیا۔ پندرہ سال پہلے سیاست کے ریلے میں بہہ کر جب میں نے گھر چھوڑا اب ہمارے راستے الگ ہو گئے تھے، لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ان پندرہ برسوں میں میں کبھی گھر نہیں آؤں گا۔ وہ ہر خط میں مجھے گھر آنے پر آمادہ کرنے

Scanned with CamScanner

کی کوشش کرتے۔ ان کے خطوں کا میں کبھی بروقت جواب نہ دیتا۔ میں انتظار کرتا کہ تین چار خط جمع ہو جائیں، اور پھر ایک پوسٹ کارڈ پر دو چار سطریں گھسیٹ کر بھیج دیتا اور چھٹی پالیتا۔ گھر آنے کے مطالبے کا میرے خط میں اکثر کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھار میں انھیں لکھ دیتا کہ میں کام کے باعث بہت مصروف ہوں اور فی الحال گھر آنے کی فرصت نہیں ہے۔ وہ میرے اس جواب پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کرتے۔

پندرہ سال پہلے میں نے ایک خاص صورت حال میں گھر چھوڑا تھا۔ تب مجھے سیاست کی کچھ زیادہ سمجھ بوجھ بھی نہ تھی۔ لیکن اسلام کے احیا کا خیال جس طرح تمام مسلمانوں کو جذباتی بنا دیتا ہے، اس کا میرے ذہن پر کبھی کوئی اثر نہ ہوا۔ میں راشٹر سیوا دل[1] سے وابستہ تھا اور سر پر گاندھی ٹوپی پہنتا تھا۔ ان دنوں گاندھی ٹوپی پہننا خود ہی اسلام سے غداری کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔

آزادی کے بعد صورت حال بدل گئی۔ مسلمان سماج کا جوش کم ہو گیا۔ لیکن میرے تئیں ان کی تلخی میں کوئی کمی نہ آئی۔ میں سیاست میں زیادہ سے زیادہ ملوث ہوتا گیا۔ آخر کار پارٹی کے کام کی خاطر بمبئی نکل آیا۔ تب تک والد کے اور میرے ذہن کا فاصلہ بہت بڑھ چکا تھا۔ جب میں نے بمبئی جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے اس کی مخالفت نہ کی، لیکن انھیں میرا فیصلہ پسند نہ آیا تھا۔ انھوں نے پوچھا

''ساری عمر یہی کرو گے؟ اور کماؤ گے نہیں؟ پیٹ نہیں بھرو گے؟ اپنا، اپنے کنبے کا؟''

میں نے انھیں جواب نہ دیا، اور ایک آدھ دن میں گھر چھوڑ کر نکل گیا۔

اس کے بعد گھر جانے کا خیال مجھے عجیب سا لگتا۔ مجھے یہ خوف ہمیشہ لاحق رہتا کہ فرض کا جو بوجھ میں نے کبھی آسانی سے اتار پھینکا تھا، وہ مجھ پر دوبارہ لاد دیا جائے گا۔ میں جانتا تھا میرے گاؤں کے مسلمان مجھے پہلے کی طرح پھٹکاریں گے۔ ان کے درمیان رہتے ہوئے ان سے دوری کا احساس

۱۔ راشٹر سیوا دل انڈین نیشنل کانگریس میں شامل سوشلسٹوں نے یہ رضاکار تنظیم ہندو فرقہ پرست تنظیم راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (RSS) کا سیاسی طور پر مقابلہ کرنے کی غرض سے ۱۹۴۰ء کی دہائی میں قائم کی تھی۔ اس تنظیم کے منشور میں گاندھی کے سیاسی فلسفے کو سوشلسٹ تصورات سے ہم آہنگ کر کے ہندوستان کی آبادی کے مختلف گروہوں کو قومی ترقی اور یک جہتی کے کام میں شامل کرنے پر زور دیا گیا تھا۔

میرے ذہن سے اب بھی دور نہ ہوا تھا۔

میرے بیمار پڑنے کے بعد والد نے ایک بار پھر خط میں مجھ سے گھر آنے کا مطالبہ کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری دوری سے پیدا ہونے والی تکلیف اس خط میں دوبارہ بھر آئی ہے، اور آرام کرنے کے لیے گھر چلے آنے کا خیال میرے ذہن میں آیا۔ تب ایک دن اپنے کچھ کپڑے، ڈاکٹر کا نسخہ اور چند کتابیں ایک بیگ میں ڈال کر میں نے ایس ٹی کی بس پکڑ لی۔

اگلے دن محسوس ہوا ہمارے پورے گھر کی کایا ہی پلٹ گئی ہے۔

بھابی نے پورا گھر جھاڑ پونچھ کر صاف کر ڈالا۔ فرش پر گوبر سے لپائی کرائی۔ بابا نے اپنی آرام کرسی میرے حوالے کر دی۔ میں اس آرام کرسی پر دن بھر بیمار رہنے لگا اور وہ برآمدے کے چبوترے پر تکیے کی ٹیک لگا کر بیٹھنے لگے۔

میرے آنے کی خبر سن کر لوگ مجھے دیکھنے آنے لگے۔ لوگوں کے برتاؤ سے اسی بات پر تعجب ظاہر ہوتا کہ میں پندرہ برس بعد گھر لوٹ آیا ہوں۔ ان میں سے کچھ لوگ میری عیادت کرنے آتے تو بابا انھیں میری بیماری کی تفصیل بتاتے، اور سننے والوں کو ایسا لگتا جیسے انھیں دل کی بیماری کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔

پندرہ بیس دن میں نے گھر سے باہر قدم نہ رکھا۔ آرام کرنے سے میری حالت پر اچھا اثر پڑا۔ میرے بدن میں توانائی لوٹنے لگی اور اعضا میں جان سی پڑنے لگی۔ میری سوکھی پتلی کلائیاں بھرنے لگیں۔ دھنسی ہوئی آنکھیں ابھرنے لگیں۔ جلد کی رنگت جو پیلی پڑ گئی تھی، اس میں پھر سرخی سی آنے لگی۔ مجھے خود میرا بدن جوش سے بھرا محسوس ہونے لگا۔

اور پھر دیوالی آئی۔ دھنکی ہوئی روئی جیسے بکھرے بادل آسمان سے غائب ہو گئے۔ دھان کی کٹائی پوری ہوئی... وادی میں اگے ہوئے کھیت ویران ہو گئے۔ واششٹھی ندی کا بارش سے میٹھا پانی پھر سے بے مزہ ہو کر کھاری ہونے لگا۔ اور ڈھنک کی نال کی شکل کے ندی کے چوڑے پاٹ میں جوار آنے پر مچھلی پکڑنے والے پرندے حوصلے لگانے لگے۔

بارشیں ختم ہوئیں اور دھیرے دھیرے دھول اڑنے اور ٹھنڈی نرم ہوا کے ساتھ چھتوں پر بیٹھنے لگی۔ برسوں بعد میں نے کسی نو آموز کی طرح یک بار پھر موسم کو بدلتے محسوس کیا۔ یہ دھول ابھی اسی طرح جمتی رہنے والی تھی۔ ہر روز کی من بھر دھول۔ وہ مکانوں کے اوپر ہوا میں غبار بن کر ٹھہرنے والی تھی۔ فرش پر اس کے ڈھیر جمع ہونے والے تھے، جنھیں ہٹانے کی کوئی زحمت نہ اٹھاتا۔ آخر اسے کون جھاڑے، کتنی بار جھاڑے۔ اور اس کا فائدہ کیا۔ دھول تو روز اڑے گی اور آ کر بیٹھے گی۔ جمع ہوگی اور اپنے آپ صاف ہو جائے گی! برسات آنے سے پہلے سب لوگ اپنے گھر جھاڑ پونچھ کر صاف کریں گے اور دھول کے ڈھیر اٹھا کر اپنے گھروں کے پچھواڑے صحن میں لا پھینکیں گے۔ پھر ایک دن بارش کی بھاری، گول طوفانی بوندیں دھول کے ڈھیروں پر گریں گی۔ وہ پہلے بارش کی بوندوں کو خود میں جذب کرنے اور پھر سے اٹھنے کی کوشش کرے گی، بارش کی ٹھنڈی بوندوں کو پی جانے کی کوشش کرے گی، لیکن ناکام رہے گی۔ آخر کار دھول سے ایک سوندھی مہک اٹھے گی، جس سے دانتوں میں میٹھا درد جاگ اٹھے گا، اور وہ بارش میں گھل جائے گی۔ اگلی فصل کی کٹائی کے بعد پھر سے گھر گھر میں نمودار ہونے کے لیے غائب ہو جائے گی!

صبح کے وقت اب کہرا پڑنے لگا تھا۔ سورج ابھرنے پر دھند غائب ہو جاتی۔ لیکن واششھی ندی کے پاٹ کے اوپر منڈلاتی رہتی۔ میں پچھواڑے کے صحن میں آ کر بیٹھنے لگا۔ اور ہوا کے ساتھ بہہ کر آتی ہوئی دھول کو اپنے چہرے پر محسوس کرنے لگا۔

رفتہ رفتہ میں نے گھر سے باہر نکلنا شروع کیا۔ شام کے وقت دو تین فرلانگ چل کر مجھے پہاڑی کی ڈھلان پر سجا ہوا پورا قصبہ دکھائی دینے لگتا اور پندرہ برسوں میں ہو چکی تبدیلیوں کے نشان محسوس ہونے لگتے۔ قصبے سے گزر کر مشرق سے مغرب کی سمت جانے والی سڑک اب باہر سے چکر کاٹ کر جاتی تھی۔ اب اس کے بل نکالے جا چکے تھے اور وہ قصبے سے آدھ فرلانگ باہر سے گزرتی تھی اور بالکل سیدھی معلوم ہوتی تھی۔ مغرب کی طرف کرانے کی دکان باقی رہ گئی تھی، لیکن پرانی سڑک کے کنارے واقع قادر خان کی دکان اس تبدیلی کی زد میں آ گئی تھی۔ قصبے کے باہر سے آنے والے اس کے گاہک غائب ہو گئے تھے۔ اب اس کے حصے میں صرف گاؤں کے مہار اور کلواڑی گاہکوں کی معمولی قسم کی ضرورتیں پوری کرنا رہ گیا تھا۔

قصبے کے کچھ مسلمانوں نے نئے مکان بنا لیے تھے۔ چونے اور پتھر کے بنے پرانے اور بڑے

مکانوں کے سامنے کھڑی سنگریٹ کی دیواروں اور منگلوری کھپریلوں سے منڈھی چھتوں والے ان کے مختصر مکان نمایاں دکھائی دیتے تھے۔ بعض پرانے مکان تو اب کھنڈر ہو چلے تھے۔ ان کھنڈروں میں بکھرے ہوئے نیو کے پتھر دور سے نظر آتے تھے

ایک دن میں چلتے چلتے مغرب کی طرف جا نکلا۔ اس طرف واقع پرچون کی دکان کا مالک قصبے سے باہر سے آیا تھا۔ اس دکان کی بغل میں گاؤں کے جنار دھن نائی نے اپنی دکان لگائی تھی۔ میں سڑک سے گزر رہا تھا کہ وہ اپنے تولیے سے بال جھاڑنے کے لیے باہر نکلا اور اس کا دھیان میری طرف گیا۔ بالوں کے گچھوں کو جھٹک کر ہوا میں اڑاتے ہوئے وہ بولا، "باہر باہر سے کیوں جا رہے ہیں؟ اندر آیئے نا۔"

میں اس کی دکان میں چلا گیا۔ اس کا سیلون بہت چھوٹا تھا اور دیہاتی انداز میں ٹوٹے پھوٹے سامان سے سجایا گیا تھا۔ میں وہاں پڑی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔

"طبیعت کیسی ہے؟" اس نے استرا ہاتھ سے رکھتے ہوئے پوچھا۔ دکان میں بیٹھے اکیلے گاہک کے جانے کے بعد ہم دونوں رہ گئے۔ مجھے کوفت ہونے لگی کہ اب اس کو باتیں بنانے کا پورا موقع ہاتھ آ گیا ہے۔ مجھے ابھی آگے جانا تھا اور میں جان گیا کہ اب وہ مجھے کہیں نہیں جانے دے گا۔

"طبیعت ٹھیک ہے، بہتر ہو رہی ہے،" میں نے کہا۔

"بہتر تو ہونی ہی چاہیے۔ گاؤں کی ہوا ہی ایسی ہے،" اس نے جواب دیا۔ پھر وہ قصبے کی خوبیوں کا بکھان کرنے لگا۔ "جی گاؤں کا تو پانی ہی دوا ہے! طبیعت تو بہتر ہوگی ہی..."

"ہاں، یہ تو سچ ہے،" میں نے بنس کر کہا۔ "تمہارا کیا حال ہے؟ دھندا کیسا چل رہا ہے؟"

"دھندا پانی؟" وہ منھ بناتے ہوئے بولا۔ "کیا بتائیں بمبئی والو یہاں میں نے اپنے دام گھٹا دیے ہیں، پھر بھی گاہک ہیں کہ بازار کے سیلون کی طرف ہی دوڑتے ہیں۔"

اس نے اپنی جیب سے بیڑیوں کا بنڈل نکالا، ایک بیڑی مجھے دی اور ایک خود سلگائی۔ بیڑیاں لڑکے پتوں کی بنی ہوتی تھیں اور میں سگریٹ نہ ہونے پر ان سے کام چلانے کا عادی تھا۔ میں نے بیڑی سلگائی اور دھیرے دھیرے کش لینے لگا۔

اپنی بیڑی سے دھواں نکالتے ہوئے وہ بولا، "پندرہ سال بعد آپ گھر لوٹے۔ اتنے دن گھر

کی یاد نہیں آئی؟"

"واہ، آئی کیوں نہیں۔"

"پھر آئے کیوں نہیں؟"

"جی نہیں چاہا۔"

"یہ بھی صحیح ہے..." وہ اپنے آپ سوچتے ہوئے بولا۔ "آپ کو یہاں گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ میرا خود یہی حال ہے۔ یہاں نائی لوگوں سے اپنی بنی نہیں ہے۔ سالے سب بلوٹے[۲] کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔ سوچتا ہوں گاؤں چھوڑ کر نکل جاؤں، بمبئی چلا جاؤں۔"

"تو چلو۔"

"لیکن دل نہیں مانتا، صاحب! آپ نے تو اپنا دل کڑا کر لیا، کٹھور ہو کر سارے سمبندھ توڑ لیے۔ یہ اپنے بس کی بات نہیں۔"

"لیکن تمھارا یہاں کون ہے؟"

"ویسے تو کوئی نہیں ہے۔ پر گاؤں تو ہے نا۔ اپنا گاؤں۔ اسے چھوڑ کر جانے کو جی نہیں کرتا۔" اور اچانک اس نے مجھ سے سوال کیا، "آپ نے ونوبا بھاوے[۳] کے اُپدیش پڑھے ہیں؟"

"ہاں... ہاں، پڑھتا ہوں..."

"ونوبا جی کہتے ہیں، پلوں کی وجہ سے شہر اور دیہات نزدیک آ رہے ہیں۔ اور اس سے

۲۔ بلوٹا (مراٹھی میں بلوتا)۔ مہاراشٹر میں دیہات کے روایتی پیشوں کا نظام جس کے تحت نائی، دھوبی اور دوسرے پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ سال بھر اونچی ذات والوں اور زمینداروں کے لیے کام کر کے اناج وغیرہ کی شکل میں اجرت پاتے تھے۔

۳۔ آچاریہ ونوبا بھاوے (۱۸۹۵ء - ۱۹۸۲ء) مہاراشٹر سے تعلق رکھنے والے ایک عالم اور عوامی رہنما۔ مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے فلسفے سے متاثر ہوئے اور ان کی شاگردی اختیار کی۔ ان کو عموماً گاندھی کا جانشین خیال کیا جاتا تھا۔ آزادی کے بعد ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ہندوستان کے بے زمین کسانوں کی غربت دور کرنے کے لیے بھودان (زمین کا ہدیہ) کی پرامن تحریک چلانے کے لیے معروف ہیں۔ ان کے مروج کیے ہوئے تصورات میں سروودے (ہر ایک کی ترقی) اور انتیودے (پست ترین لوگوں کی ترقی) وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے بھگوت گیتا پر مراٹھی زبان میں تفصیلی کتاب لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔

دیہات بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ان پلوں کو توڑ دینا چاہیے۔"

میں کچھ کہے بغیر بیڑی پیتا رہا۔ لیکن وہ اس اندیشہ میں ایسا محو ہو گیا جیسے وہ خود ونوبا ہو۔ پھر یوں لگا جیسے وہ ان کا بھگت ہو۔ ونوبا بھگت جنار دھن مجھے بتانے لگا، "ونوبا لاکھ کہتے رہیں، ان کی سنتا کون ہے۔ شہرو کا دھیان اُدھر جائے تب نا۔"

"دکان اگر نہیں چل رہی تو بند کر دو..." میں نے اس کی بڑبڑ روکنے کے لیے کہا۔

"چھی چھی! بند کیسے کر دوں؟" اس نے جھرجھری لے کر کہا۔ اس نے اس خیال کو یوں جھٹک دیا جیسے اپنے تولیے سے بال جھٹکتا تھا۔ اس کا خیال تھا دکان بیچنے سے وہ گاؤں میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔

اس کا باپ خوش باش آدمی تھا۔ اس کی گانٹھ میں چار پیسے تھے۔ وہ بلونے پر زمینداروں کی حجامت کرتا تھا۔ وہ ختنہ بھی کر لیتا تھا۔ اپنے باپ لکھو کو یاد کر کے جنار دھن غمگین ہو گیا۔ بیڑی اس کے ہاتھ میں بجھ گئی۔ اسے پھینکنے کے ارادے سے وہ دکان کے دروازے سے باہر نکلا، اور ٹھیک اس وقت برابر کی دکان سے بنیے کی بیوی پچھلے دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔ جنار دھن نے اسے دیکھ کر ان دیکھا کر دیا۔ اس نے بجھی ہوئی بیڑی پھینکنے کے بجائے دوبارہ سلگا لی۔ پھر اندر آتے ہوئے مجھ سے پوچھنے لگا، "آپ نے دیکھا اس بنیے کی بیوی کو؟"

"ہاں دیکھا۔ کیوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"بتاتا ہوں... بتاتا ہوں بمبئی والو!" وہ ایک نئے ولولے کے ساتھ بولا۔ اس کے چہرے سے غمگینی کا تاثر زائل ہو گیا۔ وہ بنیے کی بیوی کے روپ اور چال ڈھال کے بیان میں کھو گیا..

یہ بنیا حال ہی میں اس پرچون کی دکان میں آیا تھا۔ اس نے پچھلے قریب قریب دیوالیہ ہو چکے دکاندار سے دکان خرید کر دھندا شروع کیا تھا۔ اس کی دکان میں مال بھرا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی دکان پر "آج نقد، کل ادھار" کا بورڈ لگا دیا تھا۔ اس نے بکری بڑھانے کے نئے نئے طریقے اختیار کیے تھے۔ اس کا دھندا خوب اچھا چل رہا تھا۔ وہ قصبے کے تمام لوگوں کو خوب پہچاننے لگا تھا۔ دو ہی چار مہینے میں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کہاں پھنس سکتا ہے اور کہاں نہیں۔ صرف اپنی بیوی کو سمجھنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ اس کی فطرت، اس کی عجیب و غریب حرکتیں، شہر چھوڑنے پر اس کا اصرار، وہ سمجھ نہیں

Scanned with CamScanner

پایا تھا۔ شہر میں بھی اس کی دکان اچھی چل رہی تھی۔ لیکن وہاں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ وہ اس سے مسلسل شہر چھوڑنے کی فرمائش کرتی رہتی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ یہاں بالکل نہیں رہ سکتی۔ بنیے پر اس کی حکومت چلتی تھی۔ اس کی خواہش کے سامنے سر جھکا کر وہ یہاں چلا آیا تھا۔

بنیے کی بیوی بہی اور سندر تھی۔ وہ اس کے مقابلے میں ٹھگنا اور دبلا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ پیچھے کی کھولی میں رہے اور گاہکوں کے سامنے نہ آئے۔ جب بھی وہ باہر نکلتی، وہ اسے واپس اندر جانے کو کہتا۔ یہ روک ٹوک اسے پسند نہیں تھی۔ وہ چڑ جاتی۔ ضد کر کے بار بار باہر نکلتی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس پر بلاوجہ شک کرتا ہے، اور وہ اسے منانے کی کوشش کرنے لگتا۔ اور جنار دھن اپنی دکان میں بیٹھ کر بیڑی کے کش لیتے ہوئے ان دونوں کی یہ بات چیت سنا کرتا۔

لیکن اسے اپنے شوہر سے لگاؤ تھا۔ وہ بازار خریداری کے لیے جاتا اور رات کو لوٹنے میں دیر کر دیتا تو وہ بے چین ہو جاتی۔ اسے شوہر کی فکر لگی رہتی اور اکیلے پن کا ڈر بھی۔ وہ اس خیال سے جنار دھن کو بھی رکنے کو نہ کہتی کہ یہ اس کے شوہر کو اچھا نہیں لگے گا۔ پچھلے دروازے میں بے چین کھڑی رہتی۔ اور اس کی بے چینی کو بھانپ کر جنار دھن اس کے کہے بغیر رک جاتا۔ اندھیرے میں اکیلا بیٹھا بیڑی پھونکتا رہتا۔ بنیے کے لوٹنے کی آہٹ پاتے ہی وہ چل دیتا۔

اندھیرا چھانے لگا تھا، اور بنیے کی بیوی اداس ہو کر پچھلے دروازے میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ بنیا شہر گیا ہوگا۔ شاید جنار دھن کو آج بھی رکنا تھا۔

میں اس سے رخصت لے کر گھر لوٹ گیا۔

گھر کی بتیاں جلی ہوئی تھیں اور سب لوگ باورچی خانے میں جمع ہو گئے تھے۔ وہ میری ہی راہ دیکھ رہے تھے۔ بھابی نے بابا اور بھائی سے کھانا کھانے کو کہا تھا؛ مگر انھوں نے کہا کہ وہ میرا انتظار کریں گے۔ لیکن میرے آتے ہی انھوں نے جلدی مچا دی۔

"دیکھو آ گیا،" مجھے دیکھتے ہی دونوں بولے، اور فوراً کھانا لگانے کو کہا۔ کھانا خاموشی سے پورا ہوا اور میں آنگن میں آ گیا۔

رات جیسے اچانک دن پر آ پڑی، اور روشن خوشگوار چاندنی پوری دھرتی پر پھیل گئی۔ ڈوب چکے

سورج کی تپش ٹھنڈی پڑ گئی۔ ہوا میں خنکی سی بھرنے لگی۔ قصبے کے گھروں میں شام کی بتیاں جس طرح جلدی جلائی گئی تھیں اسی طرح جلدی بجھ بھی دی گئیں۔ پھر سے خاموشی چھا گئی۔

گھر کے اندر سے بابا نے مجھے آواز دی۔ "اتنی ٹھنڈ میں اب تک کیوں جاگ رہے ہو؟ اندر آ کے سو جاؤ نا۔"

لیکن میرا اندر جانے کو جی نہ چاہا۔ میں اسی طرح ٹھنڈ میں اداس کھڑا رہا۔ اور تب اچانک کسی عورت کی چیخیں اس خاموش ماحول میں گونجنے لگیں۔ پہلے پہل یہ چیخیں دبی ہوئی اور وقفے وقفے سے سنائی دیں۔ لگتا تھا جیسے کسی نے اس عورت کا گلا دبوچ رکھا ہو اور وہ بڑی کوشش سے چیخ پا رہی ہو۔ پھر جیسے گلا دبانے والے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور ان کی گرفت کمزور ہو گئی۔ چیخنے کی آواز صاف، اونچی اور پہچان میں آنے والی سنائی دینے لگی۔ فوراً میرے دماغ میں آ گیا کہ وہ سدام کی بہو کی آواز تھی۔ پچھلے کچھ دنوں کے آرام سے میرے زخموں پر جو کھرنڈ آ گیا تھا وہ اکھڑ گیا اور درد کی کاٹ سے خون بل بل بہنے لگا۔ جو بدن بھرا بھرا لگنے لگا تھا اب اس کا رواں رواں جلتا محسوس ہونے لگا۔ ان تیز دھار، کربناک چیخوں نے ہوا سے ٹھنڈک کی ہر اتار پھینکی۔ اب اس ہوا میں صرف چیخیں بھری تھیں، ہوا ان سے پوری طرح بھر گئی۔ بابا کی تنہا آواز ایک بار پھر آئی

"اب تک باہر کیا کر رہے ہو؟ اندر آ کر سو کیوں نہیں جاتے؟ بہت دیر ہو گئی ہے۔"

سدام کی بہو کے گلے سے کبھی کبھی رات برات نکلنے والی یہ چیخیں پورا قصبہ برسوں سے سنتا آیا تھا۔ جب میں یہاں رہتا تھا تب میں نے بھی انھیں سنا تھا۔ قصبے کے لوگ تو سنتے ہی آئے تھے اور میں برسوں بعد پھر سے سن رہا تھا۔

سدام کی بہو کو جب میں نے پہلی بار دیکھا تو وہ ہمارے کھیت میں گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ میں کھڑی، دھان بونے میں جٹی تھی۔ تب اس کا شوہر زندہ تھا۔ بہت تیز بارش ہوئی۔ اور بند کے کنارے پر کھڑے ہو کر میں نے اسے اوڑھنے کے لیے گھونگھڑی[*] اٹھانے کے لیے کیچڑ میں پھسلتے دیکھا۔ اس

---

* گھونگھڑی کھردری اونی گدڑی جسے چرواہے اور دوسرے دیہاتی اوڑھنے اور بچھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن کوکن کے علاقے کے بیشتر دیہاتوں میں اسے مون سون کے مہینوں میں سردی سے بچنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

کے روپ کے اس درشن نے اس پل مجھے پاگل کر دیا۔ لیکن جذبات کی لہر میں بہہ جانے کی مجھے عادت نہ تھی۔ میں نے نفس کشی ہی سیکھی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے پیچھے پڑ کر میں نے سارے قصبے میں خود کو تمسخر کا نشانہ بنا لیا ہوتا، مجھے یہ چیخیں سنتے ہوئے خیال آیا۔ لیکن کچھ ہی دنوں میں اس کا شوہر اچانک چل بسا اور وہ گھر بیٹھ گئی۔ سدام کے اس بڑے سے گھر میں وہ اور اس کی بیوہ بہو رہنے لگے، اور کچھ وقت کے بعد کبھی کبھار اس کی چیخوں سے نائیوں کی بستی گونجنے لگی۔ ''شوہر کے نہ رہنے سے اس کا دماغ چل گیا ہے۔ رات کو وہ مجھے جلانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کا مرض لاعلاج ہے، اس لیے مجھے اس کو باندھ کر رکھنا پڑتا ہے۔ اسی لیے اس کے بدن پر نشان دکھائی دیتے ہیں،'' سدام سب کو بتانے لگا۔ لیکن جب سارے نائی اپنے بچے لے کر منھ اندھیرے باہر نکلتے اور صبح کی نرم دھوپ میں ان کی بیویاں باہر آ بیٹھتیں تو سدام کی بہو رو رو کر بتاتی کہ سدام اس کے ساتھ زبردستی کرتا ہے۔ پھر یہ کہانی قصبے بھر میں پھیل گئی...

کچھ دیر بعد وہ چیخیں کم ہوتے ہوتے ہوا میں غائب ہو گئیں۔ مجھے خاموش روشن چاندنی کا پھر سے احساس ہونے لگا۔ ہوا میں ٹھنڈک کی لہر پھر سے بدن میں جھرجھری پیدا کرنے لگی۔ خود کو بالکل بے طاقت پا کر میں اٹھ کر اندر چلا آیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

لیکن قصبے کے لوگوں کے لیے سدام کی بہو کا قصہ ہی بات چیت کا واحد موضوع نہیں تھا۔ دھوبن کے بارے میں بھی کچھ ایسی ہی متنازعہ باتیں مشہور تھیں۔

اس دوران دھوبیوں کا یہ گھر بالکل اجڑ چکا تھا۔ چاروں بھائی ایک کے بعد ایک چل بسے اور صرف ان کی چھوٹی بہن زندہ بچی۔ قصبے میں دھوبیوں کا یہ واحد گھر تھا، آبادی کے بالکل کنارے پر، تقریباً جنگل میں۔ اس کے اردگرد گھنی جھاڑیاں اور پیڑ۔ نیچے وادی میں، بہت دور، برہمنوں کے مکان بنے ہوئے تھے۔ پتھر کی سلوں سے بنا ایک ٹوٹا پھوٹا زینہ، جس کے پتھر اب ٹوٹ پھوٹ کر اور بکھر گئے تھے، دھوبیوں کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ دھوبن مسلمانوں کے کپڑے دھویا کرتی تھی۔ وہ گھر گھر جا کر میلے کپڑے جمع کرتی اور دھلے ہوئے کپڑے پہنچاتی۔ دن میں وہ بھٹی چڑھاتی، اور رات کو استری پھیرتی۔

اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ باپ کی موت کے بعد بھائیوں نے، اور بھائیوں کی موت کے بعد اس نے اپنا خاندانی پیشہ جاری رکھا۔ کپڑوں کی دھلائی کے چکر میں اسے اپنی شادی کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ اب پینتیس برس کے لگ بھگ عمر ہو جانے کے بعد شادی نہ کرنے کا افسوس بھی دل سے مٹ گیا ہوگا۔

میرے گھر واپس آنے کے بعد وہ بغیر کہے میرے کپڑے دھلائی کے لیے لے جانے آ پہنچی تھی۔ تب میں نے اتنے برسوں بعد اسے دیکھا۔ مجھے وہ بہت تھکی ہوئی دکھائی دی۔ جیسے اس کی زندگی ان برسوں میں بالکل سکڑ کر رہ گئی ہو۔ اس کا چہرہ کسی بھی قسم کے جذبے سے غیر معمولی طور پر خالی تھا۔ بہت غور سے دیکھنے پر بھی یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ دکھی ہے یا سکھی۔

دھوبن کی راتیں ہمیشہ مصروف گزرتی تھیں۔ وہ کھانا کھا کر کپڑے استری کرنے کی تیاریوں میں جٹ جاتی۔ استری میں کوئلے ڈال کر سلگاتی، ایک ہاتھ سے انگاروں کو ہوا دیتی اور دوسرے ہاتھ سے کپڑوں پر پانی چھڑکتی۔ استری میں انگارے دہکنے لگتے۔ وہ بہت گرم ہو جاتی۔ اس ایندھن کی سرخ روشنی میں اس کا چہرہ بالکل بدل جاتا۔ ایک دم الگ معصوم ہونے لگتا۔ اس کے دھنسے ہوئے گال بھرے بھرے اور نرم دکھائی دینے لگتے۔ اس کی سوکھی ہوئی جلد تازہ اور چمکدار لگنے لگتی۔ اس کے سر کے روکھے بالوں میں پانی کے قطرے چمکنے لگتے۔ اس کا چست جسم اپنی گداز گولائیاں ظاہر کرنے لگتا۔ گرمی سے اس کے بدن سے پسینہ پھوٹ نکلتا۔ ہاتھ، پیر، چہرہ، پنڈلیاں، سب پسینے میں نہا جاتیں۔ پسینے میں تر اپنے بدن کو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے وہ سامنے کا دروازہ کھلا رکھتی۔ چولی کی گرہ ڈھیلی کر لیتی۔ اس کھلے دروازے سے خود بخود کوئی نہ کوئی مسلمان زمیندار اندر چلا آتا اور اس طرف پیٹھ کیے بیٹھی دھوبن کو پیچھے سے دبوچ لیتا۔ وہ ارجنٹ دھلائی والے کپڑوں اور دھوبن دونوں کے لیے آیا ہوتا۔ وہ کچھ کہے بغیر اپنا پسینے سے تر بدن اس کے حوالے کر دیتی۔ استری سے دور ہٹ جاتی۔ استری کی آگ دھیرے دھیرے بجھ جاتی۔ اور لالٹین جلتی رہ جاتی۔ اس کے پاس آنے والے گاہکوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ کسی کو ناراض نہیں کرتی تھی۔ وہ خود بھی جذبات کے غلبے میں نہیں آتی تھی ورنہ کبھی نارضامندی دکھاتی تھی۔

Scanned with CamScanner

قصبے میں میرے لڑکپن کا کوئی بھی ساتھی نہیں رہ گیا تھا۔ کچھ تھے تو وہ پڑھائی ادھوری چھوڑ کر کھیتی باڑی میں لگ گئے تھے۔ کچھ قصبے سے باہر چلے گئے تھے۔ وہ ہوٹلوں میں کام کرتے تھے یا جنگل کے ٹھیکیداروں کے پاس ملازم تھے۔ ایک وکیل بن گیا تھا، اور اس نے بمبئی کی عورت سے شادی کی تھی۔ سال میں ایک بار باقاعدگی سے گھر آتا اور مہینہ بھر رہ کر واپس لوٹتا۔ اس کے ساتھ آئی اس کی بیوی کی قصبے میں بہت آؤ بھگت ہوتی۔ ان پڑھ عورتوں کی سمجھ میں نہ آتا کہ اسے کہاں اٹھائیں، کہاں دھریں۔

قصبے کی کوئی بھی لڑکی انگریزی چوتھی کلاس[۵] سے آگے نہیں گئی تھی۔ بیشتر لڑکیاں پرائمری اسکول ہی میں تعلیم کو خیرباد کہہ دیتیں۔ صرف زیتون انگریزی اسکول میں گئی تھی۔ وہ میری ہم جماعت تھی۔ لیکن چوتھی میں ہی اس کے باپ نے اسے اسکول سے اٹھا لیا تھا۔

ان دنوں مجھے زیتون سے لگاؤ محسوس ہونے لگا۔ میں نے اسے ایک لمبا خط لکھا اور اس کے گھر جا کر اسے تھما کر بھاگ آیا۔ اس خط کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بعد ہماری کبھی ملاقات بھی نہ ہوئی۔ اور کچھ ہی دنوں میں اس کی شادی ہو گئی۔

اس رات اچانک بہت بارش ہوئی۔ میں شادی میں نہیں گیا۔ گھر ہی میں سوتا رہا۔ بابا نے پوچھا، ''شادی کے گھر میں نہیں جاؤ گے؟''

''نہیں، میرے سر میں درد ہے۔''

''تو بام لگا لو اور چلو۔''

''نہیں، مجھے نہیں جانا۔''

میں نہیں گیا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ زیتون اس رات چکرا کر بے ہوش ہو گئی تو میرا دکھ اور بڑھ گیا۔ اس کی سسرال قصبے ہی میں تھی۔ شادی کے بعد اس نے پھر گھر کے باہر آنا جانا شروع کر دیا۔ لیکن میرے سامنے آنے سے کتراتی رہی۔ پھر ہوتے ہوتے اس سے میرا لگاؤ بھی خود بخود کم ہوتا گیا۔ اب اس کے دو بچے تھے اور وہ بہت بیمار تھی۔

۵۔ انگریزی چوتھی کلاس آزادی سے پہلے مہاراشٹر کے علاقے میں انگریزی کی تعلیم چھٹی کلاس سے شروع ہوتی تھی۔ اس حساب سے انگریزی چوتھی کلاس سے مراد نویں جماعت ہے۔

ایک دن بابا نے مجھے اس کی عیادت کے لیے جانے کو کہا۔ ''تم اس کی شادی پر بھی نہیں گئے تھے...'' انھوں نے کہا۔

میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ کیا انھیں معلوم تھا کہ ایک زمانے میں مجھے اس سے محبت تھی؟ یہ محض نہیں تھا۔ اس کے سوا کسی کو بھی اس بات کی خبر نہ تھی۔

میں نے پوچھا، ''کیا بہت بیمار ہے؟''

''ہاں، لگتا ہے بچے گی نہیں۔ جاؤ، اس سے مل آؤ۔''

وہ اپنے میکے آئی ہوئی تھی۔ اس روز میں پہلی بار قصبے میں گیا۔ اس کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دستک دی تو اس کی ماں دروازے پر آئی۔ مجھے دیکھ کر وہ دروازے سے دھیرے سے ہٹ گئی۔ ''اچھا، تم ہو'' وہ گہرا سانس لے کر دھیمی آواز میں بولی۔ اس نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں برآمدے میں پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور وہ دروازہ بھیڑ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر خود ہی سے بولی: ''میں ہی تمھیں بلانے آتی۔ لیکن لڑکی کی ایسی حالت تھی'' اور اس نے پلو سے آنکھیں پونچھیں۔

''زیتون کہاں ہے؟''

''اندر کے کمرے میں۔ آؤ اندر آؤ۔'' وہ چلنے لگی اور میں اس کے پیچھے پیچھے اندر گیا۔ اندر کے کمرے میں ہمیشہ کی طرح اندھیرا تھا۔ وہاں ایک چارپائی پر زیتون لیٹی ہوئی تھی۔ میں چارپائی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

''دیکھو لون آیا ہے۔'' اس کی ماں نے کہا۔ ''ادھر دیکھو۔ آنکھیں کھولو۔''

اس کا سینہ یوں اوپر نیچے ہو رہا تھا جیسے وہ ہانپ رہی ہو۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے بیمار چہرے پر شرم کا سایہ پھیل گیا۔ اس نے منھ دوسری طرف پھیر لیا اور میں باہر نکل آیا۔ اس کے لیے میری آرزو کب کی راکھ ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے دل میں میرے لیے جذبہ اب تک کیسے قائم تھا؟

سات آٹھ دن بعد وہ ختم ہو گئی۔ میں دوسروں کے ساتھ آخری بار اس کا چہرہ دیکھنے اس کے گھر گیا۔ میرے لوٹتے ہی بابا نے پوچھا:

''اسے مٹی دینے نہیں گئے؟''

''نہیں۔ میں اتنا نہیں چل پاؤں گا۔''

انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن جب بھائی لوٹا تو اس نے مجھ سے کہا، ''تمھارے نہ آنے کا ذکر ہو رہا تھا۔''

''ذکر؟ کیوں؟''

''لوگ کہہ رہے تھے تم اس لیے نہیں آئے کہ نماز جنازہ نہیں پڑھنا چاہتے تھے۔''

''یہ بھی صحیح ہے،'' میں نے کہا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ میں زیتون کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں یہ معما سلجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ کس طرح آخر دم تک اپنے جذبے کے ساتھ وفادار رہی۔

۲

سیلاب کا موسم آیا اور واششٹھی ندی لبالب بھر گئی۔ تین چار دن لگاتار پانی چڑھتا رہا، پھر کنارے سے باہر نکل آتا۔ لوگ ہر روز جوار کے وقت پاٹ کے قریب کے کھیتوں میں جا گھسنے والا پانی روکنے کے لیے دوڑ دھوپ کرتے۔

یک دن لہریں بہت اونچی تھیں۔ پانی کناروں کے بند توڑ کر بہہ نکلا اور پوری قوت سے دھان کے کھیتوں میں پھیل گیا۔ بند پر کھڑے لوگ پناہ لینے کے لیے ادھر ادھر دوڑنے بھاگنے لگے۔ وہ دور کھڑے بے بسی سے پانی کے منھ زور سیلاب کو دیکھتے رہ گئے۔ آدھی سے زیادہ کھیتی برباد کر کے پانی اترنا شروع ہوا۔

ونے گاؤں کے مسلمانوں کو مچھلی پکڑنے کا اچھا موقع ہاتھ آیا۔ انھوں نے صبح سویرے کھاڑی میں مچھلیاں روکنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ انھوں نے ریتیلی زمین میں اپنے بانس گاڑ دیے اور ٹوکریاں نیچے دبا دیں۔ پانی چڑھنا شروع ہوتے ہی انھوں نے ٹوکریاں اوپر کھینچیں اور پچاس ساٹھ لوگوں کا ٹولہ بانسوں کو پکڑ پکڑ کر پانی میں غوطے مارنے لگا۔ انھوں نے خالی ہاتھوں سے بڑی بڑی مچھلیاں پکڑ کر پاس بندھی ہوئی دو تین چھوٹی کشتیوں میں پھینکنی شروع کر دیں۔ دو ایک گھنٹوں میں کشتیاں مچھلیوں سے بھر گئیں۔ مچھلیوں کا ڈھیر دیکھنے کے لیے لوگوں کے ٹھٹ لگ گئے۔ ونے گاؤں کے مسلمان ایک ایک مچھلی پونچھ سے پکڑ کر ان کی طرف پھینکتے ہوئے کہنے لگے، ''ٹوٹے دو بند، مچھلی کھاؤ۔ روؤ مت!''

Scanned with CamScanner

ان لوگوں میں میرا بھائی بھی تھا۔ اسے ایک بڑی سی کومنا مچھلی ہاتھ لگی۔ ٹوٹے ہوئے بند کا غم بھول کر وہ کومنا لیے گھر کی طرف دوڑا۔ وہ مچھلی کو پونچھ سے پکڑ کر لہراتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ مچھلی ابھی زندہ تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ بڑی سی پرات میں سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کا تڑپنا بند ہو گیا۔ اس کی ساکت کھال پر لگے ہوئے بڑے بڑے سفنے چمکنے لگے۔ ہم سب اس پرات کے گرد جمع ہو گئے۔ بابا نے کہا، ''اچھا ہوا تم بھی آئے ہوئے ہو۔ مچھلی کھانے کا شوق پورا ہو جائے گا۔'' اور وہ پھر جا کر اپنے تکیے پر براجمان ہو گئے۔ بھائی پھر کھیت کی طرف لوٹ گیا۔ بھابی اور میں مچھلی کے پاس رہ گئے۔ اور بھابی مجھ سے پوچھنے لگی، ''اتنی بڑی مچھلی کا کیا بناؤں؟ تلوں، شوربہ بناؤں یا ہلدی و لاسالن پکاؤں؟''

''جو جی چاہے بناؤ،'' میں نے کہا، ''بس کھانے کا کام میرا ہے۔''

وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ مچھلی کو کس طرح پکائے۔ پھر بھی وہ اسے صاف کرنے بیٹھ گئی۔ سفنے اکھاڑنے لگی۔ میں اس کے ہاتھ میں پکڑی چھری سے اڑتے ہوئے ہر شکل کے سفنوں کو بیٹھا تکتا رہا۔

ٹھیک اسی لمحے برہمن کی بیٹی سُمتی نے پچھلے دروازے سے اندر جھانکا۔ شہری رکھ رکھاؤ سے واقف اس لڑکی نے دروازے پر انگلیوں سے کھٹکھٹاتے ہوئے پوچھا، ''کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟'' اس پر میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس نے یہ سوال کس سے کیا ہے۔ اس کے اچانک آنے پر مجھے تعجب ہوا۔ میں نے اسے کبھی پہلے مسلمانوں کے گھر میں آتے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ بھابی اپنے کام سے سر اٹھاتی، میں نے ہنس کر کہا، ''آؤ، آ جاؤ نا!''

سمتی مسکراتے ہوئے اندر آئی اور باورچی خانے کی دہلیز پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر مچھلی کی چیر پھاڑ کو دیکھتی رہی، پھر میری طرف مڑ کر کہنے لگی

''کیوں، تم کب آئے؟''

میں اس کے اس بے تکلفی سے پکارنے پر حیران رہ گیا۔ وہ میرے برابر کی نہیں تھی۔ ہم دونوں میں عمر کا فرق تو تھا ہی، ایسی بے تکلفی کے تعلقات بھی نہیں تھے۔ جب میں بمبئی گیا تب وہ بہت چھوٹی تھی۔ گھگھرا پہنتی تھی۔ وہی سمتی اب اتنی بڑی ہو گئی تھی۔ اپنی اس بے تکلفی، بلکہ قربت بھری زبان کو

چھوڑ کر وہ مجھ سے ادب سے پیش آ رہی تھی۔ باورچی خانے کے دروازے سے ٹیک لگا کر تمیز سے کھڑی تھی۔ میں نے کہا:

''بہت دن ہو گئے۔''

''بہت دن یعنی کتنے؟'' اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''دو تین ہفتے ہو گئے۔''

''پھر اتنے دنوں میں کہیں دکھائی نہیں دیے؟''

''میں کہیں باہر نہیں جاتا۔''

''سنو یہ بیمار ہیں، اس لیے آئے ہیں۔'' بھابی گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے بولی۔

''تم بیمار تھے؟''

''بیمار ہوں۔''

''اچھا اچھا، ٹھیک ہے۔ لیکن ہوا کیا ہے؟ بیمار دکھائی نہیں دیتے، اس لیے پوچھ رہی ہوں۔''

''ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔''

''کب؟''

''کافی دن پہلے۔ آرام کرنے آیا ہوں۔''

''آرام کرنے کے لیے گاؤں کی یاد آئی، ہے نا؟''

''اور کہاں جاتا۔ ان سب نے بہت اصرار کیا تھا۔''

''ہوں!'' کی آواز سن کر وہ کچھ دیر چپ رہی۔ اسی دوران بھابی نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ دہلیز پر بیٹھ گئی۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی۔ اٹھی ہوئی ساڑی کو کھینچ کر گھٹنے سے نیچے کیا، پھر بظاہر بے پروائی سے سوال کیا

''تمھاری سیاست کیسی چل رہی ہے؟ سنا ہے تم وہاں بہت بڑے آدمی ہو گئے ہو۔'' اس کے لہجے میں مذاق کا تاثر تھا۔

''کس نے بتایا؟'' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''کسی کے بتانے کی کیا ضرورت ہے! میں اخبار پڑھتی ہوں۔ اور تمھارا بھائی بھی ذکر کرتا رہتا

ہے۔ کہاں گئے ہیں تمھارے شوہر؟'' اس نے بھابی کی طرف مڑ کر سوال کیا۔

''مجھے کیا پتا؟'' بھابی نے جواب دیا۔

پھر وہ بھابی سے باتیں کرنے لگی۔ بھابی نے مچھلی کاٹنے کا کام روک دیا تھا اور چائے بنانے لگی تھی۔ انھی سنے ہوئے ہاتھوں سے اس نے چائے بنائی۔ مجھے دی اور ایک پیالی اس کے سامنے رکھ دی۔ چائے کی پیالی سے مچھلی کی بو آ رہی تھی۔ میں نے ایک گھونٹ لے کر کہا، ''بھابی، سمتی کو دوسری پیالی دو۔ اسے مچھلی کی بو آ رہی ہوگی۔''

لیکن اس نے پیالی منہ سے لگالی تھی۔ ''کوئی بو نہیں آ رہی۔'' اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے مجھے جواب دیا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر مجھے لگا کہ اسے مچھلی کی بو پسند آ رہی ہوگی۔ جیسے وہ چائے نہیں پی رہی تھی، اس پیالی میں بسی ہوئی مچھلی کی بو سونگھ رہی تھی! چائے پی کر اس نے پیالی آہستہ سے نیچے رکھ دی اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جاتے جاتے مجھ سے کہنے لگی۔

''ایک دن گھر آؤ نا!''

''آؤں گا کسی دن۔''

وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے پچھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔ اور میں نے بھابی سے پوچھا، ''برا ہمن لوگ پہلے تو گھر میں نہیں آتے تھے اور نہ ہمیں اپنے گھر میں آنے دیتے تھے۔ مگر دنیا اب کیسی بدل گئی ہے۔''

''دیکھ لو... یہ تو گوشت بھی کھاتی ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟''

مجھے حیرت سے صدمہ سا ہوا۔ میں اتنی بڑی بڑی تبدیلیوں کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔

''ابھی تمھیں پتا ہی کیا ہے۔ چار دن یہاں رہ کر دیکھو۔ پھر اور سمجھ میں آئے گا تب تمھیں محسوس ہوگا کہ گاؤں کے لوگ تم سے آگے نکل گئے ہیں۔''

اس دن اس نے اور زیادہ کچھ نہیں کہا۔ لیکن کچھ ہی دنوں میں بھائی کے ساتھ سمتی کے سمبندھوں کی باتیں میرے کانوں تک پہنچنے لگیں۔ پہلے پہل میں نے ان باتوں پر کوئی دھیان نہ دیا۔ مجھے ان پر یقین نہ آیا۔ لیکن پھر بھی اپنی تسلی کرنے کے لیے میں نے ایک دن خود بھابی سے دریافت

کیا۔

''جو کچھ تم نے سنا ہے وہ سچ ہے،'' وہ سرد لہجے میں بولی۔

میں کچھ دیر کے لیے بالکل چپ رہ گیا۔ بھائی کا دھنسے ہوئے گالوں والا چہرہ میری آنکھوں کے آگے گھوم گیا۔ مجھے اس کے برتاؤ پر ترس آنے لگا اور سمتی پر تعجب ہونے لگا۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ اُس دن وہ بھابی سے ہی ملنے آئی تھی۔ اس نے بڑے سہج انداز میں اس کے بارے میں بھابی سے سوال کیا تھا۔ اس کا لہجہ بالکل معصوم تھا۔ اس میں لگاؤ یا خواہش کا کوئی نشان مجھے محسوس نہیں ہوا تھا۔

''کیا وہ اکثر یہاں آتی ہے؟''

''ہاں، روز آتی ہے۔''

''کیا وہ سب کے گھروں میں جاتی ہے؟''

''نہیں، صرف ہمارے ہاں آتی ہے۔''

''کوئی کچھ کہتا نہیں؟''

''کہتے کیوں نہیں! لوگوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ لیکن ان کو کیا پروا!''

''اور تم بھی کچھ بولتیں نہیں؟''

''میں کیا بولوں؟ تمھارے خیال میں یہ میری سنیں گے کیا؟''

''بھائی سے نہیں، اس سے۔''

''اس سے؟'' وہ ہنس کر بولی۔ ''اس سے کچھ کہنے کو میرا جی نہیں کرتا۔ یہ بیچاری کس طرح پھنس گئی، یہ ہی سمجھ میں نہیں آتا۔''

یہ کہہ کر اس نے بات ختم کر دی۔ اپنے کاموں میں لگ گئی۔

اس کے بعد سمتی دو تین بار ہمارے گھر آئی۔ ہر بار اتفاق سے میں گھر پر تھا۔ وہ پچھلے دروازے سے آتی اور پہلے دن کی طرح باورچی خانے کی دہلیز پر دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو جاتی۔ کبھی بھائی کو پوچھتی، کبھی بھابی سے اور مجھ سے بتیاتی رہتی۔ اگر بھابی نے چائے یا کچھ کھانے کو دیا تو بے تکلف کھانے لگتی۔ جس دھیرج سے چپتی تھی اسی طرح دھیرے دھیرے کھاتی تھی۔ اچانک بول پڑتی، اور بولتے ہوئے دھیمے سے مسکراتی رہتی۔ اس کے جاتے ہی بھابی ہنس کر مجھ سے کہتی، ''دیکھا کیسی نیچی

باتیں کرتی ہے۔ کیا اس پر غصہ ہونا میرے لیے ممکن ہے؟"

ایک دن اچانک مجھے اس کے گھر جانے کا موقع ملا۔

اس دن ہمارے کھیتوں میں گھاس کی کٹائی ہو رہی تھی۔ بھائی کو بازار میں کچھ کام تھا۔ میں بھی گھر بیٹھے بیٹھے اُوب گیا تھا۔ میں نے اسے بازار بھیج دیا، کہا، میں کھیت میں جاتا ہوں، اور آہستہ آہستہ چل پڑا۔ براہمن باڑی کی طرف سے کھیت کو جانے والے راستے پر چلنے لگا۔

براہمن باڑی اب زیادہ تر ویران دکھائی دیتی تھی۔ ہر شخص اپنے کنبے کو لے کر پونا یا بمبئی کی طرف چلا گیا تھا۔ ان کے کبھی صاف ستھرے، لپے ہوئے آنگن اب گھٹنوں تک جھاڑ جھنکاڑ سے بھر گئے تھے۔ کچھ گھر بند پڑے تھے اور کچھ اتنے پرانے ہو گئے تھے کہ لگتا تھا کسی بھی لمحے گر پڑیں گے۔ میں دبے پاؤں اس آنگن کو پار کرنے لگا سوکھے پتوں پر اپنے قدموں کی چاپ سے خود مجھے ڈر لگنے لگا۔

سمتی اپنے گھر کے دروازے میں بیٹھی تھی۔ اس نے گھٹنے موڑ کر چہرہ ان پر ٹکا رکھا تھا اور آنگن میں پڑے ہوئے پتھروں کو جمع کر کے انھیں ایک ایک کر سوکھے پتوں میں پھینکتے ہوئے اس سے پیدا ہونے والی آواز سن رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنا ہاتھ ہوا میں روک لیا اور اسے دھیرے سے نیچے لائی۔ چہرہ گھٹنوں سے اوپر اٹھایا، کچھ دیر میری طرف اچنبھے سے دیکھتی رہی، پھر مسکرا کر مجھ سے بولی۔

"کیوں، اس طرف کیسے آنا ہوا؟"

"گھاس کٹائی کے لیے جا رہا ہوں۔"

"آج تم کیسے؟"

"بھائی شہر گیا ہے، اس لیے۔"

"جانا ضروری ہے کیا؟"

"یہاں تک آ گیا ہوں تو چلا ہی جاؤں۔"

"چلے جانا۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ گھر میں آؤ۔ کم سے کم چائے تو پی لو۔"

میں اس کے سامنے ساکت کھڑا رہ گیا۔ میں کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اس دوران، وہ خود ہی یک طرفہ فیصلہ کرتے ہوئے بولی:

"چلو، اندر آؤ۔"

میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ مجھے گھبرایا ہوا دیکھ کر اس نے گردن سے اندر آنے کا اشارہ کیا، اور میں گھر کے اندر چلا گیا۔

وہ مجھے سیدھے رسوئی گھر میں لے گئی۔ بیٹھنے کے لیے پیڑھی دی، چائے کے لیے پانی رکھا۔ پھر وہ مجھ سے بمبئی کی باتیں کرنے لگی۔ باتیں کرتے کرتے اس نے اپنے بمبئی میں رہنے والے چچیرے بھائیوں کا ذکر کیا۔ اس نے کہا

"میں بھی بمبئی آنے والی ہوں۔"

"کب آؤ گی؟" میں نے پوچھا۔

"آؤں گی۔ اپنے چچا کے گھر جاؤں گی۔ بمبئی میں تم سے ملوں گی۔" اس نے چائے کی پیالی بھر کر میرے سامنے رکھی۔

میں نے خاموشی سے چائے ختم کی۔ تھوڑی دیر بعد اس سے پوچھا "تم یہاں اکیلی کیسے رہتی ہو؟"

"اس میں کیا ہے؟ گھر میں چھوٹا بھائی ہے نا۔"

"تو کیا ہوا؟" میں نے کہا۔ پھر پوچھا "تم شادی کیوں نہیں کرتیں؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور مجھے خیال ہوا کہ مجھے یہ سوال نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔

"ٹھہرو" وہاں ایک الماری میں رکھا ہوا ایک خط نکال کر میری طرف اچھالا۔ "یہ چٹھی پڑھو۔"

میں نے چٹھی پڑھی۔ اس میں لکھا تھا "تم بمبئی چلی آؤ۔ پھر شادی طے کرنا آسان ہوگا۔ کئی اچھے رشتے نظر میں ہیں۔ ان میں ایک تو خاصا اچھا ہے۔ پیسے والا ہے، ہندوستان بھی دیکھ چکا ہے۔ تم آ جاؤ تو ایک مہینے میں شادی ہو جائے گی۔"

خط پر ڈیڑھ سال پہلے کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔ میں نے تعجب سے کہا "یہ تو ڈیڑھ سال پرانی چٹھی ہے۔"

"ہاں، لیکن تم سے یہ بات چھپائی اس لیے میں نے تمہیں ایک نمونہ دکھایا۔ ایسی چٹھیاں ہمیشہ آتی رہتی ہیں۔ سب کا یہی مضمون ہوتا ہے، وہی بمبئی کا بلاوا۔ اگر میں بمبئی نہ گئی تو لگے جیسے کہ میں ٹھیک نہیں رہے گا۔"

اس نے آنگن میں بکھرے ہوئے سوکھے پتوں پر نظر جمالی۔ میں جان گیا کہ وہ کچھ بے چین سی ہوگئی ہے۔ بھائیوں کی چٹھیوں میں اسے اپنائیت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ گھر میں چچیرا بھائی رہتا تھا، لیکن وہ اس پر کوئی دھیان نہیں دیتا تھا۔ اب تو اس نے گھر کے بیچ دیوار کھینچ کر دو حصے کر لیے تھے۔ وہ آدھے گھر میں اکیلی رہتی تھی۔

پھر وہ میری طرف مڑ کر بولی، ''میری بات رہنے دو۔ اپنی کہو۔ تم کب بریانی کھلاؤ گے؟''

میں اس کے سوال کا رخ بھانپ گیا تھا۔ لیکن میں نے جان بوجھ کر اس سے پوچھا

''تم بریانی کیسے کھاؤ گی؟''

''کیوں نہیں؟ میں بریانی کھاتی ہوں۔''

''واقعی؟ میں نہیں مانتا۔''

''نہ ماننے کی کیا بات ہے؟''

''کیسے مان سکتا ہوں؟ اسکول میں ایک بار میں نے تمھیں کھجور دی تھی، لیکن تم نے یہ کہہ کر واپس کر دی کہ ہم مسلمانوں کے ہاتھ سے کچھ نہیں کھاتے۔ اس ایک بار کے سوا میری اور تمھاری اسکول میں کوئی بات نہیں ہوئی، لیکن مجھے وہ بات اب تک یاد ہے۔''

وہ آپ ہی آپ مسکرائی۔ پھر مجھ سے پوچھا۔

''یہ کتنے سال پہلے کی بات ہے؟''

''بیس ایک سال ہو گئے ہوں گے۔''

''بیس سال! اس وقت تو میں چھوٹی سی بچی تھی۔ مجھے کسی بات کی سمجھ نہیں تھی۔ گھر کے بڑے جو کچھ کہتے تھے میں وہی کرتی تھی۔ اس عمر میں ہر کوئی ایسا ہی کرتا ہے۔ لیکن ان بیس سالوں میں دنیا کتنی بدل گئی ہے۔ تم بدل گئے، میں بھی بدل گئی۔''

''تم غلط سمجھتی ہو،'' میں نے بات کاٹ کر کہا، ''میں نہیں بدلا۔ جیسا تھا ویسا ہی ہوں۔ تمھیں بتاؤں؟ آج میں نے زندگی میں پہلی بار اپنے قصبے کے کسی برہمن کے رسوئی گھر میں قدم رکھا ہے۔ اور یہاں بیٹھے ہوئے مجھے بہت عجیب لگ رہا ہے۔''

''عجیب کیوں لگ رہا ہے؟ اتنے برس تم یہاں تھے ہی نہیں۔ نہیں تو اس سے پہلے ہی ایسا ہو

جاتا۔ اب لوگ پہلے کی طرح پرانے خیال کے نہیں رہے ہیں۔"

"نہ رہے ہوں، مگر میرے ذہن میں کچھ رواج اب بھی قائم ہیں۔ تمھیں گورے یاد ہے؟"

"ہاں، یاد ہے۔ اچھی طرح یاد ہے۔ اس کا کیا ذکر ہے؟"

وہ گنونتا کے یہاں رہا کرتا تھا۔ قصبے سے ہم ہی دونوں راشٹر سیوا دل میں جاتے تھے۔ صبح سویرے ہم دونوں بار ار تک دوڑتے تھے۔ میں گورے کو بھور کے وقت جگانے آیا کرتا تھا۔ گنونتا اور وہ برآمدے میں سوتے تھے۔ میں باہر کھڑے ہو کر اسے پکارتا، لیکن وہ آسانی سے نہیں جاگتا تھا۔ گنونت مسلسل جاگتا اور کھانستا رہتا تھا۔ اسے دق تھی۔ وہ گورے کو جگاتے ہوئے کہتا۔ ارے اٹھ! وہ مسلمان کا لڑکا تجھے بلانے آیا ہے۔ گورے جیسے تیسے اٹھتا اور منہ دھو کر میرے ساتھ بازار کی طرف دوڑنے لگتا۔ راستے میں ہم پہلے ایک ہوٹل میں جا کر گرما گرم چائے پیتے۔ گورے منہ بنا کر بولتا سوری، ہاں؟ میں تمھیں گھر میں نہیں بلا سکتا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں دوسروں کے یہاں رہتا ہوں۔ وہ سب سنگھ[۶] والے ہیں۔"

"اس قصے کو بھی پندرہ بیس سال تو ہو گئے ہوں گے، ہے نا؟"

"ہاں۔ لیکن گنونتا کی تیز نگاہ مجھے اب بھی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے پرانے خیالات کا مجھے اب بھی خیال آتا ہے..."

"گنونتا کو مرے ہوئے دس سال ہو گئے،" اس نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ "اور مرنے سے پہلے وہ مدد مانگنے کئی بار مسلمان زمینداروں کے در پر گیا تھا۔ اتنے دن تمھارا گاؤں سے کچھ رابطہ نہیں رہا۔ اب ایک دوسرے کے گھر جانا اور ساتھ کھانا کوئی عجیب بات نہیں رہی ہے۔ مجھے تو تم پر تعجب ہوتا ہے۔ اتنے سال ہو گئے شہر میں رہتے ہوئے۔ اپنے آپ کو اتنا اونچا نیتا سمجھتے ہو۔ سماج بدلنے کی باتیں کرتے ہو۔ انقلاب کی کہانیاں سناتے ہو۔ اور اس تبدیلی پر ناک سکیڑتے ہو۔"

اس کی دلیل مضبوط تھی۔ میں اس کے حملے سے بوکھلا گیا۔ لیکن پھر میں نے کہا، "تمھاری بات

۶۔ سنگھ مراد راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (RSS)، ہندو قوم پرست تنظیم جو ہندوتو کے سیاسی تصور کی بنیاد پر ہندوستان کو ہندو ریاست بنانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ آگے چل کر اس نظریاتی تنظیم نے بھارتیہ جنتا پارٹی (BJP) کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔

غلط ہے۔ میں تبدیلی کا مخالف نہیں ہوں۔ میرے ذات بھائی میری اکثر باتوں کو غلط سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ بات الگ ہے، اور تمہارا برتاؤ الگ ہے۔ سدھار کے بارے میں تمہارا خیال غلط ہے۔ سدھار کا مطلب بداخلاق ہونا نہیں ہے۔"

"آہا!" اس نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "بداخلاقی کیسی؟ تمہارے گھر چائے پینا بداخلاقی ہے؟ تمہیں یہاں بلانا بداخلاقی ہے؟ بریانی کھانا بداخلاقی ہے؟ تو پھر خوش اخلاقی کیا ہے؟ وہ جو دھوبن کرتی ہے؟ جو سدام کرتا ہے؟"

اس سے دھوبن اور سدام کا ذکر سن کر میں بھی چڑ گیا۔ "دھوبن کی بات مت کرو۔ لوگ تمہارے بارے میں کیا باتیں کرتے ہیں، معلوم ہے؟"

"کیا باتیں کرتے ہیں؟" اس نے اسی لہجے میں کہا۔

"کہتے ہیں تمہارا میرے بھائی کے ساتھ سمبندھ ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے... بالکل جھوٹ!"

"لوگ کیا بلاوجہ کہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ میں کیسے کہوں؟"

"ٹھیک ہے! تو پھر اس سے تمہارا رشتہ ہے کس قسم کا؟ تم ہمیشہ آتی ہو، اس کے بارے میں پوچھتی ہو، اس سے بار بار ملتی ہو، یہ تمہیں غلط نہیں لگتا؟"

"اس میں غلط کیا ہے؟ ہمارے اچھے تعلقات ہیں۔ اوروں سے کچھ بڑھ کر۔ بس اتنا ہی۔"

"اچھے تعلقات ہیں، بس اتنا ہی؟"

"ہاں، صرف اچھے تعلقات۔"

"لیکن وہ بھی کیوں؟ اس کی وجہ کیا ہے؟"

"مگر کیوں؟"

میں چپ ہو گیا۔ اس کے سوال کا جواب دینا میرے بس میں نہ تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ مجھے اس سے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی، کیونکہ اب وہ میری طرف دیکھنے سے کترا رہی تھی۔ سنجیدہ ہو کر باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ لال ہو گیا اور آنکھوں کے کونے نم ہو گئے۔

''یہ ٹھیک نہیں ہے،'' میں نے کہا۔ میرے لفظ میرے کانوں میں گونجتے رہے اور مجھے ان پر ترس آنے لگا۔ مجھے لگا میں نے اس سے کٹھور برتاؤ کیا ہے۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ مجھے احساس ہوا کہ باہر اندھیرا چھانے لگا ہے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ بے چین سی دکھائی دیتی تھی۔ میرے اٹھتے ہی وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے کہا، ''دیر ہوگئی۔ اب میں چلتا ہوں۔''

وہ مجھے چھوڑنے دروازے تک آئی۔ جاتے ہوئے میں نے اس سے شرمندہ سے لہجے میں کہا، ''میری بات کا مقصد تمہیں دکھ پہنچانا نہیں تھا۔ اگر تمہیں برا لگا ہو تو بھول جاؤ۔ دراصل تمہیں نصیحت کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔''

اس کے چہرے سے اور بھی بیچارگی جھلکنے لگیں۔ مجھے احساس ہوا کہ میری بات بالکل بے معنی تھی۔ معافی مانگنے کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ میں سیدھا گھر واپس آ گیا۔

گھر میں سب کو فکر تھی کہ میں کہاں چلا گیا ہوں۔

رات کا کھانا ہو گیا۔ بابا باورچی خانے سے نکل کر اپنی چارپائی پر جا لیٹے۔ میں روز کی طرح سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔ بھائی دروازے پر منڈلا رہا تھا۔ میری طرف مڑ کر اس نے پوچھا، ''تم سمتی کے گھر گئے تھے؟''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے کیسے معلوم ہو؟ بظاہر اس میں چھپانے والی کوئی بات نہیں تھی۔ میں خود سے گیا بھی نہیں تھا۔ لیکن میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

''تم نے اس سے کیا کہہ دیا؟ کیا اپدیش دیا؟'' اس نے دوبارہ سوال کیا۔ اس کی آواز اونچی ہو گئی۔ یعنی سمتی اس سے ملی تھی، یا وہ اس سے ملا تھا۔ اب جواب دینا ناگزیر ہو گیا۔ میں نے کہا

''یونہی ادھر اُدھر کی باتیں کیں۔''

''کیا؟ کیسی ادھر اُدھر کی باتیں؟''

''یونہی عام قسم کی باتیں کیں۔''

''اسے ہدایت دینے والے تم کون ہو؟''

Scanned with CamScanner

''کوئی نہیں۔اس نے گھر میں بلایا۔میں چلا گیا''

''تم تو کھیت میں جا رہے تھے نا؟''

''لیکن وہ وہیں دروازے میں بیٹھی تھی۔ کہنے لگی، چائے پیے بغیر مت جانا۔سو میں اندر چلا گیا۔پھر وہ بریانی کھانے کی باتیں کرنے لگی اس پر مجھے تعجب ہوا۔اسی طرح بات چھڑ گئی۔''

''کون سی بات؟''

اس کے جرح کے سے لہجے پر میں چڑ گیا۔میں نے اس سے نرمی سے کہا،''تمھاری اور اس کی بات۔''

''میری اور اس کی کیا بات؟''

''یہ مجھے معلوم نہیں۔''

''کیا تمھیں اس نے بتایا؟'' اور وہ جلتے ہوئے انگارے جیسی نگاہ سے بھابی کی طرف دیکھنے لگا۔

بھابی چولھے پر رکھے بال پر آئے ہوئے دودھ میں پھونکیں مار رہی تھی۔اس نے دودھ کی پتیلی چولھے سے اتارتے ہوئے ہنس کر کہا،''اجی میرے بتانے کی کیا ضرورت 'پورا گاؤں یہی باتیں کر رہا ہے۔ان کو کیسے پتا نہ چلتا؟''

''یہ سب جھوٹ ہے،'' وہ غصے میں آ کر چلایا۔اس کا غصہ یہ گواہی دیتا معلوم ہوا کہ وہ جھوٹا احتجاج کر رہا ہے۔

''ٹھیک ہے،'' میں نے کہا۔''پھر تمھیں اتنی زور سے چلانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''یہ جھوٹ ہے،اس لیے لوگ مجھے بدنام کر رہے ہیں،اس لیے!''

''یہ لوگ،مطلب کون؟'' بھابی نے پوچھا۔

''تم... گاؤں والے... سستی کا وہ حرام خور بھائی۔اور گاؤں کے بدمعاش کلواڑی[۷] لوگ جو اپنی حیثیت بھول گئے ہیں۔ارے اس لڑکی کو میں بچپن سے جانتا ہوں ..''

۷۔کلواڑی (یا کلنی) کونکن کے علاقے میں بٹائی پر کام کرنے والے کھیت مزدور۔عموماً زمینداروں یا مہاجنوں سے بھاری سود پر قرض لینے کے باعث وہ رفتہ رفتہ اپنی مزروعہ زمین پر اپنے حق سے ہاتھ دھو بیٹھے اور انھیں سخت مشقت کے کام کے عوض فصل کا تھوڑا سا حصہ دے کر زمیندار یا مہاجن باقی فصل سود کے طور پر ضبط کر لیتے تھے۔

''ہاں، وہ بھی یہی کہہ رہی تھی۔''

''کیا؟''

''یہی کہ ہماری بچپن سے جان پہچان ہے۔''

''دیکھو مجھ سے الٹی سیدھی باتیں مت کرو!'' اس نے جارحانہ انداز میں کہا۔

تب ہی بھابی بیچ میں آ گئی۔ مجھ سے کہنے لگی: ''آپ مہربانی کر کے خاموش ہو جایئے۔ آرام کرنے آئے ہیں تو آرام کیجیے...''

''پہلے تم نے خود اسے بڑھاوا دیا اور اب اسے چپ رہنے کو کہہ رہی ہو'' بھائی کڑک کر بولا۔ ''وہ لڑکی معصومیت سے میرے بارے میں پوچھتی ہے۔ اس کا بھی کوئی نہیں ہے۔ اس گاؤں میں اکیلی رہتی ہے، اس لیے میں اس کی ضرورتوں کا خیال کرتا ہوں، تو لوگ اسے الٹا کر دکھاتے ہیں... اور یہ بھی الٹا سمجھتی ہے...''

''یہ سچ نہیں ہے'' میں نے غصے سے کہا۔ ''لوگ جو سمجھتے ہیں وہ سچ ہے۔ بھابی پر کیوں غرا رہے ہو؟''

''اچھا، ٹھیک ہے، یہی سچ ہے۔ تو پھر؟ میرا کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں۔ یہ بات تم پہلے ہی مان لیتے! ٹھیک ہے۔ لیکن میں تمھیں بتا رہا ہوں کہ جو کچھ چل رہا ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔''

''تم مجھے نصیحت کرو گے؟''

''کیوں؟ اس میں اعتراض کی کیا بات؟ تمھارا بھائی ہونے کے ناتے میرا حق ہے۔''

''بڑے بھائی کو نصیحت؟''

''ہاں، اگر وہ غلطی پر ہو تو۔''

''اور اگر چھوٹا بھائی غلطی کرے تو؟'' اس نے ٹھنڈا ہو کر پھر جرح کا لہجہ اختیار کر لیا۔ ''کیا تب میں نے کچھ پوچھا تھا؟''

''کیا میں نے کوئی غلطی کی تھی؟''

''واہ!'' وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ ''پندرہ سال میں آج تم گھر آئے ہو۔ اور پوچھتے ہو مجھ

سے کیا غلطی ہوئی؟ تمھیں شرم نہیں آتی ایسا سوال کرتے ہوئے؟''

''آپ ان سے ایسے کیوں بات کر رہے ہیں؟'' بھابی ناراض ہو کر بولی۔ ''آپ بڑے ہیں۔ پوری ذمے داری آپ کی ہی تھی۔ یہ جتانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''واہ، بہت خوب!'' اس نے دونوں ہاتھ سامنے پھیلائے۔ ''ان ذمے داریوں کی وجہ سے میری یہ حالت ہو گئی۔ میرا بدن مٹی ہو گیا۔ یہ باجی راؤ[۸] اس وقت کہاں تھے؟ کیا کر رہے تھے؟ سیاست، نیتا گیری؟ تب اس کے پیروں میں کس نے بیڑیاں ڈالی تھیں؟''

''میں نے گھر کی ذمے داری ٹال دی، یہی کہنا چاہتے ہو نا؟ مان لیا، لیکن ویسے تو میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔''

''کیا مطلب؟ پندرہ سال بے کار زندگی گزارنا کوئی غلط کام نہیں ہے؟''

''نہیں، میری نظر میں نہیں۔''

''واہ تمھاری نظر میں! تو پھر میری نظر میں مجھ سے بھی کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ تم صرف اپنی نظر سے دیکھتے ہو۔ نیتا بن کے یہی سیکھا ہے تم نے؟ ذرا اوروں کی نظر کا بھی سوچو ..''

اس نے میری طرف پیٹھ کر لی۔ کچھ لمحے وہ وہیں کھڑا رہا۔ پھر پچھلا دروازہ دھڑ سے کھول کر باہر نکل گیا۔ اندھیرے میں پچھواڑے کے چبوترے پر جا بیٹھا۔ بھابی کو میرے ذہن کی اذیت کا اندازہ ہو گیا۔ اس نے مجھے جا کر سونے کو کہا۔ لیکن بہت دیر تک میں پاگلوں کی طرح باورچی خانے میں کھڑا رہا۔

دوسرے دن میں نے بابا سے کہا، ''اب میں جاؤں گا... واپس...''

''اتنی جلدی؟'' انھوں نے حیرت سے پوچھا۔ ان کے جھریوں بھرے چہرے پر غم کا تاثر جھلکنے لگا۔ ''تمھیں تو آرام کرنا تھا نا؟''

۸۔ باجی راؤ پیشوا انیسویں صدی کا مراٹھا سپہ سالار جس نے ۱۸۰۲ء انگریزوں سے مل کر معاہدۂ بسین پر دستخط کیے جس کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کو مراٹھوں کے ریاستی نظام عدالتوں پر تسلط اور بدلے میں باجی راؤ کی فوج کو انگریزوں کا تحفظ حاصل ہوا۔ اس معاہدے کی دوسرے مراٹھا سپہ سالاروں نے مذمت کی۔

''ہاں، لیکن بمبئی میں بھی تو کر سکتا ہوں...''

''بمبئی میں! اتنے سالوں میں کتنا آرام کیا؟'' انھوں نے پوچھا۔ جو سوال میں اور وہ دونوں ٹالنا چاہتے تھے، انجانے میں وہی سوال پوچھ بیٹھے۔ ''کتنے دن آرام کرنا ضروری ہے؟''

''بہت! پانچ چھ مہینے...''

''پھر آج ہی جانے کی کیا جلدی ہے؟''

اس پر میں کچھ نہ کہہ سکا۔ بمبئی میں کام کا بہانہ کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ رات کے اس واقعے سے میں بہت مدھم ہو گیا تھا۔ میرے ذہنی سکون کو سخت دھچکا پہنچا تھا۔ یہ سمجھانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

میرا دھیان ان کے چہرے کی طرف گیا۔ ان کے سامنے کھڑے رہنے سے مجھے خوف آنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا اب وہ پھر پچھلے پندرہ سال میری گھر سے غیر حاضری کا، میری آوارہ زندگی کا پہاڑا پڑھنے لگیں گے۔ میں ان کے سامنے اپنے پچھلے پندرہ سال کا حساب دینے کو تیار تھا۔ پندرہ سال پہلے ان کی نظر سے غلط معلوم ہونے والی چیزوں کا حساب چکانے کا میں عادی ہو چکا تھا۔ لیکن ایسے موقعوں پر ہونے والی ذہنی اذیت کو سہنا اب ان کے لیے ممکن نہ رہ گیا تھا۔ کئی بار ان کے نیچے تلے برتاؤ کے پیچھے میرے تئیں ایک تحسین کا جذبہ چھپا محسوس ہوتا تھا جس کی وجہ زندگی کے بارے میں ان کا جوش و خروش تھا۔

وہ جوش و خروش اب ڈھل چکا تھا۔ اب ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے تھے، بے بسی کا احساس ان پر حاوی ہو چکا تھا۔ اب ان کی باتوں سے ظاہر ہونے والے دکھ اور بے تابی کے جذبے سے میرا دل زخمی ہونے لگتا۔ پندرہ برس کے اس عرصے میں ہماری مالی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ بحران، قرض اور بکی کے بہت سے واقعات انھوں نے جھیلے تھے۔ اس دوران صرف میں ان تجربات سے دور رہا تھا۔ یہ بالکل اس طرح تھا جیسے آگ لگنے پر سارے گھر والے اندر پھنس جائیں اور ان میں سے ایک جو اتفاق سے باہر گیا ہوا ہو، بچ نکلے۔ انھوں نے آگ کی ساری تپش برداشت کی تھی اور ان کے ذہن پر اس کے گہرے نشان تھے۔ میں اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ میرے بچ نکلنے کو کس نظر سے دیکھیں گے۔

لیکن انھوں نے صرف اتنا کہا: ''جانا ہے تو چلے جاؤ۔ لیکن طبیعت تو ٹھیک ہو جانے دو۔ کم از کم

اتنی جلدی تو مت کرو۔"

ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور میرے لیے وہاں کھڑے رہنا ناممکن ہو گیا۔

اگلا دن میں نے اسی خاموش اوھیڑ بن میں گزارا۔ کڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ دستور یہی ہے کہ انسان ایک دوسرے سے زیادہ تر برا برتاؤ کرتے آئے ہیں۔ کبھی جان بوجھ کر، اور کبھی اپنی خواہش کے برخلاف، وہ ایک دوسرے کے ساتھ تکلیف دہ طرزِ عمل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس پر میں بددل کیوں ہوں، اور کب تک؟

اور میرے کڑھنے کا مطلب ہی کیا ہے؟ خود میرا برتاؤ کیسا رہا ہے؟ کیا ایک بار میرا اپنا دل پارٹی میں کام کرنے والی اُس بھوری آنکھوں والی لڑکی پر نہیں آ گیا تھا؟ اگرچہ وہ غیر اخلاقی طرزِ عمل کی مرتکب ہوئی تھی، لیکن میں نے اسے پارٹی سے نکالے جانے کی مزاحمت، بلکہ سخت مخالفت کی تھی۔ میرے منہ پر کوئی کچھ نہ بولا، لیکن میرے پیٹھ پیچھے میرے اس موقف کو ضرور معنی پہنائے گئے ہوں گے۔ تب میں نے کیا کہا تھا؟ ایسے بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر ہی ہمیں آگے بڑھنا ہے ہمیں سب کو شامل کرنا چاہیے... جہاں چار لوگ اکٹھے ہوں گے وہاں اچھے برے کا ملاپ تو ہو گا ہی۔ پورے سماج کو سدھارنے کی ضرورت ہے۔

لیکن میری بات جھوٹ تھی۔ میں نے اپنی غرض پوری کرنے کے لیے اسے اس فلسفے کا لبادہ پہنایا تھا۔ اسے بچانے کے لیے میں منافق بن گیا تھا۔ یہ میں بھی جانتا تھا اور وہ بھی۔ میں بہاؤ کے ساتھ بہہ گیا تھا۔ میں نے جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔ اور جیت بھی گیا تھا۔ وہ پارٹی ہی میں رہی۔ اور اپنے پچھلے طرزِ عمل پر ہی قائم رہی۔

کیا حاصل ہوا مجھے؟ اس کے موہ میں میں نے حالات کو جوں کا توں رکھنے کا موقف کیوں اختیار کیا؟ میں نے اپنے اصول پر سمجھوتا کیوں کیا؟ پچھلے پندرہ سال اس طرح بھٹکتے رہنے سے میں نے کیا کمایا؟ کہیں کچھ ضرور غلط ہو رہا تھا۔ میری شخصیت میں سچائی اور سونے جیسا کھرا پن کہاں آیا تھا؟ میری کوشش اب بھی ناکافی تھی۔ میری تپسیا جھوٹی پڑ گئی تھی۔ بھائی کو قصوروار ٹھہرانے کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ بیچاری سستی ہی نے کون سا گناہ کیا تھا؟

لیکن اسے اور مجھے ایک ہی ترازو میں نہیں تولا جا سکتا۔ میں پچھلے پندرہ سال کسی کوشش میں لگا رہا ہوں۔ کوئی آدرش میرے دل کے قریب رہا ہے۔ میں کسی تبدیلی کا خواب دیکھتا رہا ہوں۔ اس کے پورا ہونے میں اب بھی بہت دیر ہے۔ اور اب میری بیماری کی وجہ سے اس کام میں رکاوٹ آ گئی ہے۔ فی الحال مجھے اپنی صحت پر توجہ رکھنی چاہیے۔ سکون سے بیٹھنا چاہیے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

میں نے اپنا بمبئی لوٹنے کا ارادہ ترک کر دیا، اور گھر پر آرام کرنے لگا۔ دھیرے دھیرے ہوا میں ٹھنڈک بڑھنے لگی اور گھر میں بیٹھنا مجھے اچھا لگنے لگا۔ میں نے آرام کرسی پچھواڑے کے آنگن میں رکھ لی اور بے فکر ہو کر اس پر بیٹھا رہنے لگا۔

۳

اس کے بعد سے بھائی نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دیا۔ یا بلکہ وہ میرے سامنے پڑنے ہی سے کترانے لگا۔ میں نے بھی اس پر کوئی دھیان نہ دیا۔ اس جھگڑے کے بارے میں پھر گھر میں کوئی بات نہ ہوئی۔ بھابی نے بھی یہ بات نہیں چھیڑی۔

لیکن ایک دن میں آرام کرسی میں بیٹھا تھا کہ وہ پچھلے دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر یونہی کھڑا رہ کر وہ زور سے کھنکھارا اور اپنی عادت کے مطابق دروازے میں بیٹھ گیا۔ میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ کچھ بے چین سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور میرے پاس آیا۔ دوبارہ کھنکھارتے ہوئے بولا، ''تم گھر ہی میں بیٹھے رہتے ہو۔''

''ہاں۔''

''اوب نہیں جاتے؟ گھومنا پھرنا چاہیے۔ طبیعت بہلے گی۔''

''ہاں۔''

''پھر باہر نکلتے کیوں نہیں؟''

''جی نہیں کرتا۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا، ''کھیت میں گھاس کے گٹھے باندھے جا رہے ہیں۔ وہاں نگرانی کرنے کے لیے کوئی نہیں ہے۔''

''لیکن میں کھیت میں کیسے جا پاؤں گا؟ تتی چڑھائی کون چڑھے گا؟'' میں نے کہا۔ سستی کے

گھر کے پاس سے گزرنے والی اس پگڈنڈی پر پھر قدم رکھنے کی مجھے کوئی خواہش نہ تھی۔

"ہاں، یہ تو ٹھیک ہے،" اس نے کہا۔ "اب کل گھاس کے گٹھے یہیں آ جائیں گے۔ انھیں گن کر وصول کر لینا۔"

"ٹھیک ہے۔"

وہ تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہا۔ پھر کچھ اداس سا ہو کر چل دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے میں بھابی کھڑی تھی۔ میری نظر پڑتے ہی وہ جھٹ سے وہاں سے چلی گئی۔

مجھے احساس ہوا کہ گھاس کے گٹھوں کا صرف بہانہ تھا۔ بھائی کو مجھ سے بات کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے بھابی نے یہ بہانہ ڈھونڈا ہوگا۔

اگلے دن سے میں پچھلے دروازے میں آ کر بیٹھنے اور مزدوروں کے لائے ہوئے سوکھی گھاس کے بڑے بڑے گٹھے گننے لگا۔ گھر کے پچھواڑے گٹھوں کا انبار جمع ہونے لگا اور پچھم کی طرف ڈھلتا ہوا سورج اس انبار کے پیچھے چھپ جانے لگا۔ پھر گٹھوں کا یہ انبار اور اونچا ہوتا گیا۔

ایک دن ہوا ناقابلِ برداشت حد تک تیز ہو گئی۔ اس میں ایسی برف جیسی دھار اور ٹھنڈک تھی جس سے بدن کپکپانے لگتا۔ کہرا دن بھر چھایا رہنے لگا۔ دھوپ بہت دیر میں نکلتی۔ میں شام کے وقت گٹھوں کے اس انبار سے گھاس کھینچ کر الاؤ سلگا کر تاپنے لگا۔ پھر گٹھوں کا وہ انبار پورا ہو گیا اور پچھواڑے کے آنگن میں لوگوں کی آمدورفت بند ہو گئی۔ میں شام کے وقت پچھواڑے کے آنگن میں کانپتی ہوئی پاگل سرد ہوا کو جھیلتے ہوئے اکیلا بیٹھا رہتا اور جلتے ہوئے الاؤ کے سرخ شعلوں پر نگاہ جمائے رہتا۔

ایسی ہی ایک رات جب میں الاؤ کے پاس بیٹھا تھا، بھابی لپکتی ہوئی گھر سے باہر نکل کر آئی اور مجھ سے کہنے لگی: "کھیت میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ کسی کلواڑی مزدور نے ان پر حملہ کر دیا ہے۔ آپ ذرا جا کر دیکھیے..."

میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور کھیت کی طرف روانہ ہو گیا۔ بابا کو اس واقعے کی خبر نہ تھی۔ میں انھیں کچھ بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں پچھلے دروازے سے باہر نکلا۔ لیکن بھائی مجھے راستے ہی میں مل گیا۔ اندھیرے میں اس نے پہلے مجھے پہچانا ہی نہیں۔ میں نے اس سے پوچھا، "کیوں رے،

Scanned with CamScanner

کیا ہوا؟''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ پل بھر اس اندھیرے میں میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر ایک دم پھٹ پڑا۔ ''سالے کلوازیوں نے مجھے مارنے کی کوشش کی...''

''مگر کیوں؟''

''وہ اپنے مویشی ہماری گھاس میں چرانے لے آئے تھے۔ میں نے انہیں ہنکالا تو گرما گرمی ہو گئی...''

''تم نے گالی دی ہوگی؟''

''بالکل۔ چوروں کو گالی نہ دی جائے؟ کیا ان کے باپ کی گھاس ہے؟''

''لیکن گالی دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اب یہ پہلے والا زمینداروں کا زمانہ نہیں رہا۔ ان سے کہہ دیتے کہ اپنے مویشی وہاں سے نکال لیں...''

''ہاں... دیں گالیاں! غلطی ہوئی! پر کیا انہیں مجھ پر حملہ کرنا چاہیے تھا؟ وہ تو اچھا ہوا کہ میرے مزدور ساتھ تھے، نہیں تو مشکل ہو جاتی...''

میں نے کہا، ''چلو، پہلے گھر چلتے ہیں۔''

وہ چپ چاپ میرے ساتھ گھر چلا آیا۔ کچھ کہے بغیر ہاتھ پیر دھوئے اور کھانا کھا لیا۔ لیکن اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ اس نے اندھیرے میں پچھلا دروازہ کھولا اور ٹھنڈی ہوا کے جھکڑوں میں کھڑا ہو کر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا:

''یہ کلوازی سالے اپنی اوقات بھول گئے ہیں۔ کہتے ہیں، زمینداروں کو نکال کر پاکستان بھیج دیں گے۔ دیکھتا ہوں کیسے نکالتے ہیں۔ کیا سمجھتے ہیں سالے، زمینداروں پر ہاتھ اٹھانا اتنا آسان ہے؟''

جب وہ دروازے میں کھڑا یہ سب کہہ رہا تھا، تب میں اور بھابی باورچی خانے میں بیٹھے سن رہے تھے۔ بھابی کا اس بڑبڑاہٹ کی طرف کتنا دھیان تھا، کون جانے۔ اس نے کھانا کھایا اور باورچی خانے کی صفائی کرنے کے بعد اکیلی چولھے پر رکھی دودھ کی پتیلی کے پاس بیٹھی رہی۔

''میں کورٹ جاؤں گا، کیس کروں گا، سالوں کی مشکیں کسوا دوں گا،'' وہ زور سے چیخا اور دھڑام سے دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

میں نے بھابی کی طرف دیکھا۔ وہ اُبال پر آئے ہوئے دودھ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے میں مصروف تھی۔ اس نے دودھ کی پتیلی چولھے سے اتاری اور مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

''ہنسومت۔ اس کو سمجھاؤ۔ کورٹ کچہری کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔''

''آپ ہی سمجھایئے۔''

''لیکن کیوں؟ تم سمجھاؤ گی تو کیا بگڑ جائے گا؟ کچھ دیر پہلے تو کیسی گھبرا گئی تھیں۔''

اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔ ''گھبرائی تو اس لیے تھی کہ کہیں ان کی جان کو خطرہ نہ ہو،'' اس نے کہا۔ ''آپ کو بھیجنا ہی میرے اختیار میں تھا، وہ میں نے کیا۔ ان کو سمجھانا میرے بس میں نہیں ہے۔ اور مجھ سے ایسا کرنے کو کہیے بھی مت۔ کوئی فائدہ نہیں۔''

بابا کو دوسرے دن سب پتا چل گیا۔ شاید بھائی نے ہی انھیں بڑھا چڑھا کر بتایا ہوگا، کیونکہ ان پر اس کا بہت عجیب اثر ہوا۔ انھوں نے بھائی کے مقدمہ کرنے کے ارادے کی تائید کر دی تھی۔

مجھ سے انھوں نے کچھ نہ کہا۔ شاید انھوں نے سوچا ہوگا کہ میں انھیں اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن مجھے اپنی اس بے بسی پر تعجب ہوا کہ میں اس معمولی سی بات کو بڑھنے سے روک نہ سکا۔ آخر میں نے خود ہی ان سے جا کر پوچھا: ''آپ نے بھائی کو مقدمہ کرنے کے لیے کہا ہے؟''

''ہاں،'' انھوں نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

''لیکن اصل میں ہوا کیا تھا، یہ کس کو معلوم ہے؟ ہم لوگ پوچھ تاچھ کرتے ہیں۔ معاملے کو یہیں نمٹا لیں گے...''

''ٹھیک ہے۔ نمٹ لو،'' پھر وہی روکھا، خشک لہجہ۔ ''مجھے انکار نہیں ہے۔ لیکن۔ نمٹے گا کون؟ سامنے کون آئے گا؟''

''میں سامنے آتا ہوں۔''

''دیکھ لو۔ نمٹ جائے تو اچھا ہی ہے...''

اتنا کہہ کر وہ رک گئے اور کچھ دیر کے لیے میرا ذہن چکرا سا گیا۔ مجھے لگا اس معاملے میں پڑنا ٹھیک نہیں۔ جو ہو رہا ہے ہونے دو۔ اگر کوئی دھماکا ہوتا ہے تو ہو جائے! اگر اس میں میں بھی جل جاؤں تو جلنے دو۔ لیکن پھر آئندہ ہونے والے واقعات کی بھیانک تصویریں میرے ذہن میں گھومنے لگیں اور

میں لرز گیا۔ یوں الگ تھلگ رہنا بے معنی تھا۔ بھائی کے ساتھ ہونے والے واقعے کے جو مزدور گواہ تھے، میں نے ان کو بلوایا۔ ان کا بیان سن کر میری بھی یہی رائے بن گئی کہ کلواڑیوں نے جان بوجھ کر جھگڑا چھیڑا تھا۔ اور میں اپنے ہی تجویز کیے ہوئے طریقے میں پھنس گیا۔ پندرہ برس بعد غیر ارادی طور پر گاؤں کے جھگڑے میں پڑ گیا۔ میں نے وہ جھگڑا سلجھانے کی کوشش کی... اور مسلمان ایک بار پھر مجھ پر برہم ہو گئے۔

پندرہ سال پہلے بھی وہ مجھ پر اسی طرح برہم ہوئے تھے۔ اور گاؤں کے کلواڑیوں نے اپنی شکایت میرے پاس لا کر ان کا غصہ اور بڑھا دیا تھا۔ ایک رات وہ میرے پاس آئے اور مجھ سے پوچھنے لگے، ''زمیندار اپنی زمین واپس مانگ رہے ہیں۔ ہماری بٹائی لینے سے انکار کر رہے ہیں۔ ہم کیا کریں؟''

جب وہ میرے پاس آئے تھے تو سب سے پہلے بابا سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ وہ بھانپ گئے کہ یہ لوگ کیوں آئے ہیں۔ انھوں نے پکار کر مجھے بلایا۔ میں باہر نکلا تو وہ مجھ سے بولے، ''یہ لوگ تم سے ملنے آئے ہیں...''

ان کے پرسکون، بے پروا لہجے سے میں پریشان ہو گیا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ خاموش بیٹھے رہے۔ میں بوکھلایا ہوا وہیں کھڑا رہ گیا۔ کلواڑی زمین پر بیٹھے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

میں نے انھیں زمین پر سے اٹھ کر برآمدے میں بنچ پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ بے چین اور شرمندہ سے اوپر بیٹھے۔ پھر میں نے ان سے کہا، ''زمین کا قبضہ مت چھوڑنا۔ بٹائی میں جتنا دھان دیتے ہو اس سے زیادہ مت دینا۔ اگر وہ انکار کر رہے ہیں تو اتنے دھان کی قیمت انھیں ڈاک سے بھجوا دو۔''

''اور اگر پیسے بھی نہ لیں تو؟''

''وہ بعد میں دیکھیں گے۔ ابھی یہی کرو...''

وہ اٹھے اور رام رام کر کے چلے گئے۔

بابا اسی طرح ساکت چبوترے پر بیٹھے رہے۔ میں خود کو جھینپا ہوا سا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ انھیں یہ بات پسند نہیں آئے گی کہ میں نے کلواڑیوں کو صلاح دی۔ میرا خیال تھا وہ مجھے

اس بات پر ملامت کریں گے کہ میں کلواڑیوں کو مسلمان زمینداروں کے خلاف بھڑکا رہا ہوں۔ لیکن انھوں نے کچھ بھی نہ کہا۔ انھوں نے گلا صاف کیا اور تھوکا۔ اور خاموشی کو توڑنے کے ارادے سے انھوں نے کہا، "کیوں رے، آج مرار جی دیسائی چینل میں آئے تھے۔ کیا کہا انھوں نے؟"

یہ بات جلد ہی سارے گاؤں میں پھیل گئی کہ میں نے کلواڑیوں کو زمین کا قبضہ نہ چھوڑنے کی صلاح دی ہے۔ مسلمان غصے میں آ گئے۔ لیکن انھوں نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا۔ میرے سلسلے میں انھوں نے شریفوں والا رویہ اختیار کیا کہ موالی کے سامنے پڑنا ٹھیک نہیں۔ اس کے بدلے انھوں نے بابا کو تنگ کرنا شروع کیا۔ انھوں نے بابا پر الزام دھرا کہ ان کی نرمی کی وجہ سے میں بگڑا جا رہا ہوں۔

"اس سے زیادہ لاڈ کرنے کی ضرورت نہیں،" انھوں نے کہا۔ "کل وہ آپ پر ہی الٹ پڑے گا۔ یہ تو وہ کہنے ہی لگا ہے کہ خدا نہیں ہے۔ کل باپ کو باپ کہنے سے بھی انکار کر دے گا۔"

بابا نے انھیں کوئی جواب نہ دیا۔ مجھ سے بھی اس سلسلے میں کچھ نہ کہا۔ اور کلواڑیوں کو میری دی ہوئی صلاح ہی زمینداروں کے اپنی زمینوں سے محروم ہونے کی تمہید ٹھہری۔

لیکن اب پہلے کی کوئی تلخی باقی نہیں تھی۔ مسلمان اپنی زمینیں کھو ہی بیٹھے تھے۔ (کبھی نہ کبھی تو ایسا ہونا ہی تھا۔) اور اب وہ ماضی کا قصہ بھی ان کی یادداشت سے محو ہو چکا تھا۔ اب گئے زمانے کے زمینداروں کی شان و شوکت کی یادیں تازہ کرتے وقت وہ اس قصے کا مذاق سے ذکر کرنے لگے تھے۔ "ارے یہ تو ہونا ہی تھا! تمھارا اس میں کیا دخل؟ تم اگر نہ ہوتے تو کیا زمینداری رہ جاتی؟" اس طرح وہ میرا مذاق اڑاتے۔ صرف بابا اس بابت خاموش رہتے۔ جب یہ واقعہ ہوا تب بھی خاموش رہے، اور آج بھی خاموش تھے اور خود کو بے پروا ظاہر کر رہے تھے۔

اگلے دن میں کلواڑیوں کی بستی میں گیا۔ پندرہ سال پہلے مجھ سے صلاح لینے آنے والے بعض کلواڑیوں سے میری ملاقات ہوئی۔ اس بستی کو بھی میں برسوں بعد دیکھ رہا تھا۔

اس بستی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہی چھپروں والے گھر... وہی دیواروں پر کھونٹوں سے لٹکے ہوئے ہل اور پھالیں اوسارے میں بندھے ہوئے مویشی... پہلے کی طرح لنگوٹ باندھے کلواڑی۔

میں وہاں پہنچا تو چار پانچ لوگ اپنے اپنے برآمدے میں بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ میرے آنے پر بستی میں مجھے کوئی خاص ہلچل دکھائی نہیں دی۔ وہ اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں، نہ اٹھ کر آگے آئے، نہ کسی نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ انھوں نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ مجھے نظر انداز کر کے آپس میں بات کرتے رہے۔

میں کچھ دیر ان کے گھروں کے سامنے یونہی کھڑا رہا۔ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ لیکن آخر کار میں نے خود آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ان میں سے ایک کو پکارا اور اس سے کہا، ''مجھے تم لوگوں سے کچھ بات کرنی ہے۔'' اور خود ہی ایک گھر کے برآمدے میں قدم رکھا۔ اس دوران گھر کے مالک نے وہاں پڑی ایک گھونگھڑی بائیں ہاتھ سے اٹھا کر بے پروائی سے آگے اچھال دی۔ میں اسے بچا کر اس پر بیٹھ گیا۔ وہ لوگ خاموشی سے آ کر میرے گرد بیٹھ گئے۔

ایک بار پھر بات کا آغاز میں نے کیا۔ ہم سب کو ایک گاؤں میں رہنا ہے، ہم سب کو ایک دوسرے کی ضرورت پڑے گی، یوں آپس میں لڑائی جھگڑا کریں گے تو کیسے گذارہ ہوگا؟ میں نے اس قسم کا لہجہ اختیار کیا اور ان سے یہ ساری باتیں کہہ دیں۔

پہلے وہ چپ چاپ میری باتیں سنتے رہے۔ پھر وہ بولنے لگے۔ ایک کے بعد ایک۔ ہر ایک اپنے لہجے میں۔ اپنی اپنی آواز میں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کی آواز میں ایک جیسا کڑاپن تھا جس کی میں توقع نہیں کر رہا تھا۔ مجھے ان کے لہجے کے اس کڑے پن نے چونکا دیا۔ وہ جھگڑا نمٹانے پر آمادہ نہ تھے۔ کسی بات کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ نہ کچھ کہنا چاہتے تھے اور نہ کسی کی بات سننے پر راضی تھے۔ آخر میں نے دلیل کا سہارا لیا۔

''کیا تم لوگ اپنے مویشی ہماری چراگاہ میں لائے تھے؟'' میں نے ان سے پرسکون لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں، ہاں۔ لائے تھے،'' کئی گستاخ، بے پروا آوازوں نے جواب دیا۔

''اور میرے بھائی نے تمھیں گالیاں دیں، یہی نا؟''

''لیکن کیوں؟ اس نے گالیاں کیوں دیں؟ ہماری ماں بہنوں کی بے عزتی کیوں کی؟''

''اس نے غلط کیا۔ لیکن تم اپنے مویشی وہاں کیوں لائے؟''

''گھاس والی زمین جو ہوئی۔ اچھی چراگاہ ہے۔ چار مویشی وہاں چلے گئے تو کیا ہو گیا؟''

''ایسا کیسے؟ یہ تم لوگوں نے غلط کیا... یہ قاعدے کے خلاف ہے...''

مگر وہ لوگ قاعدہ قانون ماننے کے موڈ میں نہیں تھے۔ کسی اور کی چراگاہ میں اپنے مویشی لے جانے سے کوئی قاعدہ ٹوٹتا ہے، یہ ان کے ذہن ہی میں نہ آتا تھا۔

''تو اب کیا کیا جائے؟ یہ معاملہ سلجھا لیتے ہیں۔''

''مطلب، کیا کرنا ہوگا؟''

''بھائی کو اپنی غلطی ماننی چاہیے کہ اس نے تمھیں گالیاں دیں۔ اور تم لوگ اسے مارنے کو دوڑے تمھیں اس پر افسوس ظاہر کرنا چاہیے۔ بس۔''

''نہیں'' وہ ایک دم گرج کر بولے۔ میرے تجویز کیے ہوئے سمجھوتے کو انھوں نے مسترد کر دیا۔ ان کی آوازوں میں ایسی بے نیازی تھی کہ میں چونک پڑا۔ انھوں نے کہا، ''اپنے بھائی کو معاملہ آگے لے جانے دو۔ ہم اس کا سامنا کریں گے۔''

میں سمجھ گیا کہ اور کچھ کہنا لا حاصل ہے، اور میں وہیں سے اٹھ کر واپس چل دیا۔ جاتے ہوئے میں نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

کلواڑیوں کے گھر نہیں بدلے۔ انھوں نے لنگوٹ باندھنا بھی نہیں چھوڑا۔ لیکن انھوں نے اپنی تنظیم بنالی ہے۔ ہزاروں روپے کا چندہ جمع کر لیا ہے۔ چلتے ہوئے مجھے کسی کی بتائی ہوئی یہ بات یاد آئی۔ جب گھر لوٹا تو میرے دماغ میں صرف اتنی ہی بات رہ گئی تھی۔

اس واقعے کے بعد معاملہ خود بخود میرے ہاتھوں سے نکل کر دوسروں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ میں دوبارہ صبح شام کھیتوں پر منڈلاتے ہوئے کہرے پر نگاہ جمائے، پچھواڑے کے آنگن میں بیٹھا رہنے لگا، اور ادھر کلواڑیوں پر مقدمہ کرنے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

پنی مخصوص جگہ بیٹھے بیٹھے میں بدلتے ہوئے موسم کے گرفت میں نہ آنے والے تغیرات کا مشاہدہ کرتا رہا۔ میں دبی ہوئی ہوا میں ہر روز پھر سے جان پڑتے اور منڈلاتے ہوئے کہرے کو میلوں دور اڑا لے جاتے دیکھا کرتا۔ وا شِشٹھی ندی کا پاٹ ان دنوں میں پتلا اور چوڑا، کمزور اور منہ زور ہوتا

رہا۔ کنارے پر بالو کے ٹیلوں نے کئی بار اپنی جگہیں بدلیں۔ کبھی وہ پہاڑی کی طرح اونچے ہو جاتے اور کبھی غائب ہو جاتے۔ انھیں دیکھتے ہوئے مجھے احساس ہونے لگا کہ میں ایک ہی جگہ بیٹھا ہوا ہوں اور دنیا آگے چلی جا رہی ہے۔ پچھلے پندرہ سال یہی ہوتا رہا ہے۔ دوسروں سے قدم ملا کر چلنے کی طاقت مجھ میں نہیں رہی۔

آگے پیش آنے والے واقعات بہت تیز رفتاری سے ہوئے۔ بھائی نے پولیس میں شکایت درج کرائی، پھر کلواڑیوں کا تھانے میں آنا جانا ہوتا رہا۔ بھائی اور ان کے مزدوروں نے اپنے بیانات دیے۔ اور میں پچھواڑے کے آنگن میں الگ تھلگ بیٹھا، گویا غیر جانبداری سے، ان سب واقعات کا جائزہ لیتا رہا۔

اور اچانک واقعات کا یہ سلسلہ بالکل ختم ہو گیا! بھائی نے اپنے ساتھ ہونے والی مار پیٹ کی تصدیق کے لیے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ ان کے مزدوروں کی گواہیوں نے بھی اس کی تائید کی۔ یہی نہیں، بلکہ انھوں نے یہ تک کہا کہ کلواڑیوں نے اس زمین کا مالک ہونے کا دعویٰ کیا اور زمینداروں کو وہاں سے نکال دینے کی بات کی۔

مجھے حیرت سے دھکا سا لگا۔ یہ بات سچ نہ تھی۔ لیکن بھائی کلوڑیوں کے بھاگنے کے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس سفید جھوٹ نے میری غیر جانبداری کو ختم کر دیا۔ میں نے بھائی کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ کلوڑیوں نے ان مزدوروں کو اپنے بس میں کرنے کی کوششیں کیں، لیکن انھیں توڑ نہ سکے۔ آخر مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ تب کلواڑیوں نے ناچار بھائی سے معافی مانگی اور اس نے مقدمہ واپس لے لیا۔

ان سب واقعات سے میری حالت مضحکہ خیز ہو گئی۔ بھائی اور دوسرے مسلمان اور شیر ہو گئے۔ جب بھائی مجھے کلواڑیوں کے معافی مانگنے کی خبر سنانے پچھواڑے کے آنگن میں آیا تو اس کی آنکھوں میں جھلکتے جیت کے گھمنڈ نے مجھے بے چین کر دیا۔ وہ بازار سے بوندیاں لایا تھا۔ میں وہ بوندیاں ہاتھ میں لے کر آہستہ آہستہ کھانے لگا۔ بوندیاں لذیذ تھیں، گرما گرم۔ میں وہیں اپنی جگہ بیٹھا رہا، اور دنیا مجھ سے آگے ہی آگے چلتی رہی۔

اس کے تین چار دن بعد سمتی ہمارے گھر آئی۔ کلواڑیوں کے اس معاملے کے اچانک پھوٹ پڑنے سے میں اسے لگ بھگ بھول ہی گیا تھا۔ جب وہ آئی تب میں باورچی خانے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ بھابی مزے چھیل رہی تھی۔ میں نے سمتی کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور پھر چائے پینے لگا۔

اس روز وہ کچھ الگ کیفیت میں دکھائی دی۔ سنجیدہ تھی۔ کچھ دیر ساکت سی دروازے میں کھڑی رہی۔ اسی بیچ بھابی نے اسے بیٹھنے کو کہا اور چائے کے لیے پوچھا۔ اس نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ میرے چائے ختم کرتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا: ''ذرا باہر آؤ گے۔ تم سے کچھ کام ہے۔''

میں خاموشی سے اس کے ساتھ پچھواڑے میں آ گیا۔

''آج شام کو گھر آؤ گے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''کس لیے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

''کیا ہے؟ یہیں کہہ دو...''

''نہیں۔ تمھیں گھر آنا پڑے گا۔ شام کو۔ یا بلکہ رات کو۔''

کچھ لمحے میرے ذہن میں خیالوں کی لہریں اٹھتی رہیں۔ میں کچھ جواب دیے بغیر گنگ سا اس کے سامنے کھڑا رہ گیا۔ وہ دوبارہ بولی: ''آج دوپہر مجھے بازار جانا ہے۔ لوٹتے ہوئے دیر ہو جائے گی۔ اس لیے شام کو دیر سے آنے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ تمھیں خوامخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

میں نے آنے کا وعدہ کر لیا اور وہ باہر ہی سے چلی گئی۔ جب میں باورچی خانے میں واپس آیا تو بھابی نے پوچھا: ''سمتی نے کیوں بلایا ہے؟''

''رات کو گھر آنے کو کہا ہے۔''

''رات کو؟'' اس نے پوچھا۔ اس کے معنی خیز لہجے سے مجھے تکلیف ہوئی۔ میں نے اس سے کہا: ''ایسی کوئی بات نہیں ہے، بھابی۔ آج وہ کچھ فکرمند دکھائی دے رہی تھی۔''

''ہاں۔ میں نے بھی دیکھا۔ میں برا نہیں مانتی۔ لیکن آپ وہاں مت جائیے۔ اگر ان کو پتا چل گیا تو خواہ مخواہ آپ لوگوں میں پھر جھگڑا ہوگا۔''

اس کا یوں میری راہ روکنا مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے کہا: ''جھگڑا کیوں ہوگا؟ میری مرضی۔

اگر میں اس سے ملوں تو کسی اور کو کیا غرض؟"

میری یہ نرم دلیل اس کے گلے اتر گئی۔ وہ مسکرا کر بولی: "اگر آپ نے جانے کا ارادہ کر لیا ہے تو جائیے۔ آپ کو روکنے سے کیا ہوگا۔"

اس رات میں سمتی کے گھر گیا۔ وہ برآمدے میں بیٹھی بے تابی سے میری راہ دیکھ رہی تھی۔ میرے پہنچتے ہی وہ مجھے رسوئی گھر میں لے گئی اور کچھ کہے بغیر چائے کا پانی رکھ دیا۔ میں عجیب سا ایک جگہ بیٹھا رہا۔ اس کے ہاتھ سے چائے لے کر پی، پیالی نیچے رکھی اور پاگلوں کی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔

پھر اس نے بولنا شروع کیا۔

وہی بولتی رہی۔ میں سن رہا تھا۔ سنتا رہا۔ اس کے لفظ برسات کے بعد کی واشٹھی ندی کے منہ زور پانیوں کی طرح بہہ رہے تھے۔ بیچ کے وقفوں میں آنگن سے آتی سوکھے پتوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی رہی۔ باتوں کے دوران اچانک جذبات کے بھنور پڑنے لگتے اور لفظوں کا بہاؤ ٹوٹ جاتا۔ پھر مجھے اس کی متواتر سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ اس کی آواز تھمے ہوئے آنسوؤں جیسی ہوگئی اور لفظوں کی تصویریں دھندلی پڑ گئیں۔ اس کے لفظوں سے ایسے بھیانک معنی ظاہر ہونے لگے جیسے رسوئی گھر کی دیواروں پر چلتی ہوئی چھپکلیوں کی سرسراہٹ۔

اسی پل میرے ذہن پر نقش سمتی کی تصویر چکنا چور ہوگئی۔ اس شکستہ تصویر میں سے پہلے وان سمتی کا ڈھانچا جھانکنے لگا۔ یہ تصویر اسی کے لفظوں سے بنی تھی۔ اسی نے بنائی تھی اور اسی کے ہاتھوں سے چور چور ہوگئی!

میرا بھائی پہلے اسکول میں پڑھایا کرتا تھا۔ سمتی اس کی شاگرد تھی۔ میں یہ بات جانتا تھا۔ لیکن اپنے لفظوں میں سمتی نے اپنے اور اس کے پیچیدہ تعلق کے ایسے دھاگے بُنے جن سے میں قطعی ناواقف تھا۔ اس نے سمتی کو اُسی وقت اس راستے پر ڈال دیا تھا جب وہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس نے اسے بہلا پھسلا کر اس بے باک تعلق میں گھسیر لیا تھا۔ تب اس کی عمر پندرہ سولہ سال کی تھی... تب سے ان کے تعلقات اسی طرح کے رہے تھے۔ معصومیت میں قائم کیے جانے والے اس جنسی تعلق سے سمتی مدل کر رہ گئی۔ اس کے سامنے لاچار ہوگئی؛ اور لاچار ہی رہی۔ ہمیشہ اس کی خواہش کے سامنے سر جھکا دیتی جیسے ایسا نہ ہونا اب اس کے بس میں نہ رہا تھا...

جذبات کے اس بہاؤ میں سمتی اپنے ذہن کا توازن کھو بیٹھی۔ وہ مجھ سے اپنے پہلے جنسی تجربے کا بیان کرنے لگی جسے سن کر میں تھرا اٹھا۔ جب اس نے اپنا بیان پورا کیا تو تھک کر یوں دیوار سے سر ٹکا لیا جیسے ابھی ابھی اس جنسی تجربے سے باہر نکلی ہو۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہنے لگیں اور وہ گویا دوبارہ شعور کی حالت میں واپس آ گئی۔

مجھ سے کچھ نہ کہا گیا۔ بس بیٹھا چھپکلیوں کی چک چک سنتا رہا۔ باہر ہوا چلنے سے سوکھے پتوں کے سرسرانے کی آواز مجھے دلاسا دے رہی تھی۔

اگلے دن بھابی نے مجھ سے پوچھا:

''سمتی نے کیا بتایا؟''

اس نے یہ سوال بہت ہی سرسری لہجے میں پوچھا۔ لیکن مجھے لگا کہ اس سوال کے پیچھے اس کا کوئی پوشیدہ مقصد ہے۔ میں رات کو جب گھر لوٹا تو اسی نے میرے لیے پیچھے کا دروازہ کھولا تھا۔ تب وہ آدھی نیند میں تھی۔ اس نے صرف اتنا پوچھا تھا کہ کیا بجا ہے؟ اور میرے کہنے پر کہ ایک بجا ہے، اس نے کہا تھا، ''کتنا وقت لگا دیا آپ نے'' اور وہاں سے چلی گئی تھی۔ لیکن اس وقت زیادہ سوال جواب کرنا شاید اسے ٹھیک نہیں لگا ہوگا۔ اور اگر اس نے کچھ پوچھا بھی ہوتا تو میں اسے کچھ بتانے کی کیفیت میں نہیں تھا۔ سمتی کی باتوں نے مجھ پر مارفین جیسا اثر کیا تھا۔ میرے ذہن کی حسیں سُن ہو گئی تھیں۔ اس کے گھر سے نکلتے ہوئے اس سے یہ تک کہنے کا مجھے ہوش نہ تھا۔

میں نے بھابی کو جواب دیا، ''اس نے وہی بتایا جو ہم لوگوں کو معلوم ہے۔''

''پھر اس کے لیے آپ کو رات کے وقت بلانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''شاید اس لیے کہ بھائی کو پتا نہ چلے۔''

''ان کو وہ خود بتائے گی،'' اس نے کہا۔ ''آپ خبردار رہیے گا۔ اس کے گھر مت جایا کیجیے۔ ایک بار گھر میں تماشا ہو چکا ہے، معلوم ہے نا؟ ایسا پھر سے نہیں ہونا چاہیے...''

لیکن میرے ذہن پر اب تک اس مارفین کا غلبہ تھا اور مجھے اس اُپدیش کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں اگلے کئی دن اس کیفیت سے باہر نہ نکل سکا۔ اس میں مجھے صرف سمتی دکھائی دیتی رہی۔

جذبات سے عاری، محض خواہش کی زد میں آیا ہوا ایک بدن۔ وہ ہوس کے اس حملے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرا سہارا لینے کی کوشش کر رہی تھی، اور میں اسے یہ سہارا نہیں دینا چاہتا تھا۔

کئی دن وہ دکھائی نہیں دی۔ پھر ایک بار ہمارے گھر آئی اور یوں اس کا آنا جانا پھر سے شروع ہو گیا۔ ایک بار اور اس نے مجھے اپنے گھر بلایا۔ اس کے پاس ہر بار مجھے بتانے کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اپنی زندگی کی وہی گتھی سمجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کی اس تکرار سے مجھے محسوس ہوا کہ اسے صرف کوئی ہمدرد سننے والا چاہیے تھا۔

''تمھیں معلوم ہے کلواڑیوں نے تمھارے بھائی پر کیوں حملہ کیا تھا؟'' ایک رات اس نے مجھ سے پوچھا۔

اس کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنے سے مجھے عجیب سا لگتا تھا۔ آنگن سے کوئی گزرتا تو سوکھے پتے چرچرانے لگتے۔ مجھے خوف ہوتا کہ کوئی مجھے اس کے گھر آتے جاتے دیکھ لے گا۔ اسے محسوس ہو گیا کہ میرا دھیان اس کی باتوں کی طرف نہیں ہے ''آنگن میں سے تو بہت سے لوگ گزرتے رہتے ہیں!'' اس نے مجھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے اپنا وہی سوال دہرایا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''میرے چچیرے بھائی کے کہنے پر... یہ تم اپنے بھائی سے کہہ دینا' اسے خبردار کر دینا!''

یہ اطلاع میرے لیے نئی تھی۔ اب تک میرا خیال تھا کہ جھگڑا مویشیوں کے چراگاہ میں آنے پر ہوا تھا۔ لیکن میں بھائی کو یہ کہہ کر خبردار کر سکتا تھا؟ اسے تو اس کا یقیناً اندازہ ہو گا! دراصل اس معاملے میں صرف میں ہی بے بس تھا۔ میں وہ جھگڑا نہیں سلجھا سکا تھا۔ اور مجھے یقین نہیں تھا کہ بھائی میری بات پر کان دھرے گا۔ اس نے پہلے ہی دن مجھے چپ کرا دیا تھا۔

تب میں نے اپنے غصے کا رخ اس کی طرف پھیر دیا۔ ''تم بمبئی کیوں نہیں جاتیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ ''اب بھی تمھارا دل اسی میں اٹکا ہوا ہے، ہے نا؟''

''تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟'' اس نے چمک کر جواب دیا۔ ''رنڈی؟ بازار میں بیٹھنے والی؟ اور خود کو بڑا باخلاق سمجھتے ہو؟ اسی لیے میرے گھر آنے سے ڈرتے ہو؟ لیکن تمھیں معلوم ہے کہ میں کئی دن سے تمھارے بھائی سے نہیں ملی ہوں؟''

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ مجھے لگا کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتی۔

''کتنے دن سے؟''

''میں نے گنے نہیں،'' اس نے زور سے کہا۔ ''لیکن جس رات تم پہلی بار یہاں آئے تھے، تب سے! میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ مجھ سے مت ملنا۔''

''اس نے کیا کہا؟''

''اس کو میری بات کا یقین نہیں آیا۔ کم سے کم مجھے تو یہی لگا۔ لیکن تب سے وہ مجھ سے ملنے نہیں آیا ہے۔''

دھیرے دھیرے مجھے اس میں تبدیلی آتی محسوس ہونے لگی۔ اب وہ زیادہ تر وقت گھر ہی پر گزارنے لگی۔ اگر باہر نکلتی بھی تو پاس کے گاؤں میں اپنے رشتے داروں کے پاس چلی جاتی، در بھی کبھار بازار کا چکر لگا لیتی۔ رشتے داروں سے مل کر شام کے وقت لوٹتے ہوئے اگر مجھے پچھواڑے میں بیٹھا دیکھتی تو وہاں چلی آتی۔ پھر کہتی، ''بہت دنوں سے گھر نہیں آئے۔ ایک بار آ جاؤ۔ آج رات آ جاؤ۔'' اور پھر میں اس کے گھر چلا جاتا۔ ان موقعوں پر وہ اپنے بارے میں بات کرنے کے بجائے میرے بارے میں دریافت کرنے لگتی۔ پچھلے پندرہ برس گاؤں سے باہر گزاری ہوئی میری زندگی کی بابت جاننے کی کوشش کرتی۔ مجھے اپنے بارے میں بات کرنے کا کوئی شوق نہیں ہوتا تھا۔ میری نظر میں میرے پاس اپنے بارے میں اسے بتانے کے لائق کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں اس موضوع کو ٹال دیتا اور ہماری گفتگو وہیں رک جاتی۔ جب میں رات کو گھر آتا تو بھابی کچھ کہے بغیر دروازہ کھول دیتی اور کوئی سوال نہ کرتی۔ وہ اکثر مستی کے بارے میں بات کرنے سے کترانے لگی۔

لیکن ایک دن اس نے مجھ سے سوال کیا، ''مستی کیا کہتی ہے؟''

اس کے لہجے کا طنز مجھے نہ بھایا۔ میں نے کہا، ''کیا کہے گی؟''

''پھر آتی رات تک آپ لوگ کیا بات کرتے رہتے ہیں؟''

''کچھ خاص نہیں۔ وہ بولتی ہے۔ میں چلا جاتا ہوں۔''

''بس؟''

''ہاں۔ بس اتنا ہی۔''

Scanned with CamScanner

''کیا آپ اسے آپ کے بھائی سے بہتر نہیں لگتے؟'' اس نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کس لحاظ سے؟'' اس کا مطلب بھانپتے ہوئے میں نے پوچھا۔

''ہر لحاظ سے۔ کیوں؟ اس میں کوئی غلط بات ہے؟''

''ہاں، بالکل غلط ہے،'' میں نے کہا۔ ''میرے وہاں جانے کا یہ مطلب نکالنا ٹھیک نہیں ہے۔''

''لیکن وہ کیا کہتی ہے، یہ آپ نے بتایا نہیں۔ کیونکہ آج کل وہ آپ کے بھائی سے نہیں ملتی۔''

''تو ٹھیک ہے نا،'' میں نے کہا۔

''لیکن اس واسطے آپ وہاں رات رات بھر بیٹھے رہیں، یہ کچھ ٹھیک نہیں ہے۔''

''مجھے بھائی جیسا مت سمجھنا۔''

''میں نہیں سمجھتی۔ وہ کم از کم خود کو مسلمان تو مانتے ہیں۔ آپ تو یہ بھی نہیں مانتے۔ اگر آپ کے جی میں آئی تو اس سے رشتہ جوڑ کے بیٹھ جائیں گے، اس کا ڈر لگتا ہے۔''

''اس کی فکر مت کرو۔ مجھے وہ پسند نہیں ہے۔''

میں نے اسے ہنس کر جواب دیا تھا، لیکن مجھے لگا کہ اس کے دل کا شک دور نہیں ہوا۔ اس نے پہلی بار میری بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔

بھابی کی بات سے ایک بار پھر میرے پرسکون ذہن میں لہریں اٹھنے لگیں۔ میں سمتی کے خیال کو جھٹک دینے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اس سے ملنا بند کر دیا۔ اب ٹھنڈ کا زور کم ہو گیا تھا، اس لیے میں نے پچھواڑے کے آنگن میں بیٹھنا بھی ترک کر دیا۔ شاید وہ بہت بار سڑک سے گزرتے ہوئے اس طرف نگاہ ڈالتی ہو گی، اور میرے دکھائی نہ دینے کی وجہ سے آگے چلی جاتی ہو گی، یہ میں جانتا تھا۔ لیکن اتنے دنوں میں وہ ہمارے گھر بالکل نہیں آئی۔

اور پھر ایک دن شام کے وقت اس سے میری اچانک ملاقات ہو گئی۔ میں سڑک پر گھومتا ہوا بازار کی طرف گیا تھا اور نالے کی پلیا پر بیٹھا تھا۔ دن ڈھل چکا تھا اور ہر طرف کہرا چھاتا جا رہا تھا۔ بازار سے گاؤں کی طرف آنے والے لوگوں کی قطار بندھی ہوئی تھی۔ میں پلیا پر بیٹھا ان کی ہلچل دیکھ رہا تھا۔

وہ کب آئی میں نے نہیں دیکھا۔ جب وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تب میرا دھیان اس کی طرف گیا۔ وہ بازار سے لوٹ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سامان کی تھیلی تھی۔ اس نے اسے ہلکے ہاتھ سے پلیا کی منڈیر پر رکھ دیا اور تھکے ہوئے سے انداز میں کھڑی رہی۔

اس وقت وہ مجھے غیر معمولی طور پر حسین لگی۔ اس نے سادہ سی، استری کی ہوئی سفید ساڑی پہن رکھی تھی اور ڈھیلے بندھے ہوئے جوڑے پر گجرا لپیٹ رکھا تھا۔ ساڑی کا پلو اس نے پیٹھ پر سے نکال کر سامنے ڈال لیا تھا اور اسے اپنے ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔

''کہاں سے آ رہی ہو؟'' میں نے محض سوال کرنے کی خاطر سوال کیا۔

''بازار سے۔''

اس سے آگے کہنے کے لیے مجھے کچھ نہ سوجھا۔ پھر وہی بولی، ''آج کل ہو کہاں؟ دکھائی نہیں دیتے؟''

''گھر ہی میں ہوتا ہوں۔ اگر تم آتیں تو معلوم ہو جاتا۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا چہرہ اداس ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا، ''بھابی کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ تمھیں یاد کرتی ہے۔''

''یہ سچ نہیں ہے،'' اس نے ہنس کر جواب دیا۔ ''وہ مجھے گالیاں دیتی ہو گی۔''

''گالیاں تو نہیں دیتی۔ لیکن اگر دیتی تو بھی غلط نہ ہوتا۔ اس نے دکھ میں زندگی گزاری ہے۔ سکھ دیکھا نہیں ہے۔ شوہر کا سکھ نہیں ہے۔ اس کا برتاؤ ہمیں سمجھنا چاہیے۔''

''لگتا ہے تم پر اس کی باتوں کا اثر ہو گیا ہے۔ اسی لیے تم اتنے دنوں سے مجھ سے ملے نہیں۔''

اس بار بھی میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

''تمھاری بھابی بڑی گھنی ہے۔ سامنے میٹھا بولتی ہے، لیکن دل میں بیر رکھتی ہے۔''

''یہ تمھاری غلط فہمی ہے۔ تمھیں اس کے احساسات کو سمجھنا چاہیے۔''

''اب وہ سوال ہی نہیں اٹھتا۔ تم جانتے ہو... میں اب تمھارے بھائی سے بات بھی نہیں کرتی۔ پھر اس نے تمھیں میرے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کیوں کہیں؟''

''اس نے کچھ نہیں کہا ہے۔''

''پھر چلو۔ ابھی چلو میرے ساتھ۔ میرے گھر کھانا کھاؤ۔ چلو گے؟''

میں چند لمحے خاموش رہا۔ پھر بولا، ''گھر پر میرا انتظار ہوگا۔ پورے گاؤں میں مجھے ڈھونڈیں گے۔''

''ٹھیک ہے، تو گھر جا کر کھانا کھا لو اور پھر آ جاؤ۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ آ جاؤں گا۔''

''اور اب یہاں سے اٹھو گے کہ نہیں؟''

میں اٹھا اور ہم دونوں چل پڑے۔ وہ اپنے گھر کی سمت بڑھی اور میں یہ سوچتے ہوئے کہ اسے مجھ سے کیا بات کرنی ہے، اپنے گھر آ گیا۔ کھانا کھا کر میں اس کے گھر گیا۔

''چائے پیو گے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے گردن ہلا کر ہاں کہا۔ اور رسوئی گھر کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ چائے بنانے میں مصروف ہوگئی، اور میں آگ کی روشنی میں اس کی حرکات کو دیکھنے لگا۔

اس نے شام کو پہنی ہوئی ساڑی اب تک نہیں اتاری تھی۔ صرف بانوں میں لپٹا ہوا گجرا اتار کر رکھ دیا تھا۔ بال جلدی جلدی دوبارہ باندھ لیے تھے۔ جب وہ جھکتی تو بال اس کے چہرے کے سامنے آ جاتے۔ اس کا چہرہ اس روشنی میں دمکتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے لگا کہ کسی انجان قوت نے زندگی سے اس کے لگاؤ کو پھر سے زندہ کر دیا ہے۔

وہ چائے لا کر میرے سامنے آ بیٹھی۔ گھٹنے موڑ لیے اور ٹھوڑی آہستہ سے ان پر رکھ لی۔ چھوٹے بچوں کی طرح چائے کا ایک ایک گھونٹ لینے لگی۔

''مجھے کیوں بلایا ہے؟'' میں نے چائے ختم کر کے پوچھا۔

''بہت دنوں سے آئے نہیں اس لیے۔''

''کیا کہنا تھا مجھ سے؟''

''کچھ نہیں۔ اگر ایسا نہ کہتی تو تم آتے ہی نہیں۔''

''یہ تو ہے۔ اس طرح رات کے وقت میرا تمھارے گھر آنا ٹھیک نہیں۔''

''کیوں ٹھیک نہیں؟ کیا غلط کام کرتے ہیں ہم لوگ؟''

''غلط کام تو کچھ نہیں کرتے۔ لیکن لوگ تو غلط سوچ سکتے ہیں۔''

''لوگوں کی اتنی پروا کب سے کرنے لگے؟''

''کچھ معاملوں میں کرتا ہوں، کچھ میں نہیں کرتا۔''

''بزدل ہو، اس لیے ایسا کہتے ہو۔''

''میں بزدل ہوں؟'' مجھے ہنسی آ گئی۔

''ہاں، بزدل۔ لوگوں کے ڈر سے مجھ سے ملنے سے کتراتے ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں پندرہ سال بعد گھر آیا ہوں۔ بلاوجہ پیچیدگیاں پیدا کرنا نہیں چاہتا۔'

''اس میں کون سی پیچیدگی ہے؟ اپنی بھابی سے کہو کہ میں اتنے نیچے نہیں گری ہوں کہ اس کے دیور کے ساتھ بھی سمبندھ باندھوں۔ اس کے شوہر سے رشتہ توڑنے کے لیے ہی تو میں اتنی کوشش کر رہی ہوں۔ مجھے اس سے چھٹکارا پانا ہے۔ اسی لیے تمھیں یہاں بلاتی ہوں تاکہ وہ یہاں نہ آئے۔ اور اگر آئے تو تمھیں بیٹھا دیکھ کر واپس لوٹ جائے۔ اور جب میں تم سے بات کرتی ہوں تو میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ میں گزرے دنوں کو بھول پاتی ہوں۔''

میں بے چین سا ہو گیا۔ میں اس سے آنکھ ملائے سے کترا رہا تھا۔ اس نے اپنی چائے ختم کی اور دونوں پیالیاں ایک طرف رکھ دیں۔ کچھ دیر بعد وہ بولی

''تمھیں گورے یاد ہے؟''

''ہاں ہاں، کیوں، کیا ہوا؟''

''وہ ایک بار یہاں آیا تھا۔''

''مجھ سے ملا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ یہاں گھر بنا کر رہنے کا سوچ رہا ہے۔''

''وہ نہیں لوٹے گا،'' وہ بولی۔

''کیوں؟''

''وہ میرے یہاں ٹھہرا تھا۔ اور تمھارے بھائی نے اس رات پر مجھے مارا تھا۔''

''جانے دو نا۔ گزری باتیں بار بار مت دہراؤ۔ زندگی کو نئے سرے سے شروع کرو۔''

''تب میں نے یہی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن گورے ڈرپوک نکلا۔ تمھاری طرح۔ وہ تمھارے بھائی سے ڈر گیا۔ مجھ سے ڈر گیا۔ اس نے میرے کردار، میری عزت کی بات کا بتنگڑ بنایا۔ ایک دن

چپ چاپ یہاں سے چلا گیا۔ اسے بزدلی نہیں تو اور کیا کہیں گے؟"

"تم پاگل ہو۔" میں نے اس سے کہا۔ "تم یہ کیوں سمجھتی ہو کہ ہر کوئی تمھیں سمجھ لے گا؟"

"ہاں، یہ میری غلطی ہے۔ خیر، جانے دو۔ اس بات کو ہی بھول جاؤ۔" اس نے کہا اور کوئی اور بات کرنے لگی۔

مجھے اکتاہٹ ہونے لگی۔ آنکھوں پر نیند بھی چھانے لگی۔ میں نے پیر پھیلا لیے اور کچھ دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ وہ اسی طرح بولتی رہی اور میں چپ چاپ سنتا رہا۔ وہ پوری رات باتیں کرتی رہی۔ آخر مجھے احساس ہوا کہ بھور ہو گئی ہے۔ "کیا بجا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ساڑھے پانچ..."

"تم اب فوراً گھر چلے جاؤ..." اس نے کہا۔ میں اٹھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر پہنچا۔ پچھلا دروازہ کھلا تھا اور بھائی وہاں کھڑا تھا۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا

اور آہستہ آہستہ دن گزرنے لگے۔ دن کی لکیریں زیادہ، اور زیادہ لمبی کھنچنے لگیں۔ کہرا کافور کی طرح غائب ہو گیا۔ ہرے کھیتوں پر دھول کی تہیں جمنے لگیں۔ پاؤٹے[9] کے ہرے پتے بھورے ہونے لگے۔ ٹھنڈ کم ہوتی گئی۔ دوپہر کے وقت گرمی محسوس ہونے لگی۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دھول کے بادل اڑنے لگے۔ میں دن بھر بابا کے ساتھ سامنے کے چبوترے والے برآمدے میں بیٹھا رہنے لگا۔

۹۔ پاؤٹے سفید چکنے چھلکوں والی پھلیاں، جنھیں وال بھی کہا جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

۴

ایک دن جب میں یونہی گھر میں بیٹھا تھا، اسحٰق ہمارے گھر آیا۔

وہ انھی دنوں افریقہ سے آیا تھا۔ جیسے ہی اس نے برآمدے میں قدم رکھا اس کے لگائے ہوئے عطر کی مہک سارے میں پھیل گئی۔ اس نے آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا تھا۔ وہ پتلون پہنے ہوئے تھا اور بنیان کے اوپر جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ جمعے کا دن تھا، اور اسے دیکھ کر مجھے لگا کہ وہ نماز پڑھ کر آیا ہوگا۔ اندر پیر رکھتے ہی اس نے سلام کیا۔

"وعلیکم سلام۔ آؤ آؤ، بیٹھو" بابا نے کہا۔

وہ برآمدے کے چبوترے پر بیٹھ گیا اور میری طرف مڑ کر بولا

"کیوں رے، جمعے کی نماز میں نہیں آئے؟"

بابا کے سامنے اس کا نماز کا ذکر چھیڑنا مجھے اچھا نہیں لگا لیکن اسے کوئی نہ کوئی جواب دینے کی خاطر میں نے کہا، "یاد نہیں رہا۔"

"یاد نہیں رہا؟" اس نے غصے سے پوچھا۔ "مسلمان ہو یا کون ہو؟ ہمارے کیپ ٹاؤن میں سارے عیسائی گرجا گھر جاتے ہیں۔ کوئی نہ جائے تو پادری اسے برادری سے باہر نکال دیتے ہیں۔"

"اچھا؟ تو اب تمھارا کیا خیال ہے؟ مجھے برادری سے باہر نکالو گے کیا؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! اگلے جمعے کو نماز میں آنا۔ پھر میں کچھ نہیں کہوں گا۔"

میں نے ایک بار بابا کی طرف دیکھا۔ پھر اس سے کہا، "میں نماز نہیں پڑھتا۔ تمھیں پتا ہے نا؟"

"سنو! آپ کا بیٹا کیا کہہ رہا ہے، ذرا سنیے! نماز نہیں پڑھتا! اسے کچھ نصیحت کیجیے،" اس نے بابا کی طرف مڑ کر کہا۔

"تم ہی کہو!" بابا نے کہا اور چپ ہو گئے۔ اس پر وہ اور طیش میں آ گیا۔ اس نے بابا کی طرف سے رخ پھیر کر مجھ سے بحث کرنے لگا۔

"تم نماز نہیں پڑھتے؟ پھر تمھارا فرقہ کون سا ہے؟" اس نے مجھ سے دوبارہ پوچھا۔

"کوئی بھی نہیں۔"

"لیکن تم کلواڑیوں کی طرف ہو، ہے نا؟"

"پہلے تھا۔ اب نہیں ہوں۔"

"پھر میری زمین مجھے ان سے واپس دلواؤ۔"

"نہیں، وہ انھی کی ہے۔ وہ اب قانونی طور پر ان کی ملکیت ہے۔"

"واہ! پھر تم کیسے مسلمان ہو؟ ہمارا نقصان کرنے والے؟"

میں نے اسحٰق کے سوالوں کا جواب دینا بند کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جھگڑا چھیڑنے کے ارادے سے آیا تھا اور اس جھگڑے میں بابا کو اپنی طرف کرنے کی غرض سے اس نے شروع میں نماز کا موضوع چھیڑا تھا۔

لیکن میرے خاموش رہنے سے اسحٰق اور بھڑک گیا۔ "تمھارے بھائی کے ساتھ مار پیٹ ہوئی، کیا تمھیں اس پر بھی کوئی شرم نہیں ہے؟ تم نے انھیں سر پر چڑھایا اور کام ہوتے ہی انھوں نے تمھیں دھتکار دیا؟ خوب دھوکا دیا انھوں نے تمھیں!"

میں اٹھ کر اندر گھر میں چلا گیا۔ اس نے آگے کیا کہا، مجھے معلوم نہیں۔ لیکن جب تھوڑی دیر بعد لوٹا تو وہ جا چکا تھا اور بابا وہیں اکیلے بیٹھے خالی آنکھوں سے اپنے سامنے گھور رہے تھے۔

کچھ دن بعد اسحٰق نے اپنا نیا مکان بنانے کی شروعات کی۔ جس مکان میں وہ لوگ رہ رہے تھے وہ کچھ برا نہ تھا، لیکن اس میں اس کا چچیرا بھائی بھی رہ رہا تھا۔ وہ اپنے کنبے کے ساتھ اس مکان کے ایک

دالان میں رہتا تھا۔ اسحٰق کا نیا مکان بنتے ہی پرانا مکان خود بخود اس کے استعمال میں آ جاتا، اس لیے اس نے اسحٰق کو نئے مکان کی ضرورت کا قائل کر لیا تھا۔

اسحٰق کے بارے میں اس کے چچیرے بھائی نے اپنے ذہن میں کچھ اندازے لگا رکھے تھے۔ اسحٰق کبھی روپے پیسے سے اس کی مدد نہیں کرتا تھا اور جیتے جی اس دالان سے کسی بڑی جگہ منتقل ہونے کا اسے کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لیے اس نے اسحٰق کو نیا مکان بنانے پر راضی کرنے کی ترکیب نکالی تھی۔

اسحٰق نے ایک دن مکان کی جگہ طے کی، پھر نیو بھرنے کی رسم ادا کی۔ اس نے کھجوریں اور ناریل بانٹے، اور کھدائی کا کام شروع کیا۔ مزدور کام پر لگ گئے۔ جانبھا پتھر[10] وہاں آ کر ڈھیر ہونے لگے۔ راج مزدور نمودار ہو گئے۔ بڑھئی لکڑی کاٹتے دکھائی دینے لگے۔ اس جگہ خوب چہل پہل محسوس ہونے لگی۔

سردی اب پوری طرح ختم ہو چکی تھی۔ کھیتوں میں ارہر اور پاؤٹے کے پودے سوکھ گئے۔ واشِشٹھی ندی کے بہتے پانی پر تیز ہوا کے جھکڑوں سے لہریں اٹھنے لگیں۔ دن لمبا، اکتایا ہوا اور سست رفتار محسوس ہونے لگا۔ دوپہر گرم توے کی طرح تپنے لگی۔ شام کے وقت سورج بے جان سرخ رکابی کی طرح واشِشٹھی ندی کے پانی پر ڈولنے لگا۔

مجھے ان لمبے دنوں سے وحشت ہونے لگی۔ بمبئی واپس جانے کا خیال میرے ذہن میں گھومنے لگا۔ لیکن مجھے اپنے پوری طرح صحت یاب ہونے کا یقین نہیں تھا؛ اور بابا کی بھی خواہش تھی کہ میں ابھی کچھ دن اور ٹھہروں۔ اس کے علاوہ، مجھے ڈر تھا بمبئی میں کاموں میں پھنس کر طبیعت پھر خراب نہ ہو جائے۔ میں نے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور شام کی تکان دور کرنے کی غرض سے گھر سے نکل کر ٹہلنے لگا۔ اب میں بازار کی سمت بہت دور تک پیدل چلنے لگا۔

اسی سڑک پر اسحٰق کا مکان بن رہا تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے میں نے کئی بار کام چلتے ہوئے دیکھا لیکن پاس نہیں گیا۔ اسحٰق کو اچھا نہیں لگا کہ میں نے اس کے نئے مکان کو نظرانداز کر دیا۔ مجھ سے اپنا جان بوجھ کر شروع کیا ہوا جھگڑا بھول کر وہ ایک دن سڑک پر میرے سامنے آ گیا اور اپنے زیرِ تعمیر

۱۰۔ جانبھا پتھر کوکن کے علاقے میں پایا جانے والا سرخ پتھر جسے تعمیر میں استعمال کیا جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

مکان کو دیکھنے کی درخواست کی۔

میں مجبوراً اس کے ساتھ چلا گیا۔

اس کے مکان کی تعمیر کا کام جاری تھا۔ نیو بھری جا چکی تھی۔ مزدور وہاں مسلسل کام کر رہے تھے۔ اسحٰق نے جلدی سے مکان کا نقشہ مجھے لا کر دکھایا اور تفصیل سے بتانے لگا کہ مکان کے کمرے کتنے ہیں، دروازے اور کھڑکیاں کہاں کہاں ہیں، اور چبوترا کتنا لمبا چوڑا ہوگا۔

لیکن میرا دھیان اس کے مکان کے نقشے سے ہٹ کر اس کے مزدوروں میں شامل لکشمی کی طرف ہو گیا تھا۔

لکھیا مہار[10] کی بیٹی لکشمی بہت اچھی شکل صورت کی تھی۔ اس کی رنگت حیران کن حد تک صاف تھی اور سیاہ فام مہار عورتوں میں الگ دکھائی دیتی تھی۔ وہ چٹکی بجاتے کسی کا بھی دھیان اپنی طرف کھینچ سکتی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو چھوڑ دیا تھا اور باپ کے پاس آ کر رہنے لگی تھی۔ لیکن شوہر کچھ کچھ دن بعد اس کے گھر کے چکر لگایا کرتا تھا، وہ اس سے واپس لوٹنے کی التجا کرتا تھا۔ کبھی زبردستی اٹھا لے جانے کی دھمکیاں دیتا تھا۔ لیکن لکشمی پر اس کی کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس نے شوہر کی طرف بالکل پیٹھ پھیر لی تھی۔

وہ میرے سامنے خاموشی سے جامعہ پتھر اٹھا اٹھا کر لے جا رہی تھی اور بیچ بیچ میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ کبھی کبھی اسحٰق کی طرف مسکرا کر دیکھتی اور آگے بڑھ جاتی۔ اس کے چلے جانے کے بعد اسحٰق نے مجھ سے کہا، "اس لکشمی کو دیکھ؟ اسے کام پر رکھ لیا ہے۔"

میں کچھ نہ بولا۔ لیکن اسحٰق کو اطمینان نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھے مزید بتانے لگا، "بڑی اکڑباز لڑکی ہے۔ کسی کی پروا نہیں کرتی۔ لیکن مجھے اکڑ نہیں دکھاتی، کیا سمجھے؟"

اس نے آنکھ سے اشارہ کیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے آپ ہی آپ مسکرا کر

۱۰۔ مہار مہاراشٹر میں ہندوؤں کی ایک اچھوت ذات، جو دیہات میں بلوتے کے نظام کے تحت اناج کی شکل میں سالانہ اجرت کے بدلے اونچی ذات والوں کے لیے گھٹیا نوعیت کے کام کرنے پر متعین تھی۔ ان کو تھوڑی سی زمین بھی دی جاتی تھی جو ان سے اونچی ذات والوں کی زمین سے الگ واقع ہوتی تھی۔ مہاروں کی اکثریت نے اپنی ذات میں پیدا ہونے والے جدید رہنما ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر (۱۸۹۰ء - ۱۹۵۶ء) کے کہنے پر ۱۹۵۶ء میں (اور اس کے بعد کے عرصے میں) باجماعت بودھ دھرم اختیار کر لیا تھا۔

اس کا ہاتھ ہٹایا اور کہا: "ٹھیک ہے، اب میں چلتا ہوں۔"

"اچھا، لیکن کبھی پھر آنا۔"

"ضرور، ضرور۔"

"اور اس دن میں نے جو کہا تھا اس پر ناراض مت ہونا۔"

"ارے نہیں! وہ تو میں کب کا بھول بھی گیا۔"

"واہ وا! واہ وا! تم بھی خوب ہو!" وہ کہتے ہوئے وہ مڑا اور لکشمی کی چال پر نظر جمالی۔ میں وہاں سے چل پڑا۔ سڑک پر آیا اور دیر سے دیر سے گھر واپس آ گیا۔

مہار واڑا، دستور کے مطابق، قصبے سے بالکل لگا ہوا لیکن کنارے پر واقع تھا۔ لکشمی کے روپ کی طرح اس محلے میں بھی مجھے بہت تبدیلیاں دکھائی دیں۔ لیکن بعض تبدیلیاں بڑی عجیب طرح کی تھیں۔ وقت کی رفتار کو پیچھے چھوڑتی ہوئی، مضحکہ خیز تبدیلیاں۔ مہاروں کے لڑکے اب بال کٹوانے لگے تھے، انگریزی اسکولوں میں پڑھنے لگے تھے۔ ان سب نے بودھ دھرم اختیار کر لیا تھا۔ مسلمانوں کے تابوت کے جلوس میں اب وہ آگے آگے ناچتے ہوئے نہیں چلتے تھے۔ اب انھوں نے مسلمانوں کے چھوٹے موٹے کام کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ان کے برتاؤ سے برسوں سے پچھڑے ہوئے ہونے کے خود بخود بڑھتے ہوئے شعور کا اظہار ہوتا تھا۔ مسلمانوں کو یہ بات پسند نہ تھی۔ انھیں یہ خیال بے چین کرنے لگا کہ یہ شعور اگر اسی طرح بڑھتا رہا تو ان کے کھیتوں میں کام کون کرے گا۔ انھیں خوف تھا کہ کل مجبوراً انھیں اپنی عورتوں کو باہر نکال کر کھیتوں میں کام پر لگانا پڑے گا! لیکن لکشمی کی طرح کچھ مہار اب بھی ان کے لیے کام کرتے تھے۔ اب تک ہٹ دھرمی بودھوں میں ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ مسلمان اپنے آپ سے کہتے، "آج تو بیت گئی۔ کل کا کل دیکھیں گے!"

اسحٰق کے مکان کی تعمیر کا کام اب زوروں پر تھا۔ اس کے سامنے جا بجا پتھروں کے ڈھیر کے ڈھیر دکھائی دیتے تھے۔ ان پر راج مزدوروں کے چھینی ہتھوڑے چلنے لگے۔ بڑھئی ساگوان کی لکڑی چیرنے اور چھیلنے لگے؛ لوہے کے لمبے لمبے سریے کھڑے ہونے لگے۔ سیمنٹ و ریت کا آمیزہ تیار ہونے لگا۔ اور اسحٰق دھوپ میں کھڑا خود اس کام کی نگرانی کرتا تھا۔ وہ تپتی دھوپ میں کام کرتی، پسینے میں نہائی ہوئی لکشمی پر نظر جمائے رہتا۔

Scanned with CamScanner

ایک دن دوپہر کی تپتی دھوپ میں لکشمی کا شوہر اس کو لینے آیا۔ اس سے پہلے وہ اس کے باپ کے پاس گیا تھا۔ لکشمی کے باپ نے اپنے بس بھر اس سے عزت کا برتاؤ کیا۔ بیٹھنے کو کہا، چائے پانی کو پوچھا، لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا، ''لکشمی کہاں ہے؟ میں اسے لینے آیا ہوں۔''

''کام پر گئی ہے،'' باپ نے بتایا، ''شام کو لوٹے گی۔ تب تک ٹھہرو۔ کھانا کھالو۔ میں اس کو جانے پر راضی کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تب تک کوئی مشکل مت کھڑی کرنا۔''

لیکن لکشمی کا شوہر نہ مانا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے ابھی فیصلہ چاہیے۔ اسے میرے ساتھ چلنا ہے یا نہیں۔ اگر وہ نہ مانی تو اسے زبردستی لے جانے کی طاقت مجھ میں ہے۔''

لکشمی کا باپ جان گیا کہ داماد کا رنگ اس وقت کچھ اور ہی ہے۔ اس نے سوچا، بندہ پہلے ہی غصے میں ہے، اسے اور تپانا ٹھیک نہیں۔ اس لیے وہ اٹھا، داماد کو ساتھ لیا اور اینٹ کے زیر تعمیر مکان پر آ پہنچا۔

دوپہر کے جلتے سورج میں پسینے پسینے ہوتی لکشمی نے دور سے باپ اور شوہر کو آتے دیکھ لیا۔ سر پر رکھی ہوئی سیمنٹ کی بوری نیچے رکھ دی، ساڑی کے پلو سے چہرہ پونچھا اور مکان کے ایک اوسارے میں جا کھڑی ہوئی۔ باپ اور شوہر اس کے سامنے آ گئے اور اس سے بات کرنے لگے۔ وہ مجبور ان کی بات سنتی رہی۔

''کاشیا تمھیں لینے آیا ہے،'' باپ نے کہا۔ ''تمھارا کیا ارادہ ہے؟''

''مجھے نہیں جانا۔ مجھے اس کے ساتھ نہیں رہنا۔''

''لیکن کیوں؟'' کاشیا نے پوچھا۔ ''تمھیں مجھ سے کیا شکایت ہے؟ کیا ساس تمھیں تنگ کرتی ہے یا دیورانی ستاتی ہے؟ بات کیا ہے؟ بتاؤ۔''

''کوئی وجہ نہیں۔ کچھ نہیں۔ مجھے تمھارے ساتھ بسنا ہی نہیں ہے۔''

''کیا؟ ایسا کہتی ہو؟''

کاشیا بھڑک اٹھا۔ اس کا جی چاہا اس پر جھپٹ کر گلا گھونٹ دے۔ لیکن یہ خیال اس کے ذہن کے اندر ہی گھل گیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے منانے لگا۔ وہ اسے الٹے جواب دیتی رہی اور اس کا باپ بے بسی سے کھڑا ان کی تکرار سنتا رہا۔

لیکن اسی لیے لکشمی کے شوہر کی نظر اسحٰق پر پڑی۔ اسحٰق جان بوجھ کر وہاں سے دور کھڑا تھا۔ اس کے کان اس بات چیت پر لگے ہوئے تھے۔ وہ ان کا کہا ہوا ایک ایک لفظ جذب کر رہا تھا اور یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے وہاں موجود ہی نہ ہو۔

لکشمی کا شوہر اس کے پاس گیا۔ لکشمی کا باپ بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ لکشمی خود وہیں کھڑی رہی۔ کاشیا نے جھگڑے کی پوری تفصیل اسحٰق کو سنائی۔ اور پھر دہرایا کہ وہ لکشمی کو اپنے ساتھ لے جانے آیا ہے۔

اسحٰق کو یہ سب کچھ پہلے سے معلوم تھا۔ ''تو لے جاؤ۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

لکشمی کے شوہر کو یہ سن کر بہت سکون ملا۔ یہ دیکھ کر کہ مالک کو کوئی اعتراض نہیں، اسے اپنا کام آسان ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ لکشمی کا باپ بھی خوش ہو گیا۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی لڑکی شوہر کے ساتھ چلی جائے۔ مہارواڑے میں اس کی بدولت بے عزتی ہو رہی تھی۔

اسحٰق کی بات سے لکشمی کے شوہر کو اور حوصلہ ملا۔ اس نے سوچا مالک کو بیچ میں ڈال کر لکشمی کو وہیں لوٹنے پر مجبور کرے۔ اس نے اسحٰق سے کہا، ''لیکن وہ آسانی سے نہیں جائے گی۔ زمیندار صاحب، آپ ہی اسے سمجھائیے۔''

''میں؟ میں بھلا کیوں تمھارے گھریلو معاملے میں پڑوں؟'' اسحٰق نے پوچھا۔ ''اسے تم لوگ آپس میں ہی سلجھاؤ۔''

بات کچھ غلط بھی نہ تھی۔ اب لکشمی کے شوہر کو امید ہو چلی کہ اسے ساتھ لے جانا ممکن ہو گا۔ لیکن اس کے باوجود کھونٹا ہلا کر اس کی مضبوطی جانچنے کے ارادے سے اس نے کہا، ''اس کو ساتھ لے جانے پر آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہو گا نا؟''

''مجھے؟ مجھے کوئی اعتراض نہیں! مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا؟''

''لیکن اس کے کام کے سلسلے میں.. روپے پیسے کے حساب کے سلسلے میں ..''

''ہاں،'' اسحٰق بولا۔ ''اس پر میری کچھ رقم نکلتی ہے۔ وہ تو چکانی ہی ہو گی۔ اس کے بعد ہی اسے جانے دے سکتا ہوں۔''

''ہاں ہاں، میں وہی تو پوچھ رہا ہوں۔''

Scanned with CamScanner

''میں بھی وہی بتا رہا ہوں۔''

''کتنے پیسے نکلتے ہیں؟''

''سو... سو روپے۔''

لکشمی کا شوہر یہ رقم سن کر چونک پڑا۔ اسے اندر ہی اندر مایوسی ہونے لگی۔ سو روپے چکانے کا مطلب تھا کہ کم سے کم سال بھر اور رکنا پڑے گا۔ تب تک لکشمی کے ہاتھ لگنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ لیکن اسے کہیں سے اتنے پیسے اکٹھے کر کے مالک کو ادا کرنے کا خیال آیا۔ اس نے پوچھا، ''اگر اتنے پیسے میں ادا کر دوں تو آپ اسے جانے دیں گے؟''

''بالکل!'' اسحٰق نے جواب دیا۔ ''میری رقم واپس مل جائے تو اس کے جانے پر مجھے کیا اعتراض ہوگا!''

لکشمی کا شوہر سوچ میں پڑ گیا۔ اسے کہیں نہ کہیں سے سو روپے کا انتظام کر کے مالک کو ادا کر کے یہ رکاوٹ دور کرنی تھی۔ پھر لکشمی ہوگی اور وہ خود، اور پھر لکشمی کمزور پڑ جائے گی۔ تب اسے ساتھ لے جانا اور اس کی اوقات یاد دلانا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ وہ بولا، ''میں پندرہ دن میں آپ کے پیسے چکا دوں گا، ٹھیک ہے نا؟''

''بے شک! پیسے چکا دو اور خوشی سے اسے لے جاؤ۔''

لکشمی دور کھڑی یہ باتیں سن رہی تھی۔ اس کا باپ اور شوہر آپس میں بات کرتے ہوئے دھیرے دھیرے مہاروا ڑے کی طرف چلے گئے۔ وہ ان کی اوجھل ہوتی ہوئی پرچھائیوں کو کچھ دیر غور سے دیکھتی رہی۔ ان ساری باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر پیسے چکا بھی دیے گئے تو وہ شوہر کے ساتھ نہیں جائے گی۔

پندرہ دن اسی طرح بیت گئے۔ اس دوران اسحٰق کے مکان کی دیواریں آہستہ آہستہ خاصی اونچی ہو گئیں۔ موٹے موٹے شہتیر اور لمبے لمبے سریے لٹکنے لگے۔ دوران کے ٹیڑھے میڑھے سائے بغیر چھت کے مکان کے فرش پر پڑنے لگے۔ دھوپ میں سائے لمبے ہونے لگے اور لکشمی دیوار سے بندھے ہوئے اونچے لکڑی کے تختے پر کھڑی ہو کر نیچے سے اچھالے ہوئے پتھر تھامنے کا کام کرتی دکھائی دینے لگی۔

شام کی زرد روشنی کے ویران سڑک سے دیکھنے پر مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ دیوار کے بجائے اسحٰق سے ٹیک لگائے کھڑی ہے۔

پندرہ دن... بیس دن... پچیس دن... لکشمی کا شوہر نہیں آیا۔ اسحٰق نے سکون کا سانس لیا اس نے سوچا بھلا سو روپے کہاں سے ہاتھ آنے لگے لیکن اگر وہ کہیں سے لے آیا تو پھر کیا ہوگا؟ میرا تو اس پر ایک پیسہ بھی نہیں نکلتا۔ پھر ان سو روپوں کی اس کے لیے ساڑیاں خرید کر حساب پورا کر دیا جائے؟ کیا یہ ہو سکے گا۔ ایسی فی الحال تو لکشمی کے شوہر کے نہ آنے سے اس کی فکر مٹ گئی تھی۔

لیکن مہینے بھر میں لکشمی کا شوہر سو روپے لے کر آ موجود ہوا۔ اسحٰق نے اوپری مسکراہٹ کے ساتھ پیسے وصول کیے اور لکشمی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اب کیا کیا جائے؟ اگر اس کا شوہر اسے زبردستی ساتھ لے گیا تو کیا ہوگا؟ لیکن پھر اسے یاد آیا کہ لکشمی نے ایک بار اس سے کہا تھا کہ وہ جان دے دے گی مگر شوہر کے ساتھ نہیں جائے گی۔ اس نے اس کے شوہر سے کہا: "ٹھیک ہے۔ شام تک میں اسے آزاد کر دیتا ہوں۔"

لکشمی کا شوہر وہاں سے فوراً اس کے باپ کے پاس چلا گیا اور شام ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر باپ کے گھر گیا۔ پھر شام کے دھندلکے کے وقت لکشمی نمودار ہوئی۔ اندر آتے ہی اس نے ان دونوں کو دیکھا تو اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی۔ اندھیرا اور گہرا ہونے لگا۔ کوئی کسی کو دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ نہ کسی کو کچھ بولنے کا دھیان آیا۔ شوہر نے ایک بار اس سے پوچھا، پر لکشمی نے اسے حتمی جواب دے دیا: "نہیں جاؤں گی۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ مجھے تمھارے ساتھ نہیں بسنا ہے۔" اس اندھیرے میں شوہر کے چہرے پر ہونے والا عمل اسے نظر نہ آیا۔ لیکن اگر نظر بھی جاتا تو اسے اس کی کوئی پروا نہ تھی۔

لکشمی کا باپ ننگ دھڑنگ بیٹھا تھا۔ شوہر اسے گالیاں دینے لگا۔ اس نے باپ پر اس کو بھڑکانے کا الزام لگایا۔ کہنے لگا: "تم کیوں اس کا ساتھ دے رہے ہو؟ اسے اپنے گھر میں کیوں رکھ رکھا ہے؟ نکال کیوں نہیں دیتے؟ کیوں میرے گھر کو برباد کر رہے ہو؟"

لکشمی کا باپ اس الزام پر پھٹ پڑا: "اگر تم ایسا ہی سمجھتے ہو تو لے جاؤ اسے اپنے ساتھ۔ گھسیٹ لے جاؤ۔ زبردستی لے جاؤ۔"

"تم بیچ میں تو نہیں آؤ گے؟"

Scanned with CamScanner

''نہیں۔''

''دیکھو، ایک بار پھر سوچ لو!''

''نہیں، نہیں۔''

لکشمی کے شوہر کو یہی چاہیے تھا۔ وہ اٹھا اور اس کی کمر میں لات ماری۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر رکھے مٹی کے برتنوں سے جا ٹکرائی۔ اور جب اٹھنے لگی تو دوسری لات اس کی کمر میں لگی۔ وہ برتنوں پر گر پڑی اور سارے برتن چکنا چور ہو گئے۔ شوہر نے اس کا بازو پکڑ کر اسے دھیرے سے اٹھایا اور جھونپڑی سے باہر دھکیل دیا۔ باہر پہنچ کر وہ اسے زور سے کھینچنے لگا۔ لکشمی اس کے پیچھے پیچھے زمین پر گھسٹنے لگی۔

اگلے روز جب میں سیر کو نکلا تو اسحٰق نے مجھے اپنے مکان کے پاس بلا کر یہ سب قصہ سنایا۔ اسے لکشمی کے شوہر کی دلیری پر تعجب ہو رہا تھا۔ اور مایوسی ہو رہی تھی کہ لکشمی سے اس کو جو توقع تھی وہ پوری نہ ہوئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شوہر کی مار پیٹ کے سامنے وہ اتنی بے دم کیسے ہو گئی۔ وہ پاگل سا ہو گیا تھا۔ مکان کی تعمیر کے کام سے اس کا دھیان بالکل ہٹ چکا تھا۔

لیکن پھر دھوپ میں اور زیادہ حدت آتی گئی اور شام کے وقت بھی تپش قائم رہنے لگی۔ ہوا بالکل بے قابو ہو گئی۔ گرم جھکڑ چلنے لگے اور دھول کے بادل کے بادل اڑنے لگے۔ کبھی کبھی سڑک پر چلتے ہوئے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ گھر پر پڑے پڑے چھت کی کڑیوں پر نظر جمانے سے سخت ناقابل برداشت تپش محسوس ہونے لگی۔ میں آنگن میں بیٹھ پورب کی طرف سرکتے ہوئے دھول کے بادلوں کو دیکھتا رہتا۔

بھائی کی زمین پر بوائی کی تیاری شروع ہو گئی اور وہ کام میں بہت مصروف ہو گیا۔ وہ گھر پر کم ہی بیٹھتا، لیکن تب بھی زیادہ بولتا چالتا نہیں تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ جب سے میں ستی سے اس کے گھر پر مل کر آیا ہوں، تب سے وہ مجھ سے کم سے کم بات کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیا اس وجہ سے کہ ستی اس سے کترانے لگی تھی؟ کیا اس لیے کہ وہ اس شیطانی چکر سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی جس میں وہ پھنسی ہوئی تھی؟

لیکن ستی تو مجھ سے مل ہی نہیں رہی تھی۔ اُس رات کے بعد وہ مجھ سے نہیں ملی تھی۔ ان تمام

دنوں اپنی شام کی سیر کے وقت بھی میرا اس سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ کیا اس نے گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا؟ بازار بھی نہیں جاتی؟ یا وہ مجھ سے کترا رہی تھی؟ یا بھابی نے اسے دھمکایا تھا؟

بھابی نے بھی سمتی کے بارے میں بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اُس دن کے طنزیہ فقروں کے بعد سے اس نے سمتی کا موضوع چھیڑا ہی نہیں تھا۔ اور میرا بھی اس کے بارے میں بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

سمتی کے موضوع کو چھوڑ کر بھابی مجھ سے پہلے ہی کی طرح برتاؤ کرتی تھی۔ کئی بار وہ اپنا کام ختم کر میرے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کیا کرتی۔

لیکن بابا کے برتاؤ میں اور زیادہ کھلا پن آ گیا تھا۔ وہ اور زیادہ دل کھول کر باتیں کرتے۔ اسحٰق والے واقعے کے بعد ان کے برتاؤ میں کچھ دن کے لیے جو کھوٹ پن آ گیا تھا وہ اب پگھل چکا تھا۔ کیا ان کے کھلے پن کا سبب یہ تھا کہ وہ جانتے تھے کہ میں جلد ہی بمبئی جانے والا ہوں، یا وہ میرے ساتھ اپنے آخری دن اچھی طرح گزارنا چاہتے تھے، یہ میں اندازہ نہیں کر پا رہا تھا۔

اور ایک دن لکشمی اپنے شوہر کو چھوڑ کر لوٹ آئی۔ وہ کب واپس لوٹی یہ مجھے معلوم نہ ہوا، لیکن ایک شام جب میں اسحٰق کے مکان کے سامنے سے گزرا تو وہ مجھے وہاں کام کرتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ پہلے جیسے بے پروا انداز میں دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ وہ دیواریں اب اور اونچی ہو گئی تھیں، اور وہ بھی اب اتنی ہی اونچائی پر کھڑی اچھالے ہوئے پتھر سنبھال رہی تھی۔

اسے دیکھ کر میرے قدم سست پڑ گئے اور اوپر سے اسحٰق کی آواز میرے کان میں آئی۔ ''ارے، بہت دن بعد آئے! اوپر آ جاؤ نا!''

میں بے اختیار اس کے پاس چلا گیا اور بولا: ''تمھارا مکان دیکھنے آیا ہوں۔ مگر لکشمی کب واپس آئی؟''

''آ گئی!'' اسحٰق نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ ''واہ وا! کیا کہنا تم تو چھپے رستم نکلے۔ لوگ کہتے ہیں کہ تمھارا کسی چیز سے کچھ لینا دینا نہیں۔ اور تم لکشمی کی پوچھ تاچھ کرنے لگے ہو۔ ہاں، دلچسپی ہے؟''

''نہیں رے بابا! میں تو یونہی پوچھ رہا تھا۔''

Scanned with CamScanner

''تو پھر سنو! کیا تم جانتے ہو، لکشمی کے شوہر نے اسے داغ دیا ہے؟''

''کہاں؟''

''کہاں؟ ہا ہا! ارے کہاں کیا پوچھتے ہو، تمھیں کیسے دکھائی دے گا!''

مجھے اپنا سوال احمقانہ محسوس ہونے لگا۔ میں نے یونہی پوچھنے کی خاطر پوچھا: ''لیکن وہ آ کیسے گئی؟''

''بھاگ آئی۔''

''اور تم نے اسے پھر کام پر رکھ لیا؟''

''کیوں، تو کیا غلط کیا؟ میں نے تو اسے رہنے کی جگہ بھی دے دی ہے۔''

''رہنے کی جگہ؟''

''ہاں ہاں۔ وہ اب اپنے باپ کے گھر نہیں رہتی۔ اس کے باپ کا کہنا ہے کہ وہ اپنے داماد کا الزام نہیں لینا چاہتا۔''

''اور تم پر جو الزام آئے گا وہ؟''

''مجھ پر؟ ہا ہا! مجھ پر الزام لگانے والا ابھی پیدا نہیں ہوا۔''

میں گردن اٹھا کر دیکھنے لگا۔ لکشمی اب اور زیادہ اونچائی پر کھڑی تھی۔ اس کی ساڑی کے کاسوٹا[12] مارے ہوئے پلو سے اس کی گوری پنڈلیاں جھانک رہی تھیں۔

''ارے نہیں صاحب! وہاں نہیں۔ داغ تو کہیں اندر ہے۔ بہت اندر...''

لیکن میں داغ کو نہیں دیکھ رہا تھا!

اسحٰق کے اس قدم نے گاؤں میں طوفان کھڑا کر دیا۔ مہارواڑے میں پہلے بے چینی کے آثار ظاہر ہوئے۔ بودھوں نے ایک سبھا بلائی اور مکھیا پر زور دیا کہ وہ لکشمی کو اس کے شوہر کے پاس واپس بھیجے۔ دھمکی دی گئی کہ ایسا نہ ہوا تو اسے جات باہر کر دیا جائے گا۔ مکھیا ایک دو بار اسحٰق سے ملا۔

---

۱۲ کاسوٹا مہاراشٹر کی نوگزی ساڑی کا پلو جسے ٹانگوں کے درمیان سے پیچھے لے جا کر کمر میں کھونس لیا جاتا ہے تاکہ کام کاج کرنے میں سہولت ہو۔

Scanned with CamScanner

لیکن اس نے [illegible] پہلے کی طرح ٹکا سا جواب دے کر ٹال دیا۔ آخر کار کلواڑی بھی اس معاملے میں شریک ہو گئے اور دونوں کا ساتھ دینے لگے۔ قصبے کا ماحول تناؤ بھرا ہو گیا۔

[illegible] نے [illegible] اور [illegible] سے کہا، "اس لکشمی کو کام سے نکال دو۔ بلا وجہ کی چخ چخ مت کرو۔ تم [illegible] اپنے کان میں تو مت رکھو۔"

[illegible] نے میری بات نہ ماننے کی ٹھان رکھی تھی۔ ضد پر اڑے ہوئے [illegible] ہمارے پاس پیسہ ہے۔ [illegible] ایک [illegible] کٹانے پر بہت آدمی دوڑے آئیں گے۔ اور پھر ہم لوگ زمیندار ہیں۔ [illegible] زمینداری قانونی طور پر ختم ہو گئی تو کیا ہوا، لوگ تو ہمیں اب بھی زمیندار ہی کہہ کر پکارتے ہیں [illegible] میں سمجھ گیا کہ ان سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

سارے قصبے میں اسحٰق اور لکشمی کے [illegible] کے بارے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ لوگوں نے بات [illegible] ایک موضوع [illegible] مسلمانوں کو اسحٰق کی حرکت ناگوار گزری تھی۔ وہ [illegible] کر ہڈی پھینک دینی چاہیے [illegible] گلے میں [illegible] کرنا [illegible] پھرنا کیا ضروری [illegible] کوئی مسلمان عورت ڈھونڈ کر اس سے شادی کرو۔ اس مہارن کو گھر میں ڈالنے کی کیا ضرورت؟ [illegible] طور پر انھوں نے [illegible] انھوں نے [illegible] اس معاملے کو کوئی خاص اہمیت نہیں [illegible] کوئی خاص بات نہیں۔ ایسا [illegible] بھی ہوتا رہتا ہے [illegible] اسحٰق کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ اور [illegible] فرق یہ ہے کہ اسحٰق نے یہ ہڈی گلے میں پہن رکھی ہے۔

[illegible] اچھی نہیں ہوئی۔ انھیں لگا کہ ان کی ناک کٹ گئی ہے۔ انھیں [illegible] عادت تھی [illegible] زمینداروں سے تعلقات رکھتی تھیں، لیکن کوئی مہارن [illegible] زمیندار کے گھر میں نہیں پڑی تھی۔ اور پھر کلواڑی مہاروں کی کھلے عام [illegible] کرتے تھے۔ [illegible] مہاروں [illegible] لکشمی زمیندار کے گھر جا بیٹھی ہے۔

[illegible] کی [illegible] کا سبب ڈھونڈنے کی سوجھی۔ کلواڑی کہنے لگے، "یہ اتنی [illegible] الگ دکھائی دیتی ہے؟ کیا تمھیں پتا نہیں [illegible] زمیندار کے گھر پڑی ہوئی تھی۔ یہ اسی کی بیٹی ہے" تو

پھ کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے!"

یہ باتیں رفتہ رفتہ پھیلنے لگیں۔ ہر جگہ یہی ذکر ہونے لگا۔ اور خبر لکھیا کے کانوں تک بھی پہنچا۔ ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر وہ ایک دن بابا کے پاس آئے۔ بابا نے ان کی بات خاموشی سے سنی اور پھر پوچھا: "اس میں میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ اسحٰق زمیندار سے کہہ کر بنشی کو اس کے گھر سے باہر نکلوایئے۔"

بابا کچھ دیر خاموش رہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ وہ کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا: "کیوں رے، کیا کریں؟"

"ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"کیوں؟ تمھارے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے؟"

ان کے سوال پر مجھے ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ میں سب مسئلوں کے حل لے کر کاہن تھوڑا ہی آیا تھا۔ لیکن میں نے غصے پر قابو پا کر جواب دیا: "میں نے ایک بار اسحٰق سے بات کی تھی۔ لیکن وہ مانا ہی نہیں۔"

مجھ سے بات ختم کر کے وہ لکھیا سے بولے: "ایسا پہلے نہیں ہوتا تھا کیا؟ آج تمھیں اس پر اتنا برا کیوں لگ رہا ہے؟"

"لیکن زمیندار صاحب، اس طرح کوئی عورت کسی کے گھر تو نہیں رہ پڑی تھی۔" لکھیا نے بڑے ادب سے کہا: "اس میں آپ لوگوں کی عزت بھی جاتی ہے اور ہماری بھی۔"

"یہ سچ ہے،" بابا نے کہا۔ "لیکن مجھ سے پوچھو تو میں کہوں گا کہ اس پر دھیان ہی مت دو۔ یہ اسحٰق تو بے وقوف ہے۔ آج اسے اپنے گھر میں ڈال لیا ہے، کل اپنے آپ چھوڑ دے گا۔ یوں بھی آدمی ایک عورت سے کبھی نہ کبھی اکتا ہی جاتا ہے۔"

انھوں نے بابا کی بات چپ چاپ سن لی۔ پھر ان میں سے ایک نے پوچھا: "تو پھر ہم کیا کریں؟"

"کچھ مت کرو۔ اپنے آپ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

تب ان میں سے ایک نوجوان اٹھ کر کھڑا ہوا اور بولا: "ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ ہماری

Scanned with CamScanner

عزت کا سوال ہے۔ آپ اس سلسلے میں کچھ تو کیجیے۔"

"لیکن میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"اسحٰق کو کچھ عقل دیجیے۔ میں پوچھتا ہوں زمیندار صاحب، اگر آپ لوگوں کی لڑکی اس طرح ہم بوڑھوں کے پاس آ جاتی تو آپ کیا کرتے؟"

بابا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ان کے بدن میں ایسی تھرتھری پیدا ہوئی جیسی طوفانی ہوا میں کوئی بڑا درخت لرزتا ہے۔ پھر بولے: "مسلمانوں کی لڑکی کسی بوڑھے کے پاس جاتی ہی نہیں۔"

"اب یہ بھول جائیے زمیندار صاحب!" اس نے گرج کر کہا۔ "چوری چھپے چلنے والے کتنے قصے آپ کو بتاؤں؟ اب ہم بھی یہی کریں گے۔ آپ لوگوں کی لڑکیاں اپنے گھروں میں لا کر رکھیں گے۔"

بابا نے بے بسی سے گردن ہلائی۔ اس نوجوان نے ان کے دل پر گھاؤ لگایا تھا۔ کیا ان کو یہ قصے معلوم نہیں تھے؟ لیکن انھوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی ان باتوں کا کھلم کھلا ذکر بھی ہوگا۔ انھوں نے پھر کہا

"ارے بھائی، جو کرے گا سو بھرے گا۔ لیکن اگر میری لڑکی جاتی تو میں اسے گھسیٹ کر واپس لاتا۔ میں کسی کی کوئی پروا نہ کرتا۔"

"تو پھر اگر ہم اسے گھسیٹ لائیں تو؟ ہمیں اس پر مجبور نہ کیجیے، صاحب۔ آپ ہی سمجھداری سے معاملہ طے کرائیے۔"

بابا نے ان لوگوں کو وہیں بٹھا کر اسحٰق کو بلوایا اور اسے مختصراً ساری بات بتائی۔ سب کچھ سننے کے بعد اسحٰق نے پوچھا: "تو آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"کشمی کو واپس بھیج دو۔ کیوں جھک جھک کر رہے ہو؟"

"لیکن وہ جانے پر راضی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اسے ہم دیکھ لیں گے۔ آپ اسے اپنے گھر میں مت رکھیے۔" لکھیا نے اس سے التجا کی۔

"کیوں بھئی؟ کیا میں نے اسے زبردستی اپنے گھر میں رکھا ہے؟ میں اسے باہر کیوں نکالوں؟"

''نہیں نکالیں گے تو ہم اسے زبردستی لے جائیں گے'' بودھوں نے ایک آواز میں کہا۔ پھر وہ مزید کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلے گئے۔ اسحٰق کو بابا کی یہ سمجھوتا کرانے کی کوشش اچھی نہیں لگی۔ وہ بھی غصے میں اور کچھ کہے بغیر اٹھ گیا۔

اگلے دن سے لکشمی نے اسحٰق کے زیرِ تعمیر مکان پر کام کرنے آنا بند کر دیا۔ بودھوں کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ لکشمی کا ٹھور ٹھکانا انھیں معلوم نہ تھا۔ انھیں لگتا تھا کہ اسحٰق نے اسے اپنے ہی گھر میں رکھا ہوگا۔ لیکن جب اسحٰق سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ کندھے اچکاتے ہوئے بولا، ''مجھے کیا پتا کہ وہ کہاں گئی؟'' لیکن کلواڑیوں نے چکراتے ہوئے بودھوں کو اور چڑایا۔ ان دونوں برادریوں کی سبھ بیٹھی اور اسحٰق کے کام پر سب مزدوروں نے آنا بند کر دیا۔

دو تین دن اسحٰق کے زیرِ تعمیر مکان پر سناٹا چھایا رہا۔ اسحٰق وہاں سر پکڑے بیٹھا رہتا۔ مزدور نہیں تھے، اس لیے راج معمار صرف حاضری لگا کر چلے جاتے۔ بڑھئی بھتیوں میں چونا ملتے فارغ بیٹھے دکھائی دیتے۔ مگر چوتھے دن اسحٰق نے گاؤں کے باہر سے مزدور بلوا لیے۔ ان کو بڑھا کر روزنداری[۱۳] دی۔ مکان کی تعمیر کا کام ایک بار زور شور سے شروع ہو گیا۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے بڑھئی پھر رندا چلاتے نظر آنے لگے۔ راج معمار جلدی جلدی پلستر کرنے لگے۔ اسحٰق کے مکاں کی جگہ پر پھر سے چہل پہل ہو گئی۔ اسحٰق کہنے لگا، ''گاؤں کے مزدوروں سے باہر کے مزدور زیادہ اچھے ہیں۔ شرافت سے کام کرتے ہیں، اور نہ کریں تو ان سے پیٹھ پر لات دھر کر کام کرایا جا سکتا ہے۔''

اور زیادہ مزدور لگا کر اس نے مکان کا کام جلدی پورا کرا لیا۔ دیواریں پوری کھڑی ہو گئیں۔ ان پر چھت پڑ گئی۔ چھت پر کھپریلیں لگ گئیں۔ بس پلستر اور فرش بندی کا کام باقی رہ گیا۔ اس نے سوچا، برسات کا پانی تو نکل گیا، گھر بھرنی[۱۴] کرنے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں۔ باقی کام بھی دھیرے دھیرے ہوتا رہے گا۔ مہورت دیکھ کر اس نے گھر بھرنی کی تیاری شروع کر دی۔

۱۳۔ روزنداری: یومیہ اجرت۔

۱۴۔ گھر بھرنی: نے مکان کی تعمیر مکمل ہونے پر منائی جانے والی تقریب۔

اس دن اس نے قصبے کی کل مسلمان برادری کو دعوت دی۔ رات کے وقت سب لوگ جمع ہو گئے۔ میں بھی گیا۔ گیارھویں کی نیاز ہوئی۔ اس دوران میں آنگن میں بیٹھا رہا۔ اسحٰق اس رات بے حد خوش تھا۔ میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر وہ میری بغل میں آ بیٹھا اور مجھ سے بولا: "تم گیارھویں پڑھنے نہیں گئے؟ ٹھیک ہی ہے۔ تم تو نماز روزے تک سے فارغ ہو۔"

"ہاں مگر میرے گیارھویں کی نیاز کھانے پر تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا نا؟ کیا نیاز بنوائی ہے؟"

"میٹھا کھانا، میٹھا کھانا بنوایا ہے۔ جتنا چاہو کھاؤ۔ ڈبل مانگ کے لینا۔ برتن بھر کے گھر کے لیے بھی لے کر جانا۔ بالکل مت جھجکنا۔ میں آج خوش ہوں۔ مگر ایک بات بتاؤ... تم گیارھویں کیوں نہیں پڑھتے؟ دین کو، اسلام کو تم کیوں نہیں مانتے؟"

"تم جیسے لوگوں سے ملنے کے بعد میرا کسی چیز پر ایمان نہیں رہا۔"

"کیا مطلب؟"

"اس کا مطلب تم جانتے ہو۔ اس بیوہ عورت کو اپنے گھر میں کیوں چھپا رکھا ہے؟ تمھارے دین کو میں کیسے مانوں؟"

"ارے واہ! لیکن اگر اس سے سمبندھ نہ رکھوں تو پھر کیا کروں؟ قصبے کی کوئی مسلمان عورت مجھ سے [illegible] نہیں آتی۔"

میں حیران رہ گیا۔

"ارے گاؤں کی لڑکیاں اب بڑی ہوشیار ہو گئی ہیں۔ وہ کیپ ٹاؤن والا کہہ کر میرا مذاق اڑاتی ہیں۔ کہتی ہیں، مجھے عقل نہیں ہے۔ میں پرانے فیشن کا آدمی ہوں۔ پرانے فیشن کے کپڑے پہنتا ہوں، پرانے خیالوں پر چلتا ہوں۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ اور عورت کے بغیر مجھے چین نہیں پڑتا، اس کا کیا کیا جائے!"

"اچھا یہ بات ہے؟ اس لیے تم کو لکشمی کو رکھ لیا ہے!"

"یک وہی ہے جو مجھے جچی ہے۔ اس میں میرا کیا قصور؟ تم گاؤں والے بھی کمال کرتے ہو۔ لکشمی جو پاس آنا چاہتی ہے اسے زبردستی دور کرنے کو کہتے ہو، لیکن جو میرے پاس نہیں آتیں، انھیں زبردستی میرے پاس نہیں لاتے!"

یہ کہہ کر اسحٰق ہاہا کر کے ہنسا۔ پھر میری پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا، ''گیارھویں کے بعد لوگوں کے جاتے ہی لکشمی یہاں آ جائے گی، وہ مستقل یہیں رہے گی۔ اگر تم کچھ دن گاؤں میں رہے تو خود دیکھ لو گے۔ اور تمھیں جلدی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمھارے بابا کے لیے میٹھ کھانا دوں گا، وہ لے کر جانا۔''

میں کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا۔ گیارھویں ختم ہوئی۔ میٹھ کھانا بانٹا گیا۔ میں نے کھایا اور گھر لے جانے کے لیے اسحٰق کے برتن کی راہ دیکھنے لگا۔ لوگ اپنے اپنے گھر لوٹنے لگے۔ وہ چار آدمی رہ گئے۔ اور تب میں نے لکشمی کو اندھیرے سے ڈرتے ڈرتے نکل کر نئے مکان میں داخل ہوتے دیکھا۔ چند منٹ بعد اسحٰق اندر سے برتن لیے نکلا۔ میں اسے لے کر روانہ ہوا اور سڑک کی طرف مڑ گیا۔

اچانک سامنے سے پندرہ بیس آدمی تیزی سے میری طرف آئے۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا اور میں ایک طرف ہو گیا۔ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ میں نے انھیں سیدھے اسحٰق کے گھر میں گھستے دیکھا۔ ان کے پیچھے میں بھی واپس اس طرف جانے لگا۔ لیکن وہ پل بھر میں باہر نکل آئے اور لکشمی کو کھینچتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ واپس جاتے ہوئے وہ آنگن میں میرے پاس سے گزرے۔ ان میں مجھے قصبے کے کچھ بوڑھوں اور کلواڑیوں کے چہروں کی جھلک دکھائی دی۔ اسحٰق اندر سے چلاتا ہوا باہر نکلا اور جہاں میں کھڑا تھا وہاں آ کر ٹھٹک کر رک گیا۔ اندھیرے میں آگے بڑھنے کا اسے حوصلہ نہیں ہوا۔

۵

یہ سب کچھ اتنی غیر متوقع طور پر اور اتنی تیزی سے پیش آیا کہ مجھے کئی منٹ تک اپنی جگہ سے ہلنے کا بھی خیال نہ آیا۔ اسحٰق میرے بازو کو گرفت میں زور زور سے ہلاتے ہوئے قابل رحم غصے سے کہہ رہا تھا، ''دیکھا تم نے؟ وہ لکشمی کو اٹھا کے لے گئے ہیں۔ میں اس کا بدلہ لیے بغیر نہیں رہوں گا۔۔''

میں نے اسے سمجھانے کی بے سود کوشش کی۔ ''دیکھو۔ اب وہ چلی گئی نا؟ جانے دو۔ سمجھ لو جھک جھک ختم ہوئی، اب اس کا خیال چھوڑ دو۔''

''اس کا خیال چھوڑ دوں؟ ارے وہ!'' اسحٰق نے مجھ پر بھڑک کر کہا۔ ''کیا میں نے اسے زبردستی گھر میں رکھا تھا؟ زبردستی اُن لوگوں نے کی ہے یا میں نے؟ وہ اسے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں انھیں مزہ چکھائے بغیر نہیں رہوں گا۔''

''لیکن کرو گے کیا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''اسے واپس لاؤں گا۔''

''کیسے؟ ارے، تمھیں کیسے پتا چلے گا ان لوگوں نے اسے کہاں رکھا ہے؟ اور اگر پتا چل بھی گیا تو اسے لانے کے لیے تمھیں بھی ان کی طرح کسی کے گھر میں گھسنا پڑے گا۔ مطلب، اور جھگڑا ہوگا۔ اور یہ سب کرنے کے لیے تم یہاں رہو گے کہاں؟ تم نے نیا مکان بنوایا ہے۔ اس میں اکیلے رہتے ہو۔ تمھارے افریقہ جانے کے بعد گھر کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ لکشمی؟ اس کے بجائے تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ گھر میں گھر والی کو لاؤ۔ گھر اس کے حوالے کرو اور بے فکر ہو کر چلے جاؤ۔''

''ہرگز نہیں! میں کل جماعت کی بیٹھک بلاؤں گا۔ ان سے انصاف مانگوں گا۔ سارے گھر میں گھس کے لکشمی کو اٹھا لے گئے! آج اسے لے گئے ہیں، کل ہماری بیویوں کو اٹھا لے جائیں گے۔''

اس سے بحث کرنا لاحاصل تھا۔ کچھ دیر بعد میں اس کے گھر کی سیڑھیاں اترا اور چل دیا۔

دوسرے دن مسلمانوں کی جماعت کی بیٹھک ہوئی۔ مجھے دو تین بار بلاوا آیا، مگر میں نہیں گیا۔ جماعت کی بیٹھک ہمارے گھر کے پاس کی ایک عمارت میں ہو رہی تھی اور وہاں ہونے والا شور شرابہ مجھے گھر بیٹھے سنائی دے رہا تھا۔ لیکن اس شور میں مجھے کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے بھابی سے پوچھا، ''کیا طے ہو رہا ہے؟''

اس نے کہا، ''میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ آپ کیوں نہیں گئے؟''

''میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کوئی الٹی سیدھی بات طے نہ ہو جائے۔''

''شور تو اتنا ہے کہ لگتا ہے کوئی بات طے نہیں ہو پا رہی ہے۔''

ٹھیک اسی وقت شور تھم گیا۔ اس بیٹھک میں ماضی کی ساری باتیں دہرائی گئیں۔ بودھوں اور کلواڑیوں سے معافی مانگنے کا مطالبہ کرنے کا متفقہ فیصلہ کیا گیا۔

مجھے ہونے والے واقعات کی رفتار محسوس ہونے لگی۔ مجھے لگا انھیں ہونے سے روکنا کسی کے بس میں نہیں ہوگا۔ مجھے خیال آیا کہ اب مجھے بمبئی چلے جانا چاہیے۔ یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ لیکن اس طرح چلے جانا مجھے بزدلی محسوس ہوا۔

لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں رہ کر بھی میں کیا کر لوں گا۔ میرا ہونا نہ ہونا برابر تھا! مجھ سے کوئی کچھ نہیں پوچھ رہا تھا۔ میری صلاح کوئی نہیں ماننے والا تھا' ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ میری رائے اب پھینکنے کے لائق ہو گئی تھی یا لوگوں کے لیے ناقابل قبول ہو چکی تھی؟

پچھلے پندرہ برسوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ وقت کے طوفان میں بہت سی اچھی بری چیزیں ختم ہو گئی تھیں۔ اور اس سے بہت سی نئی اچھی بری چیزیں وجود میں آ گئی تھیں، اور میں دونوں سے ڈر رہا تھا۔ میں خود کو اسٹیفنس کوُ کا حامی پا رہا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ میں خود کیا چاہتا ہوں۔ ان تبدیلیوں نے مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں ایک طرح کا ڈبل رول ادا کر رہا ہوں۔ خیالات کے لحاظ

سے بہت آگے نکل گیا تھا اور طرزِ عمل کے لحاظ سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ قصبے میں میرا رہنا بالکل بے معنی تھا۔ اور میرے بمبئی چلے جانے کی بھی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

اس کے باوجود مجھے بمبئی چلے جانا ٹھیک محسوس نہیں ہوا۔ یہاں رہ کر بھی میں کچھ کر نہیں سکتا تھا، لیکن بھاگ جانے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ میں بزدل نہیں کہلانا چاہتا تھا۔ ستّی کے یہ لفظ مجھے بار بار یاد آتے تھے ''گورے اسی طرح بھاگ گیا تھا۔'' یہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنا گھر بنانے یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ اسے گھر بنانے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ستّی سے شادی کر کے وہ اسی کے گھر میں رہ سکتا تھا۔ لیکن وہ اس کے بجائے بمبئی میں ٹین کی چھت والی چھوٹی سی کھولی میں رہ رہا تھا۔ اس نے کسی ڈاکٹر کے پاس کمپاؤنڈری کرنے کو ترجیح دی تھی۔ میری حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ میں بھی گھر میں بیٹھا اپنی بے عملی کا ماتم کر رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ پورا گاؤں میری بانجھ حالت کا مذاق اڑا رہا ہے۔

اور تب ایک دن ہمارا دادا بابا سے ملنے آیا۔ وہ بابا کے پاس بیٹھا دیر تک دھیمی آواز میں باتیں کرتا رہا اور دوسرے دن گاؤں میں سمجھوتے کی بات چیت شروع ہو گئی۔

مگر بات شروع ہونے سے پہلے ہی دن پیچ پڑ گیا۔ جیسا طے ہوا تھا اس کے برخلاف بوہرے بات چیت کے لیے آئے ہی نہیں۔ پھر مسلمانوں نے انھیں بلوا بھیجا۔ بوہرے آئے تو کلوازیوں کے نہ ہونے کے باعث بات چیت شروع نہ ہو سکی۔ ان کو کئی بار بلوایا گیا تب چوتھے پانچویں دن وہ حاضر ہوئے۔ لیکن اس وقت تک ان کے نہ آنے سے مسلمان چڑ گئے تھے۔ چنانچہ جب کلوازی آئے تو مسلمانوں نے میٹنگ کا بائیکاٹ کر دیا۔ آخر کار جب تینوں فریقوں کے ساتھ بیٹھنے کا موقع آیا تب سنجیدگی سے بات چیت شروع ہوئی۔

بات چیت کئی دن چلتی رہی، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ دو بار بات چیت ختم ہوتے ہوتے بچی۔ پھر کسی نے کوشش کر کے اسے دوبارہ شروع کرایا۔ مسلمانوں نے ستّی کے مکان میں زبردستی گھسنے پر کلوازیوں کے خلاف مقدمہ کرنے کی دھمکی دی، اور کلوازیوں نے جواب دیا کہ انھیں اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ ایک طرف بات چیت چل رہی تھی اور دوسری طرف قصبے کا ماحول اور زیادہ تناؤ بھرا ہوتا جا رہا تھا۔

اور ایک دن اچانک مسلمانوں نے اپنے پاس کام کرنے والوں میں سے کچھ کو نکال دیا۔ ان کی

Scanned with CamScanner

جگہ وہ قصبے کے باہر سے دوسرے آدمی لے آئے۔ تب میں خاموش نہ رہ سکا۔ میں نے بابا سے کہا، ''ان سے کہیے کہ ان لوگوں کو کام پر واپس رکھ لیں۔''

انھوں نے میری طرف تیز نگاہ سے دیکھ کر پوچھا، ''کیا تم ان سے کہو گے؟''

''ہاں، کہوں گا۔ لیکن آپ بھی کہیے۔''

''میں ایک بار کہہ چکا ہوں۔ وہ سننے کو تیار نہیں ہوئے۔ تم بھی کہہ کے دیکھ لو۔ لیکن وہ ماننے والے نہیں۔''

''کس سے کہوں؟''

''اسحٰق سے۔ وہی لیڈر ہے۔''

اس دن میں کئی دن بعد گھر سے باہر نکلا اور اسحٰق کے گھر گیا۔ وہ اپنے نئے مکان کے آنگن میں بیٹھا تھا اور باہر گاؤں سے بلوائے ہوئے مزدور سے جلانے کی لکڑیاں کٹوا رہا تھا۔ اس نے میری طرف دھیان نہیں دیا۔ میں نے ہی اس کو آواز دی، ''اسحٰق، ذرا ادھر تو آؤ۔ تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''کیا ہے؟'' اس نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے زور سے پوچھا۔ اس کے تپے ہوئے لہجے سے میں سمجھ گیا کہ وہ میرے آنے کا مقصد بھانپ گیا ہے۔ میں آگے بڑھا اور اس کے پاس کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''کیا کام ہے؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''تم نے گاؤں کے مزدوروں کو کام سے کیوں نکال دیا؟'' میں نے پوچھا۔

''اچھا، کیوں نکالا!'' اس نے زہرناک لہجے میں کہا اور ایک طرف جا کر تھوکا۔ ''تمھیں نہیں معلوم؟ ان کی اور ہماری دشمنی چل رہی ہے۔ کیا ایسے دشمنوں کو پالیں گے ہم؟''

''ارے، لیکن سمجھوتے کی بات چیت چل رہی ہے نا؟ پھر بلاوجہ جلتی پر تیل ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''وہ لوگ تو جھک مار رہے ہیں۔ ہمیں اس کی پروا نہیں ہے۔ انھوں نے میرے گھر میں گھس کر لکشمی کو زبردستی اٹھالیا۔ اس کے لیے انھیں معافی مانگنی چاہیے، باقی میں کچھ نہیں جانتا' اور یہ سمجھوتے کی بات چیت کس نے شروع کرائی؟ ہر بار راؤ اور تمھارے بابا نے۔ تمھارے بابا کو تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہر چیز میں دخل دیتے ہیں! میں نے ان سے کہا کہ فخرو چاچا، اب آپ بوڑھے ہو گئے ہو۔ آپ کو ان

چیزوں کی کوئی سمجھ نہیں ہے۔ آپ کچھ مت بولو۔ لیکن وہ سنتے ہی نہیں۔ اپنی ہی چلاتے ہیں۔ کہتے ہیں، گاؤں میں جھگڑا نہیں ہونا چاہیے۔ ارے لیکن کس گدھے کو جھگڑا کرنے کا شوق ہے؟ یہ لوگ معافی مانگ لیں، جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ بوڑھے آدمی ہیں۔ ان سے کچھ زیادہ کہنا اچھا نہیں لگتا اس لیے ہم چپ رہے۔"

"لیکن تمھیں یہ جھگڑا سلجھانا ہے یا نہیں؟"

"ہاں، بالکل سلجھانا ہے۔"

"پھر آدمیوں کو کام سے نکالنے سے جھگڑا کیسے سلجھے گا؟"

"بالکل سلجھے گا ان سالے بوڈھوں اور کلواڑیوں کو بھوکا مرنے دو۔ پھر دیکھو کیسے سیدھے ہوتے ہیں۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔ بات بڑھ جائے گی۔"

"بڑھنے دو! ہم دیکھ لیں گے۔ سمجھے؟ تم کیوں ان کی دلالی کر رہے ہو؟ تم نے زندگی بھر بھی کیا اور ہمیں برباد کر ڈالا۔ کیا اب بھی کچھ کسر باقی ہے؟ ہماری کھیتیاں چھنوا دیں۔ ان کلواڑیوں کو سر پر چڑھا دیا۔ لیکن وہ تمھی پر الٹ پڑے، اس پر بھی تم انھیں کی طرف داری کرو گے؟"

"میں نے ٹھیک کیا۔ یہ ان کا حق تھا۔ اگر میں نہ ہوتا تو وہ اور کسی کے پاس صلاح لینے چلے جاتے۔ دب کے رہنے والے تو تھے نہیں۔ ارے زمانہ بدل گیا ہے۔ اس میں تم یا میں کیا کر سکتے ہیں؟"

اسحٰق غصے سے کھول اٹھا۔ "زمانہ بدلنے کی بات مت کرنا! زمانہ بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمارے گھر میں گھس آئیں؟ زمانہ بدل بھی گیا ہو، تب بھی ہم یہ برداشت کرنے والے نہیں۔"

"وہ بالکل غلط کام تھا۔ لیکن اس سے نمٹنے کا دوسرا راستہ ہے۔ مزدوری بند کرنے سے کیسے کام چلے گا؟"

"یہی ایک راستہ ہے۔ تم نہیں جانتے۔ تم بمبئی میں نیتا گیری کرو۔ گاؤں کی سیاست سمجھنا تمھارے بس کی بات نہیں۔"

میں اس سے بحث کرتا رہا اور وہ ضد میں آ کر مجھے ترکی بہ ترکی جواب دینے لگا۔ میرا مذاق اڑانے لگا۔ آخر مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے کہنے والا ہے کہ یہاں سے نکل جاؤ! تب میں نے بھانپ لیا کہ اسے

سمجھانا بے سود ہے۔

جب میں گھر لوٹا تو بابا بے تابی سے میری راہ دیکھ رہے تھے۔ ہربار او بھی آیا ہوا تھا۔ بابا نے اشتیاق سے پوچھا: "کیا ہوا؟"

"وہ ماننے کو تیار نہیں۔"

"مجھے معلوم تھا۔"

"اب کیا کریں؟" ہربار او نے پوچھا۔

"کیا کر سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "آپ لوگ اپنی بات چیت جاری رکھیے۔ اسی سے کوئی راستہ نکلے گا۔"

بابا نے کندھے اچکائے۔ ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ انھیں اس کی بھی امید نہیں ہے۔

اس رات میں ستی کے گھر گیا۔ وہ مجھ سے بہت دنوں سے نہیں ملی تھی۔ کہیں دکھائی بھی نہیں دی تھی۔ میں پہنچا تو وہ باہر کا دروازہ بند کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر حیران ہو گئی۔ ہمیشہ کی طرح وہ مجھے اپنے رسوئی گھر میں لے گئی۔

"میں سمجھا تم بمبئی چلی گئی ہو!" میں نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

"اگر جاتی تو تمھیں بتا کر جاتی۔ لیکن جانے کا سوچ رہی ہوں۔"

"کیوں؟ تمھارے بھائی نے پھر چٹھی لکھی ہے؟"

"چٹھیاں تو ہمیشہ ہی آتی رہتی ہیں۔ میں ہی اب تک ان پر دھیان نہیں دیتی تھی۔ تم کب جا رہے ہو؟ ساتھ چلتے ہیں۔"

"میرے جانے کا کچھ ٹھیک نہیں۔ گاؤں میں تناؤ پھیل گیا ہے۔ ایسی حالت میں ایک دم چلے جانا مجھے ٹھیک نہیں لگتا۔"

"لیکن یہاں رہ کر بھی تم کیا کر لوگے؟"

اس کا کہنا بالکل صحیح تھا۔ "کچھ بھی نہیں۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ کوئی بزدلی کا طعنہ دے۔ اس لیے میں یہیں رہوں گا۔"

Scanned with CamScanner

اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس نے کہا، "لگتا ہے میری بات تم نے دل پر لے لیا۔"

"نہیں، ایسی بات نہیں۔ میں کسی حد تک تمہاری بات کا قائل ہو گیا ہوں۔"

"اب اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ تمہاری کوئی نہیں سنے گا۔ قائل ہو گئے ہو تب بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو گے۔ کچھ کرو گے نہیں۔"

"کیا کروں؟ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ آج ہی میں انجم کے پاس گیا تھا۔ اسے بتایا کہ گاؤں کے لوگوں کو کام پر واپس لے لے۔ لیکن اس نے میری بات نہ مانی۔"

"ظاہر ہے، کیوں مانے گا تم کیسے سوچ سکتے ہو کہ مسلمان تمہاری بات پر کان دھریں گے؟"

"میری بات پر اور بھی کون کان دھرتا ہے؟ کلوازیوں نے کب میری بات مانی تھی؟ ایسی صورت میں کوئی کیا کر سکتا ہے؟ ستیہ گرہ؟ بھوک ہڑتال؟ میں ان بے وقوفی کی باتوں کو نہیں مانتا۔"

"تم ستیہ گرہ بھی کرو تو کوئی تمہاری بات سننے والا نہیں۔" اس نے ایسے لہجے میں کہا جو مجھے کڑوا محسوس ہوا۔ "اس کا وقت اب گزر گیا۔ قیمے میں کسی الگ تھلگ رہنے والے اجنبی کی طرح تو سننے کے بعد تم یہ موقع گنوا چکے ہو۔ جب تم نے یہاں سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور پندرہ سال یہاں کا رخ نہ کیا تو یہاں کے لوگوں کو اپدیش دینے کا تمہیں حق نہیں رہا۔ اس عرصے میں تمہاری اور ان کی زندگی میں جو تفاوت آ گیا ہے تم نے کبھی اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ تمہارے احساسات شہری ہو گئے ہیں۔ تم ان لوگوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔"

میں نے اس کی بات خاموشی سے سنی۔ اس کی باتیں بڑی حد تک بامعنی تھیں۔ اب تک میں اسے نصیحتیں کرتا رہا تھا، اب مجھے اس کی صلاح لینے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ میں نے اس سے پوچھا، "پھر اب تمہارا کیا خیال ہے؟ میں بمبئی چلا جاؤں؟"

"مت جاؤ۔ جو تم سوچتے ہو ویسا کچھ نہیں ہوگا۔ ایسے جھگڑے کئی بار ہوئے ہیں۔ وہ اپنے آپ سمجھ جاتے ہیں۔ دنیا میں کئی چیزیں آدمی کی مرضی کے خلاف ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ سے کوئی اپنے سر میں راکھ ڈال کر سنیاس نہیں لے لیتا۔"

"پھر تم کیوں بمبئی جا رہی ہو؟"

"میری بات اور ہے۔ میں نے یہاں اپنی زندگی داؤ پر لگا دی ہے۔ تمہارا معاملہ ویسا نہیں ہے۔"

"میں نے بھی اپنی زندگی کو داؤ پر لگایا ہے۔"

"اس کا مطلب کچھ اور ہے۔ تم نے پھر بھی بہت کچھ تو کمایا ہے۔ لیکن میں تو اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی ہوں۔ اب یہاں رہنے میں کوئی مزہ نہیں۔"

میں اس بات چیت کو جاری نہیں رکھ سکا۔ ہولی کے ماحول میں بے حد حساس ہو گیا تھا۔ میں نے وہاں پڑا ہوا اخبار اٹھایا اور خود کو جھلنے لگا۔

"پیچھے کا دروازہ کھول دوں کیا؟"

"نہیں۔ میں اب چلتا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ نہ بولی۔ اس نے دور کی سی نگاہ سے میری طرف دیکھا۔ مجھے لگا، وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن میں نے اس سے پوچھا نہیں۔

"تم بمبئی کب جا رہی ہو؟" باہر نکلتے ہوئے میں نے کہا۔

"ہولی کے بعد۔ تم سے مل کر جاؤں گی۔" اس نے جواب دیا۔

میں چلنے لگا اور مجھے محسوس ہوا کہ میرے ذہن کا خلفشار اور بڑھ گیا ہے۔

اسحق کے اندازے کے برخلاف کلواڑی اور بہادر پور نہیں آئے۔ جن سے ہو سکا وہ ادھر ہی مزدوری کرنے لگے۔ باقی لوگوں نے مسلمانوں کے کھیتوں میں چوری کرنا شروع کر دیا۔ زمین کو بوائی کے لیے تیار کرنے میں جو سوکھے پتے استعمال ہوتے تھے وہ ان کا جو حصہ بازار میں بیچتے تھے۔ دھنوں سے پیڑ کاٹنے لگے اور ان کی ٹہنیاں جلانے کے لیے بازار میں بیچنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کھیتی میں لگے ہوئے پیڑ برباد کیے جانے لگے۔ اتنی پھیلی ہوئی زمین کی رکھوالی کرنا مسلمانوں کے بس سے باہر تھا۔ ایک طرف سمجھوتے کی بات چیت چل جاری تھی۔ ان میں زیر بحث آنے والے معاملوں میں اس چوری کو بھی شامل کر لیا گیا۔

یہ بات چیت ہمارے گھر کے برابر کی خالی جگہ میں ہو رہی تھی۔ کبھی دن میں، کبھی رات کو۔ وہاں کی باتیں مجھے گھر بیٹھے سنائی دیتیں۔ بابا ان بیٹھکوں میں جاتے تھے۔ اور جب گھر آتے تو وہاں کی پوری

Scanned with CamScanner

روداد سناتے۔

لیکن اب میں نے اس روداد پر دھیان دینا چھوڑ دیا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ یہ طوفان خود بخود ٹل جائے گا۔ اس کی وجہ سے سب ہی کو تکلیف ہو رہی تھی۔ مسلمانوں کا کھیتی کے کام کا نقصان ہو رہا تھا۔ ان کے پیڑوں اور گھاس پھوس کی چوری ہونے لگی تھی۔ گھر میں اوپر کا کام کرنے کے لیے وقت پر آدمی نہیں ملتے تھے اور گھر کے کام کے علاوہ بالی بھی باہر جا کر خود لانا پڑ رہا تھا۔ مسلمانوں کے غریب کنبے اس حالت سے سخت پریشان تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ یہ جھنجھٹ آخر کب ختم ہوگا۔

لیکن اس جھگڑے کی زد سب سے بڑھ کر بودھوں پر پڑ رہی تھی۔ ان کو اب مزدوری کا کام ملنا دشوار ہو گیا۔ سارا دن باہر میں چھوٹے موٹے کاموں کے لیے مارے مارے پھرنے لگے اور جوں جوں دن گزرتے گئے ان کو پیٹ بھر کھانے کے لیے بھی مزدوری ملنا مشکل ہو گیا۔ چوری کا ہنر بھی ان میں سب کو نہیں آتا تھا۔ پھر مسلمانوں نے پولیس کے پاس رپٹ بھی لکھوا دی تھی اور گاؤں میں یہ افواہیں گرم تھیں کہ پولیس تفتیش کرنے کے لیے آنے والی ہے۔

لیکن یہ بات چیت ختم ہو رہی تھی اور جھگڑا سلجھنے کا کوئی نشان دکھائی دیتا تھا۔ ایک دن جب میں چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا، چنار دھن وہاں آیا۔ مجھ سے بولا:

''آپ کو بلایا ہے۔''

''مجھے؟ کیوں؟''

''کوئی راستہ نکالنے کے لیے۔''

''میں کیا راستہ نکالوں گا؟''

''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟ کہ آپ نے طے کر لیا ہے کہ لوگوں کے مانگنے پر بھی صلاح نہیں دیں گے۔''

''نہیں۔ میری صلاح وہ نہیں کے نہیں، یہ مجھے معلوم ہے۔ اس لیے میرا وہاں جانے کو جی نہیں چاہتا۔''

''مانیں نہ مانیں یہ ان کا مسئلہ ہے۔ آپ کو اپنا فرض پورا کرنا چاہیے۔''

''فرض ورض کی باتیں مجھے مت سکھاؤ۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''کیا ان لوگوں کا کوئی فرض

نہیں؟"

"ہے کیوں نہیں۔ اسی لیے تو وہ آپ کو بلانے پر راضی ہوئے ہیں۔ اب آپ ٹالیے مت۔ آپ نہ آئے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ جھگڑا نمٹانے کا موقع ہاتھ سے نکل جائے۔"

میں نے بھابی کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنے سے کترا رہی تھی۔ پھر میرا ارادہ بھانپ کر بولی، "آپ کو جانا چاہیے۔ آپ کی وجہ سے یہ جھگڑا سلجھ جائے گا۔"

"اور جا کے ان سے کیا کہوں؟"

"آپ پہلے میرے ساتھ چلیے تو سہی،" جناردھن نے کہا۔ "ہم مل کر پوری بات کریں گے۔ اسی میں سے کوئی راستہ نکل آئے گا۔"

میں بادل ناخواستہ اٹھا اور اس کے ساتھ بیٹھک کی جگہ پر پہنچا۔ بیٹھک میں لوگ الگ الگ ٹولیوں میں بیٹھے تھے اور آپس میں بات کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گئے۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ جناردھن بھی میرے برابر میں بیٹھ گیا۔

وہ سب الگ الگ بسے ہوئے محلوں کی طرح الگ الگ ٹولیاں بنائے بیٹھے تھے۔ یودھ کلواڑیوں کے برابر میں بیٹھے تھے۔ لکھیا اور کاشیا بھی ان میں موجود تھے۔ بابا اور ہرباراؤ پاس پاس بیٹھے تھے۔ ہرباراؤ نے بابا کے کان میں کچھ کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا

"زمیندار، تمھیں سب کچھ پہلے سے معلوم ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ اس مسئلے کو حل کرنے کا راستہ کیا ہے؟"

"آپ لوگوں کی بات چیت کہاں تک پہنچی ہے، یہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ آپ نے بلایا، اس لیے میں آ گیا ہوں۔"

"ارے کیسی بات چیت!" بابا نے بیچ میں کہا۔ "دونوں پارٹیاں اپنی اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہیں۔"

"پھر میں کیا حل نکال سکتا ہوں؟ میری بات کسی کو قبول نہیں ہوگی۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" ہرباراؤ بولا۔ "تم کہو۔ ہم اس پر غور کریں گے۔ کیا خیال ہے؟" اس نے سب لوگوں پر نگاہ ڈالی۔ مجھے لگا اسے اس جھگڑے کے سلجھنے کی امید ہو چلی ہے۔

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ لوگوں کے چہروں پر مجھے کوئی اشتیاق دکھائی نہیں دیا۔ پھر بھی میں نے کہا: "اگر یہ جھگڑا ختم کرنا ہے تو ہر فریق کو تھوڑا بہت جھکنا ہوگا۔"

"ہاں،" لکھیا نے کہا۔ وہاں موجود سو کے قریب لوگوں میں سے صرف اسی کی آواز نکلی "میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں،" وہ بے بسی کے لہجے میں بولا۔ "آپ مجھے اس بے آبروئی سے بچا لیجیے۔"

وہ رونے لگا۔ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے آس پاس بیٹھے کچھ لوگوں نے ذرا بے اطمینانی سے پہلو بدلا۔ پھر سب خاموش ہو بیٹھے۔ میں نے چیکی سے پوچھا: "تو پھر اب کیا کیا جائے؟"

ٹھیک اسی وقت اسحٰق نے منہ کھولا۔ "لیکن جھگڑا کیسے سلجھایا جائے؟" اس نے پوچھا۔ "کس طریقے سے؟ یہ تو بتاؤ۔"

"طریقہ اور کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "دونوں طرف سے غلطی ہوئی ہے۔ دونوں فریق اپنی اپنی غلطی مان لیں۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟" چاروں طرف سے آوازیں اٹھیں۔ "جو کہنا ہے صاف صاف کہو۔" ایک شور مچ گیا۔ کسی شخص نے زور زور سے بولنا شروع کیا۔ شاید یہ اسحٰق کا چچیرا بھائی تھا، لیکن شور میں اس کی بات ٹھیک سے میری سمجھ میں نہیں آئی۔

"بتاتا ہوں ... بتاتا ہوں ..." میں نے شور کے باعث زور زور سے چیخ کر کہنا شروع کیا: "ہر ایک کو حد کی پابندی کرنی ہوگی۔ اسحٰق اپنے گھر میں کسی پرائی عورت کو نہیں رکھ سکتا۔ اور بودھوں اور ٹھاکروں کو اس کے گھر میں گھسنے پر اس سے معافی مانگنی ہوگی۔ بس، معاملہ ختم۔"

"یہ کافی نہیں ہے،" ٹھاکروں نے ایک اعتراض جڑ دیا۔ "بودھوں کی بے عزتی ہوئی ہے۔ کام سے ہٹائے جانے کی وجہ سے بہت سے بے روزگار ہو گئے ہیں۔ اس کا کیا ہوگا؟ اس کا بھی فیصلہ ہونا چاہیے۔"

"میرا بھی نقصان ہوا ہے،" اسحٰق مشتعل ہو کر چلایا۔ "مجھے باہر کے لوگوں کو زیادہ مزدوری پر رکھنا پڑا ہے۔"

تب میں نے ڈانٹ کر کہا: "اب یہ باتیں مت نکالو۔ پھر سے بحث شروع مت کرو۔ یہ جھگڑا یہیں ختم ہو جانا چاہیے۔"

"ٹھیک بات ہے۔ صرف معاملے کی بات کرو،" ہربا راؤ نے ان کی تائید کی۔

Scanned with CamScanner

اچانک سستی کا بچیرا بھائی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے اٹھتے ہی شور تھم گیا۔ سب لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے کہا، ''ایک اور بات کی وضاحت بھی ضروری ہے۔''

وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ میں بے چینی محسوس کرنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا، ''کس بات کی؟''

''ایسا کوئی واقعہ دوبارہ نہ ہو، اس کی ضمانت دی جانی چاہیے۔''

''ہاں ہاں، ضمانت ملنی چاہیے،'' ان گنت آوازیں بلند ہوئیں۔ کلواڑیوں کی اور بودھوں کی آوازیں۔

''اس سمجھوتے کا مطلب آئندہ کے لیے ایک طرح کی ضمانت ہی ہے۔ الگ سے کس بات کی ضمانت دی جائے؟''

''ہرگز نہیں آج یہ جھگڑا سمجھ گیا، اس کا مطلب یہ کہاں سے نکلا کہ آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا؟ اس کا کیا کیا جائے؟''

''اس کی ضمانت میں کیسے دے سکتا ہوں؟ کیا میں ہمیشہ یہاں رہوں گا؟ اور میری ضمانت کی حیثیت کیا ہے؟ اور پھر کون یہ ضمانت دے سکتا ہے کہ ایسا کوئی واقعہ آئندہ کبھی نہیں ہوگا؟ آخر ہم سب انسان ہی ہیں... جہاں لوگ ہوں گے وہاں جھگڑے جھمیلے تو ہوں گے ہی۔ ہمیں چاہیے کہ انھیں بات چیت سے سلجھالیں۔''

''نہیں!'' لفظوں کا ایک بے پناہ ریلا میرے کانوں سے ٹکرایا۔ ''ضمانت کے بغیر سمجھوتا نہیں ہو گا...'' کسی نے زور سے چیخ کر کہا۔ مجھے آگے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ وہ سب جلدی جلدی اٹھ کر جانے لگے۔ دروازے کے پاس ایک دم بھیڑ لگ گئی۔ میں سُن سا بیٹھا رہ گیا۔

سب لوگ چلے گئے، صرف میں، بابا، ہربار او اور جنار دھن رہ گئے۔ کچھ دیر ہم سب ساکت بیٹھے رہے۔ مجھے بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ فوراً اٹھ کر چل دوں۔ لیکن مجھے اٹھ کھڑے ہونے کا حوصلہ نہ ہوا۔

''چلو، شام ہو گئی، چلتے ہیں،'' آخر بابا نے کہا اور دھیرے سے اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے باہر نکل گئے۔ ان کے بعد ہربار او بھی چلا گیا۔ میں اور جنار دھن بھی چل پڑے۔ میرا گھر

جانے کو جی نہ چاہا۔ میں اس کے ساتھ اس کی دکان پر چلا گیا۔

جب اندھیرا ہو گیا تھا۔ میں دکان میں گیا اور بنچ پر بیٹھ کر اندھیرے میں جناردھن کی بیڑیاں ایک ایک کر کے پھونکنے لگا۔ میں بالکل چپ بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے پتا نہ لگا کہ میں کتنی بیڑیاں پی گیا۔ آخر اس کا بیڑیوں کا بنڈل ختم ہو گیا۔

"بیڑیاں ختم ہو گئیں۔" جناردھن مجھے ٹکٹکی لگا کے دیکھنے لگا۔

"نیچے کے پاس ہوں گی... لے آؤ۔"

"لیکن اتنی بیڑیاں پینے سے؟ بیڑی پھونکنے کی آپ کو عادت نہیں ہے۔ گلا بیٹھ جائے گا۔ کھانسی ہو جائے گی۔"

"ہونے دو۔ میرے سگریٹ ختم ہو گئے ہیں۔"

لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اس نے لالٹین جلائی۔ اس کی بتی اونچی کی اور لالٹین کو اوپر ٹانک دیا۔ اور طاق میں رکھی ہوئی آدھی بیڑی سلگا کر اس کے کش لینے لگا۔

آہستہ آہستہ پورا قصبہ اس عجیب ہولے میں گھرتا گیا۔ شمسو کی دکان کے گاہک کم ہوتے گئے۔ اس کی دکان مہارواڑے کے بالکل پاس تھی، مسلمانوں کے محلے کے کنارے پر۔ اس کے سارے گاہک کلواڑی اور بوہرے تھے۔ وہ آنے بند ہو گئے اور شمسو دن بھر فکر کی کیفیت میں دکان میں بیٹھا مکھیاں مارنے لگا۔

صرف مہار لنگوٹی پہنے اس کی دکان میں آتا رہا۔ وہ ہمیشہ کی طرح شمسو سے گپیں مارتا تھا۔ لیکن اس کی باتوں میں پہلے والے موضوع اب نہیں آتے تھے۔ اب صرف لکشمی کا موضوع رہ گیا تھا۔ اور اس کی وجہ سے اٹھا ہنگامہ۔ مزہ آیا تھا اس کا۔

لیکن لکشمی کہاں ہے، کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا۔ اس سارے ہنگامے میں اس کا کسی کو خیال نہیں آیا تھا۔ انّا کو بھی اسے یاد نہیں رہا تھا۔ دوستوں اور کلواڑیوں کے گھر میں گھس آنے سے اسے جو زخم لگا تھا وہ اسے مسلسل تکلیف دے رہا تھا۔ وہ ان سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ بدلہ لینے کا خیال اس کے تن بدن میں آگ لگائے ہوئے تھا۔ وہ اپنی بے عزتی کا حساب برابر کرنے کو بے تاب تھا۔

قصبے کے پچھم کی طرف بنیے کی کھولی ہوئی دکان کی بھی یہی حالت ہونے لگی۔ اس کے مسلمان گاہک کم ہوتے گئے۔ ہندو بستی بہت دور تھی اس لیے وہاں سے گاہک اس کی دکان پر نہیں آتے تھے۔ وہ لوگ شہر سے لوٹتے ہوئے اپنا چھوٹا موٹا سودا سلف لے آتے۔

بنیے کی بیوی کی حالت بہت عجیب ہوگئی۔ اسے لگا کہ اگر حالات یہی رہے تو دکان بڑھا کر شہر واپس جانا پڑے گا۔ اور اگر یہیں رہے تو زیادہ مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہر قسم کی مشکلوں کا! کب کس طرح کی مشکل پیش آجائے اس کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا اور مشکلیں بتا کر نہیں آتیں۔

جب اس کا شوہر شہر گیا ہوا ہوتا تو اسے اور زیادہ ڈر لگنے لگتا۔ اگر کوئی مسلمان اچانک گھر میں گھس آیا تو وہ کیا کرے گی؟ اس نے جناردھن سے جان پہچان پیدا کرلی۔ وقتاً فوقتاً اسے پکار کر وہ اس کا حال چال پوچھنے لگی۔ بلا کر اس سے پوچھتی، "جناردھن بھیا، آج زیادہ گاہک نہیں ہیں، کیوں؟" "آج جلدی دکان بڑھا دی کیا؟" "کیوں؟ آج بہت دیر ہوگئی؟" "تھوڑی دیر رک جایئے تا، ان کو آلینے دیجیے۔ مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے۔" "دیکھو مسلمانوں نے کیسا جھگڑا شروع کردیا ہے!"

جناردھن کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس کے بھی مسلمان گاہک ٹوٹ گئے تھے۔ اس کے ہونے والے مستقل گاہک بھی اب اس کی دکان میں پیر نہیں دھرتے تھے۔ اس کا پورا دن استرا تیز کرنے میں گزرتا۔ لیکن استرا بھلا کب تک تیز کیا جاسکتا ہے؟

ایک دن میں بال کٹوانے اس کی دکان میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے صاف بتادیا کہ اس کے پاس گاہک آنے بند ہوگئے ہیں۔ بال کٹوانے کے بعد میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا۔ اس نے مجھے ایک بیڑی دی جو میں نے لے لی۔ ہم دونوں بیڑی پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ بیچ میں اس نے مجھ سے پوچھا: "اس جھگڑے کا کیا ہوگا؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"لیکن ہمیں ایک کوشش اور کرنی چاہیے۔۔" اس نے مجھ سے کہا۔ "جو کچھ ہو رہا ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ اصل میں ہو کیا رہا ہے۔"

"مجھے کچھ بھی نہیں معلوم۔" میں نے دوبارہ کہا۔

تو پھر سنیے! کلواڑیوں اور بودھوں کی روز رات کو سبھا ہو رہی ہے۔ چندہ جمع ہو رہا ہے۔ نائیوں اور

Scanned with CamScanner

مگر انھیں تو وہ اس میں شامل نہیں کرنا چاہتے۔ فسادات شروع ہو گئے ہیں۔ ابھی واشی چلا تا سلسلہ جاری ہے۔ آپ کے قصبے میں کیا ہو رہا ہے، وہ میں نہیں جانتا۔ لیکن وہاں بھی ایسا ہی کچھ ہو رہا ہوگا۔ اس کا کوئی برا نتیجہ نکلتا لگ رہا ہے...''

''پھر ہم کیا کریں؟''

''تو سنا، کچھ بھی نہ کریں۔''

''کچھ نہیں کیا جا سکتا؟''

''مگر کیوں؟''

''کیونکہ ہماری کوئی نہیں سنتا۔''

''میری بات دھیان سے سنیے۔ اس سال جب پالکی کا جلوس نکلے گا تب اسے مسجد کے سامنے سے باجا بجاتے ہوئے گزارنے کا منصوبہ ہے۔ اگر مسلمانوں نے اسے روکنے کی کوشش کی تو...''

وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''صاحب، انھوں نے روکنے کی کوشش کی تو کیا ہوگا؟ اس کا جواب دیا جائے گا، یہی نا؟''

''ہاں جی۔ انھیں ان کے ڈنڈوں سے۔ آپ بھی ہم دونوں اس لڑائی کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''یہ کوشش بے کار ہوگی۔ کوئی بھی سننے کو تیار نہیں ہے۔ میرا بولنا مسلمانوں کو اچھا نہیں لگے گا۔ وہ شاید میری بات پر بھی یقین نہیں کرتے۔ پہلے کرتے تھے، جب انھیں زمینداروں کی زمینیں چاہیے تھیں۔ اب نہیں کرتے۔ اور بھائی کے ساتھ ہوئے جھگڑے میں وہ میری بات نہ مان لیتے؟''

''تو پھر تو ہونے دو، جیسا ہو رہا ہے ہو جانے دیں؟''

''ہاں۔ اور کوئی راستہ نہیں۔''

''نہیں؟''

''نہیں۔ ہم ہوتے اس بات کو روکنے کی طاقت نہیں رکھتے۔''

جنارجن کے ناخواندہ چہرے پر حیرانی کے جالے تن گئے۔ شاید میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا، ''مگر پھر گاندھی جی کیا کرتے تھے؟''

''تم گاندھی ہو کیا؟''

نہیں۔''

''ہم عام لوگ ہیں۔ ہمیں عام لوگوں جیسا ہی برتاؤ کرنا چاہیے! جہاں تک میرا سوال ہے۔ فی الحال میں نے یہی طے کیا ہے کہ بزدلوں کی طرح قصبہ چھوڑ کر بمبئی نہیں جاؤں گا۔''

دھوبن مسلمانوں کے محلے میں باقاعدگی سے آتی تھی۔ اسے کسی سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ خوف کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ اس کی زندگی میں ڈرنے والی کیا چیز بچی تھی؟ مسلمان اب بھی اسے بلا کر کپڑے دیتے اور بیچ بیچ میں ارجنٹ کپڑے لینے کے بہانے اس کے پاس بھی جاتے تھے۔

لیکن کلواڑیوں کو یہ بات پسند نہ تھی۔ انھیں اس کی اس بے نیازی پر حیرت تھی۔ کیا آدمی پیٹ کی خاطر اتنا لاچار ہو سکتا ہے! انھوں نے اس سے مل کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ بولی: ''وہی میرے گاہک ہیں۔ ان کا کام چھوڑ دیا تو کھاؤں گی کیا؟ جیوں گی کیسے؟ اب تک وہی میری مدد کرتے آئے ہیں۔ انھی کی سہارے میں جیتی آئی ہوں۔ اب جینے کے لیے کسی اور کی مدد نہیں لینا چاہتی۔''

دھوبن کی یہ منطق کلواڑیوں کو قبول نہ تھی۔ انھوں نے اس کو برا بھلا کہا، رات میں اس کے پاس آنے والے زمینداروں کی بات نکالی۔ لیکن دھوبن پر ان باتوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ یہ باتیں تو پورا گاؤں جانتا ہی تھا۔ یہ کوئی راز تو تھا نہیں۔

لیکن اب مسلمانوں کے محلے میں گھومنے پھرنے میں اسے عجیب سا احساس ہونے لگا۔ چاروں طرف پھیلا ہوا شک بھرا ماحول اسے پریشان کرنے لگا۔ اس سے کی جانے والی بات چیت کپڑوں کے لین دین تک محدود رہ گئی۔ رات میں اس کے پاس آنے والے مردوں کے چہروں سے دن میں اس کی پہچان غائب ہو جاتی۔ ان کے چہروں پر اسے درشت اجنبیت دکھائی دینے لگی۔ اسے ان چہروں سے اب راتوں کو بھی ڈر لگنے لگا۔ وہ اپنا دروازہ بند رکھنے لگی۔ وہ اندھیرے میں استری جلائے بغیر گھنٹوں ڈری ہوئی اکیلی بیٹھی رہتی۔ باہر دروازے پر ہونے والی دستک کا جواب دینا اس نے بند کر دیا۔

ایک دن شام کے وقت میں پچھواڑے کے آنگن میں بیٹھا تھا۔ واششٹھی ندی کے پانی میں بہانے سے بڑنے والا گڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ ریت کا ٹیلہ سا اس کے پاٹ کے بیچ میں ابھر آیا تھا۔ اس پر مویشی ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ ندی کا پانی ڈوبتے سورج کی کرنوں سے چمک رہا تھا۔ اور تب کمتی میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

وہ بہت دن بعد ہمارے گھر آئی تھی۔ گھر میں اور کوئی نہیں تھا۔ بابا مویشیوں کے لیے چارا پانی سے نرلوٹے میں گئے ہوئے تھے۔ بھابی کہیں باہر گئی تھی۔ وہ بے چین سی کھڑی رہی۔ اس کے چہرے پر تشویش چھائی ہوئی تھی۔ میں نے نوکر کو آواز دے کر کرسی منگوائی اور اسے بیٹھنے کو کہا۔

"تم اس کے بعد نہیں آئے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے جواب نہ دیا۔ پھر کچھ دیر بعد اس سے پوچھا: "کس فکر میں ہو؟"

"میں نے ایک خبر سنی ہے۔"

"کیا خبر؟"

"کہتے ہیں مسلمان فساد کرنے والے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"مجھے کیا معلوم؟ تمھیں کس نے بتایا؟"

"سارے گاؤں میں یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے،" میں نے کہا۔

"اور اگر سچ ہو تو؟"

"کم سے کم مجھے معلوم نہیں۔ مسلمان میری صلاح نہیں لیتے۔"

"یہ میں بھی نہیں کہہ رہی ہوں۔ لیکن میں نے سوچا شاید تمھیں اندازہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں صرف یہ پوچھنے آئی تھی کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔"

"مجھے کچھ اندازہ نہیں۔" ان افواہوں پر یقین کرنے کو میں تیار نہ تھا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے،" وہ بولی۔ "کچھ پتا نہیں چلتا کیا ہونے والا ہے۔ میں گھر میں اکیلی رہتی ہوں۔"

"تو کیا ہوا؟ تمھارا چچیرا بھائی بھی تو وہیں رہتا ہے۔"

"اس کا پاس رہنا کس کام کا! اگر کچھ ہوا تو وہ میری مدد کو نہیں آنے والا۔ اور آج کل تو وہ رات کو

گھر پر رہتا بھی نہیں۔ کلواڑیوں اور بودھوں کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔ لگتا ہے وہ لوگ مل کر کوئی سازش کر رہے ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہوگی..." میں نے دوبارہ کہا۔ "اور اگر کچھ ہو تو ہمارے گھر آ جانا۔"

"میں یہاں نہیں آؤں گی۔ مجھے تمھارے بھائی کا اعتبار نہیں .."

پھر وہ چپ ہو گئی اور بے چین نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ میری باتوں سے مطمئن نہ ہوئی۔

"پھر تم بمبئی کیوں نہیں چلی جاتیں؟" میں نے پوچھا۔

"جانا تو ہے ہی۔ تم کب جا رہے ہو؟ اگر تمھیں اعتراض نہ ہو تو دونوں ساتھ چلیں۔"

وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی چمکدار آنکھیں مجھ پر جم گئیں۔ میں بے چین ہو گیا۔ اس سے نظر چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا، "میں ہولی تک یہاں رہوں گا۔ اگر تب تک تم رکو تو ساتھ چلتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے،" وہ بولی۔ پھر کچھ دیر یونہی سن سی بیٹھی رہی۔ دھیرے دھیرے اندھیرا چھانے لگا اور تب وہ اپنی کیفیت سے باہر آئی۔ "اب چلتی ہوں،" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور چلی گئی۔

دوسرے دن ڈنے گاؤں کے کچھ مسلمان ہمارے گھر آئے۔ وہ کسی کام سے قصبے میں آئے تھے اور بابا سے ملنے آ گئے۔ بابا کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ چائے پانی ہوا۔ پھر اٹھتے اٹھتے انھوں نے پوچھا۔

"خان صاحب، آپ کے گاؤں میں یہ ہندو مسلمانوں کا کیا فساد چل رہا ہے؟"

"کیسا فساد؟" بابا نے غضناک مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ پھر انھیں مختصراً ساری بات بتائی۔

قصبے کے دوسرے جھگڑوں کے بارے میں انھوں نے زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی۔ لیکن ہولی کے جلوس کے دوران مسجد کے سامنے باجے گاجے جانے کے بارے میں سوال کیا۔ انھوں نے کہا، "آپ اس کی مخالفت کیجیے۔ سیکڑوں برسوں سے مسجد کے سامنے ڈھول نہ بجانے کا قاعدہ رہا ہے۔ اسے بدلنے والے یہ لوگ کون ہوتے ہیں..."

"اب زمانہ بدل گیا ہے" بابا نے کہا۔

"کیسے بدل گیا! آپ اپنی بات پر قائم رہیے گا۔ پھر سب ٹھیک ہے۔ ہم ہیں نا آپ کے پیچھے۔ پھر گھبرانے کی کیا بات ہے؟"

"گھبرانے کا کیا سوال! لیکن یہ سردرد کون مول لے!"

"سردرد کیسا؟ خان صاحب، آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ یہ تو ہمارا حق ہے۔ دینی فریضہ ہے۔ کچھ بھی ہو جائے، ہمیں اس کو ادا کرنا ہی ہے۔"

تب اچانک ان کا دھیان میری طرف گیا۔ انھوں نے پوچھا، "یہ آپ کے صاحبزادے کب آئے؟"

"بہت دن ہو گئے۔"

"اتنے برسوں بعد خوب آئے!"

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ پر اسی بات کا اثر ہو گیا ہے۔ ورنہ آپ جھمیلوں میں پڑنے سے گھبرانے والے نہیں۔"

انھوں نے کہا اور زور زور سے ہنسے۔ بابا کچھ بددل سے دکھائی دیے۔ انھوں نے اس موضوع کو آگے نہیں بڑھایا اور وہ گاؤں کے مسلمان کچھ دیر بعد چلے گئے۔

اس کے بعد ایک دو بار میں نے ان لوگوں کو سڑک سے گزرتے دیکھا، لیکن انھوں نے ہمارے گھر کا رخ نہیں کیا۔ قصبے میں یہ خبریں پھیلنے لگیں کہ [illegible] نے ان سے کوئی گٹھ جوڑ کیا ہے۔ یہ خبریں مجھ تک بھی پہنچیں۔ چندر موہن نے مجھے بتایا کہ نئے گاؤں کے مسلمانوں نے مسجد کے پاس پالکی کے جلوس کا راستہ روکنے کا منصوبہ بنایا ہے، اور اگر ہندوؤں نے باجے بجائے تو وہ فساد کریں گے۔ جب میں نے چھدن سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا، "ایسی افواہوں میں کوئی سچائی نہیں ہے۔ وہ بھلا اپنا کام چھوڑ کر یہاں کیوں آنے لگے؟"

٦

سی تہ ڈبھرے ماحول میں ایک رات مہالکشمی کے استھان پر ہولی کے ڈھول بجنے لگے۔ ڈھول کی یہ تال میں کئی برسوں کے بعد سن رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس آواز کی رفتار بڑھنے لگی اور میں باہر آنگن میں آ گیا۔

باہر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ گھروں کی بتیاں چاروں طرف ٹمٹما رہی تھیں۔ اور کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ اچانک ڈھول کی آواز بھی بند ہو گئی۔ سب کچھ انتہائی خاموش محسوس ہونے لگا۔ ایک عجیب سی خاموشی ہر طرف چھا گئی۔ اس خاموشی پر کسی ہلکی سی آواز کی کھرونچ تک نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ گھروں کی بتیاں گل ہونے لگیں۔ اندھیرے کی یکساں تال ہر طرف گونجنے لگی اور ہوتے ہوتے اس سناٹے میں گھل گئی۔ مجھے لگا ابھی سدام کی بہو کی چیخوں سے یہ سناٹا ٹوٹ جائے گا، لیکن اس رات وہ چیخیں بھی بلند نہیں ہوئیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس رات ہر جگہ خاموشی کی طرح کیسے چھا گئی۔

یہ سناٹا مجھے ڈراؤنا معلوم ہونے لگا۔ بارہ برس کی عمر سے مجھے رات برات بے خوف اکیلے گھومنے کی عادت تھی۔ لیکن اس لمحے آنگن میں اکیلے کھڑے رہنے سے بھی نہ جانے کیوں ڈر لگنے لگا۔ اس خاموشی نے گویا مجھے نگل لیا۔ خاموشی کا یہ چبھتا ہوا احساس میرے لیے ناقابل برداشت ہو گیا۔ مجھے یہ عجیب خیال آنے لگا کہ کم سے کم اس وقت سدام کی بہو ہی چیخ پڑتی۔

میرا جی چاہا کہ دیوی کے استھان پر جاؤں۔ پہلے ہم لوگ ہمیشہ جایا کرتے تھے۔ لوگ اب بھی جاتے ہوں گے۔ لیکن مجھے نہیں لگ رہا تھا کہ آج رات کوئی وہاں گیا ہو گا۔ اس کے علاوہ، ڈھول بجنا

Scanned with CamScanner

جانے کیوں اچانک بند ہو گیا تھا۔ مجھے وہاں جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اسی وقت مجھے یاد آیا کہ کلوازیوں کی بستی میں میرا کیسا خیر مقدم ہو تھا اور دیوی کے استھان پر جانے کا خیال میرے اندر ہی غائب ہو گیا۔ میں گھر کے اندر آ گیا۔

بابا سو رہے تھے۔ بھائی کا کہیں پتا نہ تھا۔ بھابی اب تک باورچی خانے میں اپنا کام نمٹا رہی تھی۔ میں اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

کچھ دیر بعد بھابی کمرے میں آئی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"آپ سے کچھ کام ہے۔ کچھ بات کرنی ہے۔ آپ کو نیند تو نہیں آ رہی نا؟"

"نہیں۔"

"میں کچھ دیر پہلے آئی تھی تب آپ کہاں تھے؟"

"آنگن میں۔ یونہی کھڑا تھا..."

"یونہی نہیں کھڑے تھے۔ کل پالکی کا جلوس ہے، اس کے بارے میں سوچ رہے تھے، ہے نا؟"

"نہیں۔ کچھ دیر پہلے ڈھول کی آواز کیوں بند ہو گئی، یہ سوچ رہا تھا۔"

"وہی مطلب ہوا نا! آج رات مسلمانوں کی بیٹھک ہے۔ یہ وہیں گئے ہیں۔"

"کہاں؟"

"احمق کے گھر..."

"کس لیے؟"

"کل کے بارے میں سوچ بچار کرنے کے لیے۔"

"کیا سوچ بچار کریں گے؟"

"مجھے کیا معلوم؟ مجھے انھوں نے صرف اتنا بتایا ہے کہ اگر مسجد کے سامنے باجا بجایا گیا تو مسلمان مہالکشمی دیوی کو انقا[۱۵] نہیں دیں گے۔"

۱۵۔ انقا: پکے ہوئے کھانے کی شکل میں دی جانے والی نذر جو احترام یا عبودیت کے اظہار کے لیے دی جائے۔ اسے عربی لفظ "النقہ" سے مشتق بتایا جاتا ہے۔

''تو ٹھیک ہے، نہ دیں۔''

''یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ عورتیں وہاں نہیں جائیں گی۔''

''یعنی اگر جلوس میں باجا بجایا گیا، تب نا؟''

''ہاں۔''

''تب تو ٹھیک ہے۔ اگر الفا نہیں دینا ہے تو کسی کو جانے کی کیا ضرورت؟''

''جنھیں جانا ہے وہ تو جائیں گے ہی۔ سب عورتیں گزرتے ہوئے جلوس کو الفا نہیں دیتیں۔ جب پالکی نائی واڑے پر رکتی ہے تب دیتی ہیں۔ ایسا آج تک نہیں ہوا کہ دیوی کو الفا ہی نہ دیا گیا ہو۔ عورتیں تو الفا دیے بغیر نہیں رہیں گی۔''

''انھیں وہاں نہیں جانا چاہیے وہاں اگر ان لوگوں نے ان کی بے عزتی کی تو کیا ہوگا؟''

''لگتا ہے ایسا نہیں ہوگا۔ وہ لوگ شاید نائی واڑے پر ہی آ کر کھڑے ہو جائیں گے۔''

''پھر تو ٹھیک ہے۔ جھمیلا ختم ہو جائے گا۔ لیکن تمھیں اس کی اتنی فکر کیوں ہے؟''

''مجھے تو فکر نہیں ہے۔ میں تو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ آپ اس پر دھیان دیں۔''

''میں کوئی دھیان ویان نہیں دینے والا۔''

''اور اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو؟ آپ کو معلوم نہیں، یہ لوگ کچھ نہ کچھ کرنے کا سوچ رہے ہیں۔''

''کیا کریں گے؟ میں بتا سکتا ہوں۔ یہی کہ باجے بجانے پر اعتراض کریں گے۔ کورٹ میں چلے جائیں گے۔ الفا دینا بند کر دیں گے۔ جھگڑے کو اور بڑھائیں گے۔ کئی دن تک اسی طرح ہنگامہ رہے گا۔ پھر اپنے آپ سب لوگ ہوش میں آ جائیں گے۔''

''اور آپ اس سب کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کریں گے؟''

''کیا کروں؟ تمھی بتاؤ۔ جنار دھن نے بھی مجھ سے یہی پوچھا تھا۔ میں نے اسے بہت کچھ بتایا۔ تمھیں وہ سب نہیں بتاتا۔ لیکن میں کروں گا کچھ نہیں۔ قصبے کے لوگوں میں کوئی بھائی چارہ نہیں رہا۔ کوئی کسی پر اعتبار نہیں کرتا۔ سب اپنی ہی بات کہتے ہیں۔ میری تو سمجھ میں آتا نہیں۔ بہت کم لوگ ایسے بچے ہیں جو ہمدردی رکھتے ہیں۔ ان کی کوئی سنتا نہیں۔ میں، جنار دھن، تم، سمتی، یہ سب۔''

سمتی کا نام سن کر بھابی کو بے چینی ہوئی۔ اس نے پوچھا: ''سمتی کے من کی بات تمھیں کیسے معلوم

ہوئی؟''

''وہ آئی تھی۔ تم لوگ گھر پر نہیں تھے۔ یہی سب باتیں کر رہی تھی۔ پوچھ رہی تھی کہ اگر فساد ہو گیا تو وہ کہاں جائے گی۔ بہت گھبرائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔''

''اسے کا ہے کی گھبراہٹ؟ اسے کوئی کیا کہے گا؟ اور اگر کوئی مشکل وقت آیا تو جانے کے لیے اس کے پاس گھروں کی کیا کمی ہے!''

''تمھارے خیال سے وہ کہاں جائے گی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارے گھر آ جائے گی۔'' وہ بولی۔

''میں تمھیں بتاتا ہوں۔ اسے تمھارے شوہر کا اعتبار نہیں۔''

''یہ تمھیں سچ لگتا ہے؟''

''ہاں۔ اس کی شکل ہی بتا رہی تھی۔ اس وقت تم یہاں ہوتیں تو جان جاتیں۔ اسی لیے وہ چاہتی ہے کہ یہ جھگڑا کسی طرح ختم ہو جائے۔''

''ٹھیک بات ہے۔ جھگڑا نہ ہونا اس کے لیے اچھا ہی ہے۔''

''ٹھیک ہے، یہی سمجھ لو۔ لیکن تم بتاؤ، تم یہ جھگڑا کیوں ختم کرانا چاہتی ہو؟''

''ایسے ہی۔ بس۔ میں تو سیدھی سادی عورت ہوں۔ سب پر بھروسا کر لیتی ہوں۔ اس گھر سے پیر واغا دیا جاتا ہے، آپ تو جانتے ہی ہیں۔ اتنے برسوں کا رواج ختم کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اور ہم دیتے بھی کیا ہیں؟ ایک ناریل اور مٹھی بھر چاول۔ بس پالکی کی گودی بھر جائے، اتنا ہی۔ پتا ہے، مجھے گودی بھرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اسی لیے میں گزرتے ہوئے جلوس کو الفا نہیں دیتی۔ نائی واڑے پر لے جاتی ہوں۔ اب انھوں نے منع کر دیا ہے تو نہیں جاؤں گی۔ مگر مجھے اچھا نہیں لگے گا۔''

''چلو کوئی بات نہیں۔'' میں نے اسے تسلی دینے کے خیال سے کہا۔ ''جب یہ گڑبڑ ختم ہو جائے گی تب الفا بھیج دینا۔ تم بھی خوش اور دیوی بھی خوش۔''

''ٹھیک کہتے ہیں! آپ تو کسی چیز کو مانتے نہیں، آپ تو یہی کہیں گے۔''

''یہ بات نہیں۔ میں نہ بھی مانوں، مگر دوسروں کے ماننے کی قدر کرتا ہوں۔ اچھا، ایسا کرو، بھائی سے بات کرو، اسے سمجھاؤ۔ کیا خیال ہے؟''

Scanned with CamScanner

اس نے سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔ پھر وہ دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد میں نے اس سے کہا: ''جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہی ہو رہا ہے، تم جانتی ہو؟''

''سمتی کے بارے میں کہہ رہے ہو؟''

''ہاں۔''

''لیکن میں نے اس کا کبھی برا نہیں مانا۔ اس کے بارے میں برا سوچا بھی ہو تو اس کے ساتھ برا سلوک کبھی نہیں کیا۔''

''لیکن تمھاری زندگی میں سکون تو نہیں تھا نا۔ اب فکر کم ہو جائے گی۔ سمتی بمبئی جا رہی ہے۔''

لیکن یہ خبر سن کر بھی اس کے چہرے کے تاثر پر کوئی فرق نہ آیا۔ اب وہ سمتی کے بارے میں نہیں سوچ رہی تھی۔ اسے آنے والے دن کی فکر کھائے جا رہی تھی جس کی وجہ سے اس وقت پورا قصبہ خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ چلی گئی اور میں خود اسی آنے والے دن کے بارے میں سوچنے لگا۔

سورج کا زرد گولہ بہت دھیرے سے پورب کے افق پر نمودار ہوا۔ آہستہ آہستہ اوپر چڑھتے ہوئے وہ گرماتا گیا۔ اس کی گرمی سے دھرتی کا رنگ پھیکا پڑتا گیا۔ دھوپ کی تیزی سے نشہ سا چڑھنے لگا۔ سورج بالکل سر کے اوپر پہنچ کر آہستہ آہستہ دوسری سمت ڈھلنے لگا۔ ہمیشہ کی طرح زمین سے دھول کا غبار اٹھا اور ڈھلتی دھوپ میں تیز ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔

ڈھول بجنے کی آواز دھیرے سے ابھری اور دھوپ کے نشے کو توڑتی ہوئی بلند ہوتی گئی... ان کی گہری آواز بہت دور سے آنی شروع ہوئی، پھر دھیرے دھیرے پاس آتی گئی۔

مسلمانوں کے محلے کا گھر گھر اس تال سے گونج اٹھا۔ کچھ دیر یہ گونج قائم رہی، پھر بدلتی ہوئی تال کی آواز سے مردوں نے اندازہ لگایا کہ دیوی کے استھان سے اٹھ کر پالکی چل پڑی ہے۔ وہ ایک ایک کر کے گھروں سے باہر نکل کر آنگنوں میں آ کھڑے ہوئے اور سڑک کی سمت دیکھنے لگے۔

لیکن کوئی ایک فرلانگ آگے سڑک گھوم کر جھاڑیوں میں غائب ہو جاتی تھی۔ پھر یہ پل کے پاس دوبارہ دکھائی دیتی تھی۔ جب ڈھولوں کی دھمک بہت قریب سے ان کے کانوں سے ٹکرانے لگی تو مرد لوگ اپنے آنگنوں سے باہر نکلے اور تپتی دھوپ میں ٹکڑی دکان کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ ان میں

سے کچھ نے دکان کے سائبان تلے پناہ لی، باقی سب دھوپ میں کھڑے انتظار کرتے رہے۔

دھیرے دھیرے عورتیں بھی گھروں سے باہر نکل آئیں۔ وہ بھی آنگنوں میں کھڑی ہو کر سڑک کی سمت تکنے لگیں۔ جیسا کہ ان کا پرانا طریقہ تھا، وہ اپنے آنگنوں سے نکل کر سڑک کے کنارے واقع مکان میں جمع ہو گئیں۔

برآمدے کے چبوترے پر بیٹھا میں بہت دیر تک جلوس میں بجتے ڈھولوں کی آواز سنتا رہا۔ بابا اور بھائی بھی چبوترے پر بیٹھے تھے۔ کوئی کچھ بول نہیں رہا تھا۔ سب کا دھیان اس آواز نے اپنی طرف لگا رکھا تھا۔

پھر دھوپ کی ترچھی کرنیں اترنے لگیں۔ ہوا بہت تیز چلنے لگی اور اس سے اڑنے والے سوکھے پتوں کی سرسراہٹ ڈھولوں کی آواز میں گھلنے لگی۔ پیڑوں پر پتے بھی سرسرانے لگے اور دھول کی تہہ بیٹھنے سے سڑک نظر سے اوجھل ہو گئی۔ میں اٹھا اور باہر آنگن میں آ کھڑا ہوا۔ بھائی باہر نکل کر سڑک کی طرف چلے۔ وہاں پہنچ کر وہ باقی لوگوں میں مل گیا۔ بابا لاٹھی ٹیکتے ہوئے آئے اور میرے پاس کھڑے ہو گئے...

فرلانگ بھر دور سڑک کے موڑ پر پالکی کا جلوس پہلے ڈھول کے بادلوں میں سے جھلکا، پھر آگے بڑھنے لگا۔ باجوں کی آوازیں ہوا کی مخالف سمت اٹھتی ہوئی ہلکورے لینے لگیں۔ کبھی دھیمی پڑ جاتیں اور کبھی اونچی ہو جاتیں۔ لال رنگ کی پالکی دکھائی دینے لگی... اس کے پیچھے چلتا ہوا ہجوم اب نظر کے دائرے میں آ گیا۔

بابا ماتھے پر ہاتھ کا چھجا بنا کر ادھ میچی آنکھوں سے سامنے کی سمت دیکھ رہے تھے۔ انھیں اتنی دور تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ''ابھی کتنی دور ہے؟'' انھوں نے پوچھا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں کسی سے بات چیت کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔

''کیا ہونے والا ہے؟'' انھوں نے پھر سوال کیا۔

ان کا سوال تیز ہوا کے جھکڑ کی طرح آ کر ٹکرایا اور اس کے لفظ دھجی دھجی ہو کر ہر طرف بکھر گئے۔

''میں باہر جا رہا ہوں،'' میں نے ان سے کہا اور جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کر دکان کے پاس آ گیا۔

جلوس باجے بجاتا دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ سستی کا بھائی جلوس کے آگے آگے چل

رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی جس کے نچلے سرے پر لوہے کا پیچ گڑا ہوا تھا۔ کچھ کچھ دیر بعد وہ لاٹھی کو زور زور سے سڑک کی بجری پر ٹھونکتا تھا۔ لوہے کے پیچ کے سڑک سے ٹکرانے کی آواز کسی کو سنائی نہیں دیتی تھی، لیکن اس کے چہرے پر ایسا عجیب تاثر تھا جیسے اسے یہ آواز متواتر سنائی دے رہی ہو...

اس کے پیچھے پالکی جھولتی ہوئی آ رہی تھی۔ ڈھول کی دھمک سے مدہوش ہو کر اس کی لے پر مہالکشمی کو جھلا رہے تھے۔ ایک آدمی مور چھل ہلاتا چل رہا تھا۔ پالکی کے گرد لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہر شخص پالکی کو کندھا دینے کی کوشش میں تھا، اس لیے وہ، کسی کے کندھے پر ٹکے بغیر، پیچھے بجنے والے ڈھولوں کی تال پر، ہوا میں اوپر ہی اوپر تھرک رہی تھی۔

مراٹھوں[۱۶] نے ڈھول گلے میں ڈال رکھے تھے۔ پہلے یہ اعزاز مہاروں کے حصے میں آتا تھا۔ لیکن بودھ دھرم قبول کرنے کے بعد انھوں نے اسے جھٹک دیا تھا۔ ان میں سے کوئی جلوس میں شامل نہیں تھا۔ وہ اپنے گھروں میں تھے یا کام پر گئے ہوئے تھے۔ مہالکشمی کے جلوس پر اٹھنے والے طوفان کی جیسے انھیں کوئی پروا ہی نہ تھی۔ وہ بودھ دھرم کا بہانہ کر کے آہستہ سے ایک طرف ہو گئے تھے۔ پالکی کے ڈھول اور مسلمانوں کا بیر، ان دونوں کی میراث اب اَوروں کے حصے میں آ گئی تھی۔ مراٹھوں کو ڈھول بجاتے میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس کام میں ان کی مہارت کم نہیں لگتی تھی۔ بلکہ وہ اسے زیادہ تن دہی سے انجام دے رہے تھے۔

چند لمحے ان ڈھولوں کی دھمک میرے سر میں گونجتی رہی۔ میرا دماغ اس کے ساتھ ساتھ تال دینے لگا۔ میں جانتا تھا کہ میرے ساتھ وہاں کھڑے ہوئے سب لوگ اس آواز سے اتنے ہی مسحور ہیں جتنا میں۔ یہ باجے برسوں اور پیڑھیوں سے، قدیم وقت سے، اسی طرح بجتے آ رہے تھے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ہمارے پرکھوں کے دماغ بھی ان آوازوں کے ساتھ تال دیتے چلے آئے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ ہمارے پرکھوں میں سے ایک اپنے مسلمان ہونے کو بھول کر ایک بار اس تال کے سحر میں آ کر جلوس میں شامل ہو کر ناچنے لگا تھا۔ بہت سے لوگ بتاتے تھے کہ اس کے بعد برسوں تک وہ شخص باقی مسلمانوں کے مذاق اور تحقیر کا نشانہ بنا رہا تھا۔

۱۶۔ مراٹھا مہاراشٹر سے تعلق رکھنے والی درمیانہ ذات جس سے تعلق رکھنے والے لوگ روایتی طور پر سپاہی کا کام کرتے تھے اور ان میں سے کچھ زمینوں کے مالک بھی تھے۔

لیکن آج مجھے یہ سحر کہرے کی طرح مکمل کر غائب ہوتا دکھائی دیا۔ مسلمانوں کے چہرے تناؤ سے سکڑے ہوئے تھے۔ ان باجوں کی آوازوں سے پیدا ہونے والی مدہوشی ان کے دلوں سے ختم ہو گئی تھی۔ وہ ان آوازوں کو خاموش کر دینا چاہتے تھے۔ ان کے دماغوں پر ایک ہی عزم مسلط تھا کہ مسجد کے سامنے سے گزرتے ہوئے باجوں کی آوازیں روک دینے کے رواج کی پوری طرح پابندی کرائی جائے۔

پالکی ڈولتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ اس کے پیچھے لوگوں کا جلوس لہریں لیتا ہوا آ رہا تھا۔ پھینٹے باندھے اور لوہے کے پتے لگی لاٹھیاں لیے مراٹھے اور کلواڑی ہموار قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہر بارا بھی ان میں شامل تھا۔ لنگوٹی کی جگہ آج اس نے دھوتی باندھ رکھی تھی۔ وہ دکان کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے عورتیں چل رہی تھیں۔ وہ بے فکری سے قدم دھر رہی تھیں۔ اس جلوس کی مسرت کا سچا اظہار انھیں سے ہو رہا تھا۔ قصبے کی ساری نائنیں، مراٹھنیں اور کلواڑنیں جلوس میں شامل تھیں۔ کبھی باہر قدم نہ رکھنے والی نائنیں گھیردار ساڑیاں باندھے، پورے بدن پر گہنے پہنے، اور سر پر آنچل لیے ہوئے تھے۔ ان کی ناکوں کی بڑی بڑی نتھیں چمک رہی تھیں۔ ان میں شدام کی بہو بھی تھی۔ وہ بھی کھلے ہوئے چہرے کے ساتھ اس جلوس میں شامل تھی۔ سب سے پیچھے دھوبن رک رک کر قدم رکھتی چلی آ رہی تھی۔ وہ یوں قدم رکھ رہی تھی جیسے خود کو بھولی ہوئی ہو۔ جب اسے اور عورتوں سے پیچھے رہ جانے کا احساس ہوتا تو ان سے جا ملنے کے لیے دوڑ پڑتی۔ کچھ دیر بعد پھر پیچھے رہ جاتی۔

میں عورتوں کے اس ہجوم میں کسی کو ڈھونڈنے لگا۔ بہت دیر بعد وہ مجھے دکھائی دے گئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح سادہ کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ مجھے لگا کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہے کیونکہ جب میں نے اسے دیکھا تو اس کی آنکھیں میری ہی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر اداس سی مسکراہٹ آ گئی۔ میں نظر گھما کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

اچانک میں چوکنا ہو گیا۔ ہمیشہ جس جگہ آ کر جلوس کے باجے بجنا بند ہو جاتے تھے وہاں بند نہ ہوئے تو وہاں کھڑے مسلمانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ان کے چہرے غصے سے لال ہو گئے۔ وہ کچھ بول نہیں رہے تھے۔ اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے۔ جلوس اب اور آگے آیا اور ہمارے پاس آ کر رکا۔ یہاں

Scanned with CamScanner

آ کر باجے ایک بار زور سے بجے۔ یہ بھی ایک رواج تھا۔ مسلمانوں کے محلے سے اُلفا نہیں لیا جاتا تھا۔ لیکن آج الفاد دینے کوئی آگے نہیں آیا۔ کچھ دیر سڑک پر رک کر پالکی نے ایک جگہ چکر کاٹا اور پھر آگے چلنے لگی... سڑک کے موڑ پر دھول اڑاتی وہ آہستہ آہستہ جھاڑیوں میں اوجھل ہوگئی۔ باجوں کی آوازیں مدھم ہوتی گئیں اور کچھ دیر بعد سنائی دینا بند ہوگئیں...

''آؤ اب چلیں...'' میں نے عام سے لہجے میں کہا۔ لیکن کسی نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ کیا وہ سب سُن ہوگئے تھے؟ یا غصے میں تھے؟ یا ہندوؤں کے عزم کے آگے بے بس ہوگئے تھے؟ ان کے چہروں کے تاثر سے کچھ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اتنے میں اسحٰق دھیرے سے چلتا ہوا میرے پاس آیا اور بولا، ''ان ہندوؤں کی یہ مجال!''

''مگر اب اس کا کیا کیا جا سکتا ہے! انھوں نے باجے بجائے... بجا دیے۔ بس، ہوگیا۔ اب اسے اَن ہوا تو کیا نہیں جا سکتا۔ اگر انھیں پرانے رواج کی پابندی قبول نہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''کیا کر سکتے ہیں؟'' کوئی بولا۔ اس کے لہجے سے میں ڈر گیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ غفور بولا تھا۔ وہ کچھ ہی دن ہوئے بمبئی سے چھٹی پر گاؤں آیا تھا۔

''اِس سے بات مت کرو...'' کسی دوسرے نے کہا۔ ''اسے تو اچھا ہی لگا ہوگا۔ ڈھول بجنے سے اسے خوشی ہوئی ہوگی...''

''ہاں، اور کیا! وہابیوں کو دین دھرم سے کیا واسطہ!''

میں نے کچھ نہ کہا۔ ویسے ان کی بات صحیح بھی تھی۔ ان سے کسی طرح کی بحث میں الجھنا بے سود تھا۔ پھر بھی میں نے ان سے کہا، ''لیکن اب یہاں کیوں کھڑے ہو؟ اپنے اپنے گھر جاؤ...''

''ہاں، جاتے ہیں، جاتے ہیں... تمھارے بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے...''

''ٹھیک ہے بابا، رہنے دو..'' یہ کہہ کر میں چل پڑا اور سکون کا سانس لیا۔ بہت بڑی آفت ٹل گئی تھی... بُری گھڑی گزر گئی تھی۔ میں گھر لوٹ آیا اور پچھواڑے کے آنگن میں کھڑا ہوگیا۔

دھوپ اب بالکل ڈھل گئی تھی۔ دن بھر اڑنے والی دھول نے آسمان کو ڈھانک رکھا تھا! ہوا میں ہر طرف تیر رہی تھی۔ باجوں کی مدھم آوازیں نائی واڑے کی سمت سے سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے کرسی کھینچ لی اور وہیں بیٹھ گیا۔ رفتہ رفتہ چھاتے ہوئے اندھیرے کو دیکھتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد میں گھر کے اندر آ گیا۔ گھر میں کوئی نہ تھا، صرف بابا چبوترے پر بیٹھے تھے۔ بجلی ابھی اب تک نہیں جلی تھی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے چبوترے کی لالٹین جلائی اور باقی بتیاں جلانے کے لیے گھر کے اندر آیا۔

تب ہی زور کا شور مچا۔ تائی واڑے کی سمت سے سنائی دینے والی باجوں کی مدھم آوازیں ایک دم بند ہو گئیں۔ اس کے فوراً بعد چیخیں سنائی دیں۔ چیخنے چلانے اور کراہنے کی آوازیں اس خاموشی میں بھر گئیں۔ چند لمحوں تک میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر کوئی زور سے چیخا: "مسلمانوں نے پالکی پر حملہ کر دیا۔ مارا ماری شروع ہو گئی۔ دروازے کھڑکیاں بند کرو۔۔ باہر مت نکلو۔۔۔"

میں چونک گیا۔ باورچی خانے کا جلتا دیا میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ اسے وہیں چھوڑ کر اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا میں چبوترے پر آیا۔ بابا اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ آواز ویسی ہی ان کے کانوں میں بھی پڑی تھی۔ انھوں نے ڈرے ہوئے لہجے میں پوچھا: "کون چیخ رہا تھا؟ کیا ہوا؟"

"مارا ماری۔۔ پالکی کے پاس۔۔۔" میں نے کسی نہ کسی طرح انھیں بتایا۔

"مارا ماری؟ کس نے کی؟"

"اپنے لوگوں نے کی ہے شاید۔ مجھے معلوم نہیں۔ میں جاتا ہوں وہاں۔۔"

"تم مت جاؤ" انھوں نے خوفزدہ آواز میں کہا۔ "مت جانا۔۔"

"کیوں؟ جا کے دیکھتا ہوں کیا ہوا ہے۔"

"اس خطرے میں؟"

"مجھے کیا خطرہ ہے؟ مجھے کون مارے گا؟"

"مارا ماری میں کوئی کسی کو نہیں دیکھتا۔"

"ایسی بات نہیں۔ شاید۔۔ شاید میری بات سن لیں۔"

"کوئی نہیں سنے گا۔ وہاں جو ہو رہا ہے ہونے دو۔ تم مت جاؤ۔۔۔"

"لیکن بھائی بھی نہیں ہے۔ وہیں گیا ہوگا۔"

"اس کو جانے دو۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ ہوگا۔ تمھاری طرح اکیلا آگے نہیں جائے گا۔"

اچانک مجھے بھابی کا خیال آیا۔"بھابی کہاں ہے؟ آپ نے دیکھا ہے اسے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں دیکھا۔ اندر نہیں ہے کیا؟"

"نہیں... وہ... کیا وہ وہاں گئی ہے؟"

اس خیال سے میں بوکھلا گیا۔ خوف سے میرا بدن مفلوج ہو گیا۔ باباسن کھڑے تھے۔"وہ کیوں چلی گئی؟" انھوں نے پوچھا۔

"الفا دینے گئی ہوگی۔ اس کو واپس لانا ہوگا۔ مارا ماری میں پھنس گئی ہوگی۔ میں جاتا ہوں..."

انھوں نے ہاں نا کچھ نہیں کہا۔ پاس کے ستون کا سہارا لیا اور دھیرے سے آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔

"آپ دروازہ بند کر لیجیے..." میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔ تائی واڑے کی طرف دوڑنے لگا۔ مسلمانوں کے گھروں کو ایک ایک کر کے پیچھے چھوڑتا گیا۔ زینے کے بعد زینہ پار کرتا گیا۔ پتھروں سے ٹھوکریں کھائیں۔ ایک پیڑ کی اُبھری ہوئی جڑ سے ٹکرا کر گر پڑا۔ پھر سے اٹھ کر دوڑنے لگا۔ ہانپتے ہوئے پھسلتی ہوئی پگڈنڈی تک آ پہنچا۔

وہاں اس ڈراؤنے اندھیرے میں مسلمانوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔"کون ہے؟" دور سے کسی نے مجھ سے ڈپٹ کر پوچھا۔"میں... میں ہوں..." میں نے کمزور آواز میں کہا اور آگے بڑھا۔ تائی واڑے سے آتی ہوئی چیخنے چلانے کی آوازیں اب پاس آ گئیں۔"وہاں مت جانا... آگے مت بڑھنا..." کسی نے مجھ سے ڈپٹ کر کہا۔

"مجھے جانے دو بھائی!" میں نے التجا کی اور آگے بڑھا۔ انھوں نے مجھے روکا نہیں۔ میں پھر دوڑنے لگا۔ ہانپتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اور اچانک سامنے سے آتے ہوئے بھائی سے میری ٹکر ہو گئی۔"تم یہاں کیسے؟" میں نے اسے زور سے پکڑ کر پوچھا۔ اس ٹکر سے میرے حواس گم ہو گئے تھے اور میں لڑکھڑا گیا تھا۔"کیا ہو رہا ہے؟"

"ابھی یہ سب مت پوچھو۔ واپس جاؤ..." وہ میرا بازو پکڑ کر مجھے پیچھے کھینچنے لگا۔

"بھابی..." میں نے اس سے کہا۔"بھابی گھر میں نہیں ہے..."

Scanned with CamScanner

''گھر میں نہیں ہے؟ پھر کہاں ہے؟''

''مجھے کیا معلوم؟ الفا دیکھنے گئی ہوگی۔''

''کیا؟'' وہ یوں چلایا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ چند لمحوں تک وہ چکرایا ہوا کھڑا رہا۔ پھر اس نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ ''وہ... وہ... کیا واقعی؟''

''شاید وہ ہنگامے میں پھنس گئی ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''تم واپس جاؤ۔ میں وہاں جاتا ہوں۔''

وہ کچھ نہ بولا۔ میں نے اسے اپنے پیچھے اندھیرے میں لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا۔

اور میں دوڑنے لگا... تیز، اور تیز۔ اندھیرے میں اس تنگ اور چڑھتی ہوئی پگڈنڈی پر چڑھنے لگا۔ جوں جوں نائی واڑا پاس آتا گیا، مجھے لوگوں کا شور وغل صاف سنائی دینے لگا... سدام کے گھر کے باہر لگی ہوئی گیس بتیاں دکھائی دینے لگیں... عورتوں کی چیخیں زور زور سے کانوں سے ٹکرانے لگیں۔ میں ہانپتا ہوا اس اجالے میں پہنچا۔ سدام کے آنگن میں آ کر رکا۔

آنگن میں بیس پچیس لوگ تھے۔ وہ فرش پر بے بس پڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چونک گئے۔ میں ان سے دور کھڑا ہو گیا۔ چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میں بھائی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے میری نظر پالکی پر گئی۔ وہ پہلو کے بل گری پڑی تھی۔ مہالکشمی کی مورتی کے سر پر لگا ہوا چاندی کا مکٹ اچھل کر گر پڑا تھا۔ مورتی کے بازو پر لگی ہوئی دھات کی بانڈیاں اکھڑ آئی تھیں۔ پالکی کی سلاخیں ٹوٹی پڑی تھیں۔ ٹوٹی ہوئی گیس بتیوں کے کانچ سارے منڈپ میں بکھرے ہوئے تھے۔ خون میں لت پت کچھ لوگ زمین پر پڑے تھے... وہ درد سے کراہ رہے تھے... سدام کی بہو بھی وہیں بے سدھ پڑی تھی۔ وہ ادھر اُدھر لڑھک رہی تھی۔ اس کی نتھ کسی نے نوچ لی تھی۔ ناک سے خون ٹپک رہا تھا، بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے منھ سے گالیاں نکل رہی تھیں۔ سدام اسے تسلی دے رہا تھا اور وہ زور زور سے رو رہی تھی۔ ایک طرف دھوبن بیٹھی تھی۔ ہاتھا پائی میں اس کے بدن کے کپڑے لیر لیر ہو گئے تھے۔ وہ اکڑوں بیٹھی غصے میں بار بار زمین پر ہاتھ مار رہی تھی۔ ''میری آبرو لوٹ لی مسلمانوں نے!'' وہ بلک بلک کر چیخ رہی تھی۔ وہی مراٹھنیں ورکلواڑ میں جو ہمیشہ اس کے چال چلن کا مذاق اڑاتی تھیں، اسے دلاسا دے رہی تھیں۔ ان کے منھ سے بھی کوسنے نکل رہے تھے۔ وہ بھی اس طوفان کی لپیٹ میں آ گئی تھیں۔ اور بھی کئی عورتیں وہاں اسی حالت میں پڑی تھیں۔

Scanned with CamScanner

''تمھاری ماں بہنیں نہیں ہیں، زمیندار صاحب؟'' ایک آدمی نے آگے بڑھ کر مجھ سے کہا۔ ''انھوں نے دس عورتوں کو گرالیا۔ مردوں کے سامنے ان کی آبرو لوٹ لی۔ ہم بھی تمھاری عورتوں کی اسی طرح عزت لیں گے، یاد رکھنا!''

مجھے سخت مایوسی اور دکھ محسوس ہوا۔ وہیں کھڑا رہ گیا۔ میری نظریں بے چینی سے چاروں طرف بھابی کو ڈھونڈنے لگیں۔ وہاں کسی سے پوچھنا بھی مجھے ٹھیک نہیں لگا۔ اسی شور ہنگامے میں مجھے ہرہارا دھوتی باندھے ایک کونے میں بیٹھا دکھائی دیا۔ میں اس کی طرف لپکا۔

مجھے اپنے پاس کھڑا دیکھ کر اس نے گھٹنوں میں دبا سر اٹھایا، مجھے غور سے دیکھا اور پھر اپنا سر گھٹنوں میں دبالیا۔ اسی حالت میں بڑبڑا کر بولا، ''ارے ایسی دشمنی تو میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھی تھی، زمیندار! ایسا کیوں کیا تم لوگوں نے؟''

یہ مجھے بھی کہاں معلوم تھا؟ اس کی طرح میں بھی حواس باختہ تھا۔

''تم یہاں سے چلے جاؤ، زمیندار!'' اس نے نفرت سے کہا۔ ''اگر کلواڑی یہاں آ گئے تو تمھاری خیر نہیں۔ ان کی سونی کو بھی مسلمانوں نے خراب کر دیا ہے۔ تم چلے جاؤ یہاں سے۔ اپنے گھر جاؤ۔''

''میری بھابی یہاں آئی تھی۔ میں اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔''

اس نے گھٹنوں سے اپنا سر دوبارہ اٹھایا۔ اس کے چہرے پر اذیت کی لہر ابھری۔ پھر وہ بولا، ''اسے بھی مسلمانوں نے گھیر لیا تھا۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے چونک کر کہا۔

''جھوٹ کہہ رہا ہوں کیا؟ یہیں، اسی جگہ اسے گھیر لیا تھا۔ اس سے آگے مجھے اس بھیڑ میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ لیکن پھر کسی نے اسے برہمنوں کی سمتی کے ساتھ جنگل کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا۔''

میں ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگا۔ بھابی سمتی کے ساتھ کہاں گئی؟ اس کے گھر؟ میں وہاں سے بھاگ پڑا۔ پھر سے دوڑنے لگا۔ جنگل کے راستے سے ٹھوکریں کھاتا ہوا پگڈنڈیاں چڑھنے اترنے لگا۔ جب بھاگنا ممکن نہ رہا اور اندھیرے میں راستہ دکھائی دینا بند ہو گیا تو بیٹھ کر پھسلنے لگا۔ میرے ہاتھ پیر لہولہان ہو گئے۔ کسی نہ کسی طرح سمتی کے دروازے کے پاس آ کر اسے پکارنے لگا۔

کھٹکے میں دروازہ کھول کر میں سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس ہاتھا پائی اور بھاگ دوڑ کے نشان اس کے چہرے پر بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ جیسے میری ہی راہ دیکھ رہی تھی۔ مجھے اندر بلا کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ پھر مجھ سے بولی: "تمھاری بھابی یہیں ہے۔ اسے جلدی لے جاؤ۔ گلوازی مت [illegible] ہیں۔ اسے زیادہ دیر یہاں نہیں رکھ سکتے۔ تم نہ آتے تو میں خود اسے چھوڑنے جانے والی تھی۔"

"وہ اس آفت میں کیسے پڑ گئی؟ حملے میں ہوا کیا تھا؟"

"وہ مجھ سے مت پوچھو۔" اس نے کانپ کر کہا اور پھر خود ہی بتانے لگی۔ "وہ دیوی کو اٹھا دے رہی تھی۔ [illegible] وہاں سے آ پہنچے۔ جو سامنے آیا اس پر پل پڑے۔ ہر عورت پر ہاتھ ڈالنے لگے۔ [illegible] تمھاری بھابی ان سے نہ بچ سکی۔"

وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ بھیانک واقعہ خود اس کے ساتھ بھی [illegible] میں اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔

[illegible] میں بھابی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ان مرنے والے کوٹھی [illegible] دیر تک وہ مجھے ٹک ٹک دیکھتی رہی، پھر دونوں ہاتھوں سے چہرا چھپا لیا۔ مجھے صرف اس کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں اور اس کا جھکا ہوا بدن لرزتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

"بھابی [illegible] مجھے بتاؤ۔" میں نے ہمت جٹاتے ہوئے کہا۔ "بتاؤ تو کیا ہوا ہے؟"

"[illegible] سسکیاں تیز ہو گئیں۔ اس کا بدن اور زیادہ کانپنے لگا۔ چہرہ اور جھک [illegible] ہو گئی۔ [illegible] سے جلدی یہاں سے لے جاؤ۔ دیکھو، میرا بھائی [illegible] تو تم دونوں کی اور میری خیر نہیں۔"

[illegible] بھابی [illegible] اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس نے گردن اوپر اٹھائی۔ چہرے کو [illegible] آنسو بھری آنکھوں سے وہ میری طرف بے بسی کے ساتھ دیکھنے لگی۔

میں نے [illegible] سے کہا: "اور تم یہاں اکیلی کیا کرو گی؟ تم بھی چلو۔"

"نہیں، مجھے کوئی ڈر نہیں۔ مجھے کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ اب تم لوگ نکل جاؤ۔ میں اپنا دیکھ لوں

گی۔"

اس سے حجت کرنا لاحاصل تھا۔ میں نے بھابی کو ساتھ لیا اور اندھیرے میں گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ہمیں کوئی نہیں ملا۔ لیکن ہمارے پیروں کے نیچے چرمراتے سوکھے پتوں کی آواز سے ہمیں ڈر لگ رہا تھا۔ مسلمانوں کے محلے کی طرف جانے والی گلی کے نکڑ پر مسلمانوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ ہماری آہٹ پاتے ہی انھوں نے ٹارچ کی روشنی ہمارے اوپر ڈالی۔ ہم کچھ بولے بغیر آگے نکل گئے۔ انھوں نے بھی ہم سے کچھ نہیں پوچھا۔ کسی طرح ہم آخرکار گھر پہنچے۔ اندر داخل ہونے سے پہلے بھابی ایک لمحے کو ٹھٹکی اور مجھ سے بولی، "میری قسم ہے، کسی کو بتانا مت!" اور تیزی سے مجھ سے پہلے اندر چلی گئی۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں گئی اور دروازہ بند کر لیا۔

بابا، جو برآمدے میں ادھر سے اُدھر ٹہل رہے تھے، رک کر ہمیں دیکھنے لگے۔ میں چند لمحے کھڑا ان کی طرف دیکھتا رہا، اور دھیرے دھیرے مجھے اپنے ہاتھ پیروں کی طاقت زائل ہوتی محسوس ہوئی۔ دل کی دھڑکن کانوں میں زور زور سے سنائی دینے لگی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ بس میرے دل کے دھڑکنے کی آواز گونج رہی تھی۔ سامنے کھڑے ہوئے بابا کی پرچھائیں ہوا میں ہلکورے لیتی دکھائی دینے لگی۔ چبوترے میں لٹکی لالٹین پھلجھڑی سی بن گئی اور میرے چاروں طرف چھوٹنے لگی۔ میں اپنی جگہ کھڑا خود کو دائیں بائیں ڈولتا محسوس کرنے لگا۔

اور اچانک میرے دل سے پھوٹنے والا شدید درد میرے پورے بدن میں پھیل گیا۔ میں نے بے بسی سے چیخ ماری اور اپنے جھکے ہوئے بدن کو ایک طرف ڈھے جانے دیا۔

اگلے چار پانچ دن میں تیز بخار میں پڑا جلتا رہا۔ سینے میں رہ رہ کر درد اٹھتا۔ بخار کی وجہ سے مجھے غنودگی محسوس ہو رہی تھی۔ دھیرے دھیرے میرا بخار کم ہوا۔

دو شروع ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ سخت مشقت سے میری طبیعت خراب ہوئی ہے۔ اس کی رائے میں دل کی بیماری میں مبتلا ہوتے ہوئے مجھے دوڑنا ہرگز نہیں چاہیے تھا، اور خاص طور پر دوڑتے ہوئے چڑھائی چڑھنا خودکشی سے کم نہ تھا۔ لیکن اس نے مجھے تسلی دی کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے، اور مکمل آرام کی ہدایت کی۔

اس وجہ سے میرا بمبئی جانا غیر ضروری طور پر ملتوی ہو گیا۔ میں نے ہولی کے فوراً بعد واپس جانے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن اب بابا نے اصرار کیا کہ پوری طرح صحت یاب ہونے سے پہلے مجھے یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔ ان کا کہنا بغیر چوں چرا کے مان لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مجھ میں چار قدم چلنے کی بھی طاقت نہیں بچی تھی۔

فساد میں زخمی ہونے والے ایک کلواڑی کی حالت تشویشناک ہو گئی تھی۔ فساد کے بعد کچھ مسلمانوں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ ان میں اسحٰق اور بھائی بھی تھے۔ انھیں ضمانت پر چھڑا کر لایا گیا۔ قصبے میں پولیس تعینات کر دی گئی تھی۔ اس کا دن رات پہرہ رہتا تھا۔ قصبے کا ماحول خوفناک ہو گیا تھا۔ صرف میں بیمار ہونے کی وجہ سے اس تناؤ سے محفوظ تھا۔

سمتی بمبئی چلی گئی تھی۔ وہ جانے سے پہلے ہمارے گھر آئی تھی، لیکن تیز بخار کی حالت میں میں اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ اس نے بھابی کے پاس میرے لیے پیغام چھوڑا تھا کہ اور رکنا اس کے لیے ممکن نہیں، اس لیے وہ جا رہی ہے۔

سات آٹھ دن بعد میری طبیعت بہتر ہونے لگی۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر باہر آنے لگا۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ میں بمبئی کا سفر کرنے کے قابل ہو گیا ہوں، تب میں نے روانگی کا دن طے کیا۔ جانے سے ایک دن پہلے جناردھن مجھ سے ملنے آیا۔

''آپ کے ساتھ میں بھی بمبئی چلوں گا۔ اس گاؤں سے میں تنگ آ چکا ہوں،'' اس نے مجھ سے کہا۔

''لیکن تمھاری دکان کا کیا ہوگا؟''

''وہ تو آٹھ دن سے بند ہے،'' اس نے کہا۔ ''اور اسے کھولنے کو میرا جی نہیں کرتا۔ میرا چھوٹا بھائی اسے چلائے گا۔ اب میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔''

اگلے دن وہ بازار کے بس اسٹیشن پر موجود ہوا۔ بھائی مجھے چھوڑنے آیا تھا۔ اس نے جناردھن سے پوچھا، ''کیوں رے، تو کہاں جا رہا ہے؟''

''بمبئی جا رہا ہوں،'' جناردھن نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اب آپ قصبے میں جو آگ لگانا چاہیں، لگاتے رہیے۔''

بھائی کے چہرے پر اس بات کا کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا۔ وہ خالی نظروں سے بس اسٹینڈ پر لگنے والی گاڑی کی طرف دیکھتا رہا۔

جب سے میں بیمار پڑا تھا، اس کا برتاؤ اسی طرح کا ہو گیا تھا۔ وہ میرے کمرے میں آتا، دور ایک کونے میں کھڑا رہتا۔ اگر کمرے میں اور لوگ ہوتے تو دور خاموش کھڑا مجھے غور سے دیکھتا رہتا، اور دوسروں کے ساتھ ہی کمرے سے نکل جاتا۔ لیکن اگر کمرے میں اور کوئی نہ ہوتا تو زیادہ دیر وہاں نہ ٹھہرتا۔ جاتے جاتے صرف اتنا پوچھتا، ''دوا لے لی؟ اب ٹھیک لگ رہا ہے نا؟''

میری روانگی سے ایک دن پہلے اس نے مرغ بریانی پکائی۔ اسے کھانا پکانے کا خاص شوق تھا۔ کھانے پر اس نے اسحٰق کو بھی بلایا۔ اسحٰق آیا، لیکن اس دن کچھ زیادہ بات چیت نہ کی۔ کھانا ختم ہونے کے بعد فوراً جانے کو اٹھ کھڑا ہوا۔ جاتے ہوئے مجھ سے بولا، ''کل سویرے جا رہے ہو؟ ٹھیک ہے، اپنی طبیعت کا خیال رکھنا۔'' میں نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

مجھے صرف بابا کو خدا حافظ کہنے سے ڈر لگ رہا تھا۔ دو تین دن سے ان کے پاس جانا میں ٹال رہا تھا جہاں وہ اکیلے بیٹھے ہوتے تھے۔ میری روانگی سے دو دن پہلے سے وہ کھوئے ہوئے سے باہر بیٹھے رہتے۔ نکلنے سے پہلے کی رات کو جب میں، بھابی اور بھائی میرے کمرے میں بیٹھے تھے تب وہ آئے اور ہم سے باتیں کرنے لگے۔ میں اپنے چھوٹے سے بیگ میں کپڑے رکھ رہا تھا۔ میں نے بیگ کو بند کیا۔

''کچھ بھولے تو نہیں ہو نا؟'' انھوں نے پوچھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''ویسے بھولنے کے لیے ہے ہی کیا؟ چار کتابیں اور دوا کی شیشی۔''

اس بات پر ہم سب ہنسنے لگے۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑے جماہیاں لیتے رہے۔ پھر بولے، ''اب سو جاؤ۔ صبح جلدی اٹھنا ہے۔'' اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

سویرے جب میں نکلا تب وہ جاگ اٹھے تھے اور اپنے بستر پر بیٹھے تھے۔ میرے کمرے میں آتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر برآمدے کے چبوترے پر آ گئے۔ کچھ دیر خاموشی سے کھڑے رہے۔ میرے قدم سست پڑ گئے۔

''اچھا، اب چلتا ہوں،'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ خط لکھ دیا کرو۔ اور اپنی طبیعت کو سنبھالنا،'' وہ بولے اور وہیں کھڑے رہے۔ میں نے ان کی طرف نہیں دیکھا۔ وہاں سے چل پڑا۔

بھابی سڑک سے فرلانگ بھر دور تک ہمارے ساتھ آئی۔

''تم اس اندھیرے میں کیوں آ رہی ہو؟'' گھر سے نکلتے ہوئے بھائی نے اسے جھڑکا۔ لیکن وہ بغیر کچھ کہے ساتھ چلتی رہی۔ اس نے اپنے ہاتھ پیچھے باندھ رکھے تھے اور اندھیرے میں خاموشی سے آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ وہ ننگے پیر تھی۔ سڑک کی گھنٹوں تک کی دھول میں وہ پیر گھسیٹتی چل رہی تھی۔

پچھلے کچھ دنوں سے وہ زیادہ بات چیت نہیں کرتی تھی۔ اُس رات کے بعد سے۔ میں نہیں جانتا کہ اس واقعے کا کسی اور کو پتا چلا یا نہیں۔ شاید بابا اور بھائی کو اس کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ اگر اوروں کو اندازہ تھا بھی تو ان سے کہنے کی ہمت نہیں کی ہوگی۔ لیکن اس کے پورے برتاؤ پر اس رات کے واقعے کا سایہ مسلط ہو گیا تھا۔ مجھ سے بھی وہ پہلے کی طرح بات نہیں کرتی تھی۔ جب میں بیمار تھا تو وہ صرف دوا اور کھانا دینے کے لیے ذرا کی ذرا میرے کمرے میں آتی۔ اس کا سلوک مجھ سے ویسا ہی رہا تھا جیسے کسی عوامی ہسپتال کی نرس کا کسی مریض کے ساتھ۔ یہ سلوک مجھ سے برداشت نہ ہوا تو ایک دن میں نے اس سے پوچھا، ''تم کب تک اس طرح اداس رہو گی؟''

''جب تک بھول نہیں جاتی۔''

''بھولنے میں تو بہت دن لگیں گے۔ تب تک میں جا چکا ہوں گا۔ مجھ سے کیوں بات نہیں کرتیں؟ میں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟''

''میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟'' وہ پھٹ پڑی۔ ''میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا؟ ایک عزت ہی تو تھی میرے پاس۔ اور کسی چیز کی میں نے طمع نہیں رکھی۔ وہی عزت لوٹ لی گئی۔ اب میرے پاس رہ کیا ہے؟ اور آپ نے بھی کیا کیا؟''

''میں کیا کر سکتا تھا۔۔''

''آپ اسے پکڑتے، مارتے، پیٹتے۔۔ اس کا خون کر دیتے۔۔۔'' اس کی آنکھیں نفرت سے چمک اٹھیں۔

Scanned with CamScanner

''وہاں کوئی نہیں تھا۔ میرے پہنچنے تک سب جا چکے تھے۔''

''جانے دیجیے۔ آپ کیوں مغز پچی کرتے ہیں۔ آرام کیجیے۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ پھر پورا دن میری طرف رخ نہیں کیا۔ پھر رات کو سارے کام نمٹانے کے بعد وہ میرے کمرے میں آئی اور بولی۔

''دوپہر میں میرا سر گھوم گیا تھا۔ میں نے اپنا غصہ آپ پر نکالا۔''

''ٹھیک ہی تو ہے۔ آخر انسان کو غصہ تو آ ہی جاتا ہے۔''

''لیکن آپ سے وہ سب کہنے کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ اب آپ ایک مہربانی کیجیے۔ وہ بات آئندہ کبھی مت نکالیے گا۔''

اگلے چار پانچ دن اس کی تنک مزاجی کچھ کم ہوگئی۔ لیکن پھر بھی مجھے محسوس ہوا کہ اس کے برتاؤ کا کھلا پن کھنچ تان کر لایا ہوا ہے۔

وہ دھول بھری سڑک پر چلتی آئی۔ آخر بھائی چلتے چلتے رکا۔ ''تم کہاں تک ہمارے ساتھ آؤ گی؟'' اس نے ایک بار پھر جھڑک کر کہا۔ ''اب واپس جاؤ۔'' تب ناچار وہ رک گئی۔ میں بھی چلتے چلتے رک گیا۔ بھائی آگے چلتا رہا۔

''خط لکھیے گا۔''

''ہاں۔''

''اور پھر گھر آیئے گا۔''

''آؤں گا۔''

''کب؟''

''کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''کیوں؟ گھومنے پھرنے تو جاتے ہیں نا؟ تو پھر گھر آ جایئے گا۔ گھر کے لیے نہیں، ہم آپ کے کچھ لگتے ہیں، اس لیے۔''

''ہاں،'' میں نے کہا۔ ''آنا تو چاہیے۔''

وہ مڑی اور واپس چلنے لگی۔ دھول بھری سڑک پر اس کے قدموں کی چاپ کچھ دیر سنائی دیتی رہی، پھر غائب ہوگئی۔ میں بھی مڑا اور چل دیا۔ اندھیرے میں سڑک صاف دکھائی نہیں دے رہی

تھی۔ اس کے موڑ اور چڑھائیاں ٹھیک سے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ لیکن جب اس پر چلنے سے مجھے تھکن محسوس نہیں ہوئی تو میں نے خود کو تسلی دی کہ میری طبیعت اب واقعی بہتر ہو گئی ہے۔ آخر ہم بس اسٹینڈ پر پہنچے۔ بس چھوٹنے تک بھائی کھڑا رہا۔ پھر بس روانہ ہوئی اور صبح کے دھندلے اجالے میں وہ اپنی جگہ کھڑا ہاتھ ہلاتا دکھائی دیتا رہا۔

۷

لیکن یہ کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی۔

اسٹیٹ ٹرانسپورٹ کی بس بمبئی سے گوا جانے والی زیر تعمیر سڑک کے پکے حصے پر دوڑ رہی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد کچی سڑک آ گئی۔ اب وہ ہانپتے ہوئے پرشورام کی گھاٹی پر چڑھنے لگی۔ بس میں بیٹھے مسافر اونگھ رہے تھے۔ جناردھن کو بھی نیند آنے لگی۔ انجن کی متواتر اور کرخت گھرر گھرر کا نشہ مجھ پر بھی طاری ہونے لگا۔ اور میرے ذہن میں ہم سب کے مستقبل کی زندگی کا نقشہ بننے لگا بنیے کی بیوی، جناردھن، سمتی، بھائی، سدم، اس کی بہو، دھوبن لکشمی .. ان سب کی زندگی کو میں نے قریب سے دیکھا تھا اور وہ جس طرح جیتے اور برتاؤ کرتے تھے، اسی طرح سے ان کی آئندہ زندگی گزرنے والی تھی۔ میں نے ان سب کو مارشلنگ یارڈ کی پٹریوں پر شنٹ کیے جاتے مال گاڑی کے ڈبوں کی طرح دیکھا، الگ الگ سمتوں سے آتے ہوئے، گھڑگھڑا کر آگے بڑھتے اور ایک طے شدہ مقام پر پھر الگ ہو کر کسی اور طے شدہ مقام پر پہنچتے ہوئے...

جناردھن کے قصبہ چھوڑ کر جانے کی خبر پاتے ہی بنیے کی بیوی کو بہت دکھ ہوگا۔

اس نے جناردھن کے بارے میں کچھ غلط تصورات باندھ رکھے تھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کی بے بسی اور اکیلے پن کا وہ ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے اور اس بات پر وہ اندر ہی اندر اس سے نفرت کرتی تھی۔ اس کے باوجود وہ ناچار اس سے کچھ دیر رک جانے کی منت بھی کیا کرتی۔

اس نے کئی بار اپنے شوہر سے اپنی اس بے بسی کا ذکر کیا تھا۔ لیکن اس نے ہنس کر اڑا دیا تھا۔

اس کے خیال میں جنارد ھن سیٹھ جیسا ہی آدمی تھا، اور وہ اپنے خیال بدلنے کو تیار نہ تھا۔

لیکن سیٹھ کی بیوی کو یہ بات تسلیم نہ تھی۔ جنارد ھن سے کترانے کے لیے ہی تو وہ اپنی دکان سے [illegible] پانی کے جلوس سے نکل آ گئی تھی۔ سیٹھ دکان کے دروازے میں ہی بیٹھا تھا۔ اسے تیوہار منانے کا [illegible] شوق نہ تھا اور قصبے کی اس مقدس [illegible] بیوی [illegible] کوئی کام بھی نہ تھا۔ اپنی بیوی کو جلوس سے نکل کر واپس آتے دیکھ کر اسے کوئی حیرت نہ ہوئی۔ [illegible] خریداری کے [illegible] رہتا تھا۔ وہ نکلنے کا سوچ ہی رہا تھا۔ اس کی بیوی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں [illegible]۔ اب وہ آفت ٹل چکی تھی۔

[illegible] کے جانے کے بعد نانی [illegible] ہو گیا، وہ ڈر کے مارے کانپنے لگی۔ اس نے [illegible] کی طرح دکان کے تختے بند کیے۔ انھیں [illegible] اپنی جگہ لگاتے ہوئے وہ سخت گھبراہٹ کے عالم میں تھی۔ اندر [illegible] کر اندھیرے میں [illegible] ہانپنے لگی۔

اور باہر سے جنارد ھن نے آواز دی: "کون ہے؟ کون ہے گھر میں؟ بھابی! او بھابی! ہم گھر میں [illegible]…"

"[illegible] چونک گئی۔ [illegible] آیا ہے؟" [illegible] نے کچھ جواب نہ دیا۔ جنارد ھن باہر سے پکار رہا تھا، "او بھابی! ہم [illegible] میں ہیں [illegible] دکان کے تختے تو کھولو!"

"نہیں!" اس نے اندر سے چیخ [illegible] "[illegible] لوٹ جاؤ!"

تھوڑی دیر تک اسے باہر سے جنارد ھن کی آواز آتی رہی۔ پھر اس کے جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ [illegible] جس وقت وہاں [illegible] اس وقت اس کے چہرے پر یہ تاثر رہا ہو [illegible] کہ اگر مسلمان یہاں [illegible] تو میں اس دکان کے تختے سے سر ٹکرا کر جان دے دوں [illegible] جنارد ھن یہاں نہیں۔

لیکن مسلمان وہاں نہیں آئے۔ اور نہ اس نے پھر جنارد ھن کو دیکھا۔ رات بہت دیر گئے جب [illegible] آیا تو [illegible] اس نے دروازہ کھولا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ آنے والا اس کا شوہر ہی ہے تب وہ [illegible]۔ [illegible] لیکن اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ [illegible] اس کی بیوی کو حیرت ہوئی۔ اس نے اسے جنارد ھن کے آنے کے بارے میں بتایا۔ لیکن اس نے [illegible] اسے محسوس ہوا کہ اس نے [illegible] جنارد ھن کے ساتھ اس کا برتاؤ اچھا نہیں لگا۔

سوچنے لگی کہ کہیں اس سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی۔ اسے اپنے شوہر پر غصہ آنے لگا۔

جنار دھن نے اگلے دن اپنی دکان نہ کھولی۔ وہ دن میں کئی بار اس بند جھونپڑی سے نکلے باہر نکلی، لیکن وہ اسے وہاں دکھائی نہ دیا۔ دوسرا دن گزر گیا۔ تین چار دن بیت گئے لیکن جنار دھن اپنی دکان پر نہ آیا۔

اور پھر ایک دن اچانک اسے خبر ملی کہ وہ بمبئی چلا گیا ہے۔ وہ سوچنے لگی کہ جنار دھن نے اس کے برتاؤ کا اتنا برا کیوں مانا؟ کیا اتنی بار جنار دھن کو اپنی طرف تکتے پا کر اس نے ناگواری ظاہر نہیں کی تھی؟ جب وہ اس کی صحبت کی خواہش مند نہ تھی تب کیا وہ ڈھٹائی سے اس کے آس پاس نہیں منڈلاتا رہتا تھا؟ اس کے شوہر کے لوٹ آنے پر وہ رکنے کی راہ نہ دیکھتے ہوئے خود ہی وہاں سے چلا نہیں جاتا تھا؟ اُس دن بھی وہ اسی طرح رک جاتا۔ باہر، اوسارے میں۔ وہ خود سے پوچھنے لگی کہ اسے جنار دھن کے برتاؤ میں اپنے لیے خواہش کیوں محسوس ہوئی؟ اسے رکنے کے لیے کہہ دینے بھر سے اس کی خواہش پوری ہو جاتی۔ کچھ لوگوں کا پریم کرنے کا ڈھنگ بھی عجیب ہوتا ہے۔ جنار دھن کا پریم کرنے کا طریقہ بھی عجیب تھا۔ پھر میں نے اس کا دل کیوں دکھایا؟

اس کے سات آٹھ دن بعد بنیا اسے دکان بند کرنے کا اپنا فیصلہ اسے سنائے گا۔ وہ صدمہ سہہ لے گی۔ پہلے کی طرح اس کی مخالفت نہیں کرے گی۔ اسے یہ قصبہ چھوڑنا شاق گزرے گا، لیکن یہاں کے تناؤ بھرے ماحول نے اسے سیانا کر دیا ہوگا۔ اور یہ حالت تب تک رہے، کوئی نہیں کہہ پائے گا۔ آج کل دکان پر ایک پیسے کی بھی بکری نہیں ہو رہی۔ اسے خوب معلوم ہوگا کہ ایسے حالات میں اس کا شوہر اپنے فیصلے کی مخالفت برداشت نہیں کرے گا۔

اور ایک دن، منھ اندھیرے، وہ دونوں میاں بیوی اپنا سامان سمیٹ کر ٹرک میں سوار ہوں گے اور کسی اور گاؤں چلے جائیں گے۔ ٹرک اسٹارٹ ہوتے ہی وہ بے چینی سے جنار دھن کی دکان کی طرف دیکھے گی۔ لیکن اندھیرے میں وہ ٹھیک سے دیکھ نہیں پائے گی۔

پھر رفتہ رفتہ قصبے کی زندگی معمول پر آ جائے گی۔ ہسپتال میں پڑا ہوا زخمی کلواڑی ٹھیک ہو کر گھر لوٹ آئے گا۔ پولیس دکھائی دینا بند ہو جائے گی۔ گاؤں کے ہر شخص کے چہرے پر دکھائی دینے والا

خوف دھیرے دھیرے غائب ہو جائے گا۔ لیکن کلواڑی غصے میں اندر ہی اندر جلتے رہیں گے۔ ان کو احساس ہوتا رہے گا کہ اپنی توہین اور گاؤں میں ہونے والی مارکاٹ کا بدلہ وہ نہیں لے پائے۔ مگر ابھی کچھ کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ کلواڑی یہ دیکھ کر کہ مسلمان ابھی چوکنے ہیں اور سرکار بھی مستعد ہے۔ فی الحال چپ بیٹھ جائیں گے۔ وہ اتنی ہوشیاری کا مظاہرہ ضرور کریں گے کہ اپنے بچھائے ہوئے جال میں خود ہی نہ پھنس جائیں۔ یوں بھی سرکار نے کچھ مسلمانوں پر مقدمہ تو قائم کر ہی دیا تھا۔ کلواڑیوں کا دھیان اس پر لگا رہے گا کہ اس مقدمے کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

لیکن مقدمہ اتنی جلدی ختم ہونے والا نہیں۔ اس کی تاریخوں پر تاریخیں پڑتی جائیں گی۔ پولیس تفتیش کے لیے گاؤں کے چکر کاٹنے لگے گی۔ سدام کی بہو، بھابی، سب کے بیان لیے جائیں گے۔ بہو، وہ پولیس کو حملہ کرنے اور فساد برپا کرنے والوں کے نام بتانے سے قاصر رہیں گی۔ وہ لوگ قصبے کے نہیں تھے، وہ قصبے کے مسلمانوں کے کہنے پر آئے تھے، وہ بس اتنا ہی بتا پائیں گی۔

اور بھابی بیان دیتے ہوئے عین وقت پر بوکھلا جائے گی۔ وہ سوچے گی، میں کس کے خلاف گواہی دے رہی ہوں؟ اپنے شوہر کے خلاف؟ اس کا منھ بند رہے گا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر التجا کرے گی، "میں نے کچھ نہیں دیکھا۔" پھر اگلے کئی دنوں تک گھر میں بے چین گھومتی رہے گی۔

مقدمے کی تفتیش کے سلسلے میں ایک دن انسپکٹر بھزملکر قصبے میں آئیں گے۔ ان کے ساتھ ان کے [illegible] ہوں گے۔ سرکار مقدمہ واپس لینے پر غور کرے گی۔ اسے دونوں فریقوں میں دوبارہ امن اور ہم آہنگی قائم ہونے کی خواہش ہوگی۔ اس مقصد سے آخری تفتیش کرنے کا کام انسپکٹر بھزملکر کو سونپا گیا ہوگا۔

انسپکٹر بھزملکر کو سرکار کا یہ موقف قبول نہیں ہوگا۔ ان کی سوچی سمجھی رائے ہوگی کہ فرقہ وارانہ فسادات میں ہونے والے جرائم کو باقی جرائم سے الگ سمجھنے کی سرکاری پالیسی خطرناک ہے۔ اس مسئلے میں سخت انداز سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ ہندو مسلم بھائی بھائی کا نعرہ بے معنی ہے۔ یہ مسلمان بھائی بننے والے نہیں ہیں۔ ان کو خوب دبا کر قابو میں رکھنا چاہیے، یا پھر پاکستان بھیج دینا چاہیے۔ لیکن ہماری سرکار تو احمق ہے، وہ تو صرف مقدمہ واپس لینے کی بات کرے گی!

Scanned with CamScanner

انسپکٹر بھڑ کمکر کے بارے میں مسلمانوں کی رائے پہلے ہی خراب ہے۔ اس لیے ان کا تفتیش کے لیے آنا انھیں ناگوار ہوگا۔ ان کو یقین ہوگا کہ یہ شخص مقدمہ واپس لینے کے خلاف سفارش کرے گا۔ لیکن انسپکٹر بھڑ کمکر کی مانگی ہوئی تمام اطلاعات وہ انھیں فراہم کریں گے۔ بھڑ کمکر اسحٰق کے گھر جائیں گے۔ وہاں لکشمی کے پورے قصے کی جگالی کی جائے گی۔ وہاں سے وہ ہمارے گھر آئیں گے۔ بابا کو دیکھتے ہی وہ چونک پڑیں گے۔ وہ بابا سے پوچھیں گے، ''کیا آپ نے مجھے پہچانا؟''

بابا انھیں پہچان نہیں پائیں گے۔ وہ آنکھیں سکیڑ کر، ماتھے پر ہاتھ کا چھجا بنا کر دیکھیں گے اور نفی میں سر ہلا دیں گے۔

''ہم ۱۹۴۷ء میں ملے تھے،'' بھڑ کمکر کہیں گے۔ ''اُس وقت میں یہاں سب انسپکٹر تھا۔''

''ہاں ہاں ..'' بابا تب بھی انھیں نہیں پہچانیں گے۔

''تب یہاں ماپاری مسجد کے پاس فساد ہوا تھا۔ آپ بھی امن کمیٹی کے رکن تھے۔ آپ نے مجھے مسجد میں جانے سے روکا تھا۔''

''ہاں... ہاں۔ میں نے آپ کو جوتے پہن کر اندر جانے سے منع کیا تھا۔ اب مجھے یاد آ گیا۔ اب آپ انسپکٹر ہو گئے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''واہ وا! بیٹھیے۔ چائے پیجیے،'' بابا کہیں گے، اور وہیں سے بھابی کو چائے بنانے کے لیے آواز دیں گے۔

''پندرہ سال گزر گئے، اور یہاں پھر فساد ہو گیا۔ ہے نا؟''

''سو تو ہے۔''

''لیکن کیسے ہوا؟ اُس وقت آپ مسلم لیگ میں تھے۔ آپ کے پاس ہندوستان کا ایک نقشہ بھی ہوتا تھا۔ یاد ہے؟ اسے کھولنے پر ہندوستان دکھائی دیتا تھا۔ تہہ کرنے پر آپ کے جناح صاحب گھوڑے پر بیٹھے پورے ہندوستان کو روندتے ہوئے نظر آتے تھے۔ یاد ہے آپ کو؟''

''اب اس کو یاد کرنے سے کیا فائدہ؟''

''کیوں نہیں؟ تب آپ کہا کرتے تھے پاکستان مل جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر

تو ایک طرف رہیں اور مسلمان دوسری طرف۔ تو پھر دلی کی حالت بھی بیان نہیں کر سکے گا۔"

"اصل میں ایسا نہیں ہوا،" بابا کہنے لگے۔ "جناح صاحب سے چوک ہی ہو گئی۔"

"چوک؟ کیسی چوک؟" بھز ملکر حیران ہو کر پوچھیں گے۔

"نہیں بالکل الگ پاکستان مانگنا ہی نہیں چاہیے تھا،" بابا ان کو اپنا خیال سمجھانے لگیں گے۔ "انھیں ہندوستان کے ساتھ رہتے ہوئے تعلق ضرور رکھنا چاہیے تھا۔ پھر ایسے حالات نہ ہوتے۔ جناح صاحب تھے بڑے ہوشیار۔ لیکن ان سے بھول ہو گئی۔"

"یہ دو قومی نظریہ ان کا،" بھز ملکر پوچھیں گے، "مگر ہیں، آپ ہی نے تو ان کا ساتھ دیا تھا نا؟"

"ہاں، دیا تھا۔ پھر کیا؟ یہ سوچ کر دیا تھا کہ وہ ہمارا بھلا کریں گے۔ لیکن کیا انھیں معلوم نہیں تھا کہ ہم ان پر بھروسہ کرتے ہیں؟ وہ لیڈر تھے۔ کیا ہمیں سدھارنا ان کا کام نہیں تھا؟"

یہ سن کر بھز ملکر ذرا کھل کر ہنسیں گے۔ پھر پوچھیں گے، "اچھا تو ان سے چوک ہو گئی، ہے نا؟"

"ہاں، اور کیا۔"

"کیا آپ بھی یہی سمجھتے ہیں؟"

"اور نہیں تو کیا؟ یہ کہنے میں کیا مجھے آپ کے باپ کا ڈر ہے؟"

"نہیں نہیں۔ آپ کہاں کسی سے ڈرنے والے۔"

"جیسے جب جیونے آپ کو گھر میں بند کر کے مارا تھا، تب مسلمانوں کے غصے کی پروا نہ کرتے ہوئے میں نے ہی آپ کی مدد کو دوڑا تھا نا؟ اور کسی کی ہمت نہ ہوتی۔"

وہ ان باتوں سے اس وقت کا ذکر بھز ملکر دو چھیڑیں گے کا۔ اس سے انھیں تکلیف ہو گی، غصہ آئے گا۔ لیکن بابا کا مقصد کسی پر احسان جتانا یا رعب ڈالنا نہیں ہوگا۔ بھز ملکر سوچنے لگیں گے کہ اگر اس وقت بابا نہ آتے تو کیا ہوتا۔ کیا وہ جیونے کے گھر ہی میں مر کر گل سڑ جاتے؟ یا باقی مسلمان وہاں گھس کر انھیں مار دیتے؟ تب ان کو ٹیس لگ گیا تھا۔ وہ اسی ٹیس میں ماپاری مسجد کی تلاشی لینے پہنچے تھے۔ بابا نے ان کا راستہ روکا تھا۔ اس وقت وہ اتنے بوڑھے نہیں لگتے تھے جتنے اب۔ "صاحب انسپکٹر صاحب، پیچھے ہٹ جائیے۔ پہلے اپنے جوتے اتاریے، پھر اندر جائیے۔ یہ مسجد ہے۔"

بھز ملکر نے ان کی بات تسلیم کی تھی۔ بابا کی شائستگی کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی تھی۔ بھز ملکر

نے جوتے اتار کر مسجد کی تلاشی لی۔ لیکن اندر چندو کہیں نہیں ملا۔ باہر آنے کے بعد انھوں نے بابا سے پوچھا، "آپ کون ہیں؟"

"میں؟ میں امن کمیٹی کا ممبر ہوں،" انھوں نے پہلے جیسے کڑے لہجے میں جواب دیا۔ ان سے زیادہ بات چیت نہ کرتے ہوئے بھڑ لکر نے جینو کے گھر کا رخ کیا۔

انھیں پہلے سے شک تھا کہ جینو ہی اصل مجرم ہے۔ وہ دروازے ہی میں بیٹھا تھا۔ بھڑ لکر کو آتے دیکھ کر اسے ذرا بھی تعجب نہ ہوا۔ جیسے وہ انھیں کی راہ دیکھ رہا تھا۔ اس سے کچھ کہے بغیر وہ اس کے گھر میں داخل ہونے لگے۔

جینو اپنی جگہ سے اٹھا۔ بھڑ لکر کی طرف مڑ کر بولا، "سب انسپکٹر صاحب، اس طرح گھر میں نہ گھسیے۔ کچھ معلوم کرنا ہو تو مجھ سے پوچھیے۔"

"یو شٹ اپ!" بھڑ لکر نے چیخ کر کہا۔ "مجھے تمھارے گھر کی تلاشی لینی ہے۔" اور وہ اندر جانے لگے۔

"اندر عورتیں ہیں۔ ہماری عورتیں پردہ نشین ہیں۔ پرائے مردوں کے سامنے نہیں آتیں۔ آپ ذرا ٹھہریے، میں انھیں ایک طرف ہو جانے کو کہتا ہوں..."

لیکن بھڑ لکر اس کی بات سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔ برآمدے کے بند دروازے پر لات مار کر انھوں نے اندر کے کمرے میں قدم رکھا۔ اندر عورتیں سانپ دیکھتے ہی پھڑ پھڑا کر بھاگنے والی مرغیوں کی طرح ادھر ادھر دوڑنے لگیں۔ جس دروازے سے بھڑ لکر اندر آئے تھے وہ اسی سے دوڑتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ اس کمرے سے وہ اور اندر گئے۔ ایک ایک کمرے، ایک ایک کوٹھری کی تلاشی لی۔

اس مکان کے اندر بہت اندھیرا تھا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے، اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ چولھے کے پاس پہنچے تو پچھلا دروازہ بند ہونے کی آواز انھیں سنائی دی۔ وہ پیچھے مڑے۔ پیچھے جینو کھڑا تھا۔ اس نے باورچی خانے کے دروازے کو بند کر کے اندر سے چٹخنی لگائی تھی۔

"اب آپ ہو اور میں ہوں..." یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔ اس نے ایک زور کا گھونسا بھڑ لکر کے بائیں گال پر مارا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ترمرے ناچ گئے۔ اس نے انھیں جوابی وار کرنے کا موقع نہیں دیا۔ گھونسے پر گھونسا مارنے لگا۔ بھڑ لکر کو محسوس ہوا کہ ان کے سارے دانت ٹوٹ کر باہر آ

Scanned with CamScanner

جائیں گے۔ انھیں اپنی زبان پر خون کا کسیلا ذائقہ محسوس ہوا۔ انھیں چکر آ گیا۔ لیکن جینو نے انھیں ایک ہاتھ سے تھام کر دوسرے سے گھونسے مارنے کا کام جاری رکھا۔ آخر وہ گر پڑے۔ بابا وہاں کب داخل ہوئے، ان کو معلوم نہیں ہوا۔ لیکن جب انھوں نے کسی سے بھڑ کمکر کو لے جانے کے لیے کہا تب ان کی آواز انھوں نے پہچان لی۔ باہر مسلمانوں کا بڑا سا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ بابا نے ان سے کہا، ''میں امن کمیٹی کا ممبر ہوں۔ انسپکٹر کی جان کا ذمہ مجھ پر ہے۔ وہ اپنی ڈیوٹی کرنے آیا تھا۔ مجھے اس کو صحیح سلامت واپس پہنچانا ہے۔ خبردار جو کسی نے اس پر ہاتھ اٹھایا!''

اور تب بھڑ کمکر اس یاد سے جاگیں گے۔ اس اثنا میں سامنے رکھ دی جانے والی چائے کی پیالی اٹھائیں گے اور ہنس کر کہیں گے، ''اُس دن آپ کی وجہ سے میری جان بچی۔''

''میری وجہ سے نہیں!'' بابا کہیں گے، اور آسمان کی طرف انگلی اٹھائیں گے۔

''ہاں ہاں، بے شک!'' وہ جواب دیں گے۔ پھر کچھ اور معلومات دریافت کریں گے۔ اس کے بعد تفتیش کے لیے اور کسی جگہ نہیں جائیں گے۔ وہاں سے سیدھے کلواڑیوں کی بستی کی طرف رخ کریں گے۔

کوئی نہیں جان سکے گا کہ بھڑ کمکر نے سرکار کو کس قسم کی رپورٹ دی۔ لیکن کچھ دن بعد سرکار تمام مقدمے واپس لے لے گی اور اُس دن اتحق پورے گاؤں کی دعوت کرے گا۔

اس کی کیپ ٹاؤن واپس جانے کی میعاد ختم ہونے پر آ رہی ہوگی۔ جلد ہی وہ چلا جائے گا۔ جانے سے پہلے وہ بابا سے ملنے آئے گا۔ یوں تو وہ پورے قصبے میں لوگوں سے رخصت ہوتا ہوا گھومے گا۔ وہ اپنی جاں پہچان کے کلواڑیوں اور یودھوں سے بھی ملنا چاہے گا، لیکن یہ بھانپ کر کہ ان میں سے کوئی اس سے بات کرنے کا روادار نہیں ہے، وہ ان کے پاس نہیں جائے گا۔ اسے کم سے کم لکشمی کا حال جاننے کی تو ضرور خواہش ہوگی، لیکن وہ یہ جان نہیں پائے گا کہ وہ کہاں ہے۔ بابا اس سے پوچھیں گے، ''اب کب آؤ گے؟''

''آؤں گا، آؤں گا، جلدی ہی آؤں گا...''

''اور آؤ گے تو شادی نہیں کرو گے؟''

"شادی اب میں وہیں کروں گا۔ قصبے کی لڑکی مجھے نہیں چاہیے۔ وہاں اپنے لوگوں میں کئی شادی کے قابل لڑکیاں ہیں۔۔"

"بہت اچھا... بہت اچھا... شادی کے بعد بیوی کو بھی ساتھ لے کر آنا۔"

"انشاءاللہ۔"

"تو ٹھیک ہے...."

"سلام علیکم۔"

"وعلیکم سلام۔"

...پھر گرمی پہلے سے کہیں زیادہ شدید محسوس ہونے لگے گی۔ بوائی کا وقت قریب آجائے گا۔ آسمان میں تمام دن بادل تیرنے لگیں گے۔ وہ زمین کی بھاپ کو بیچ ہی میں روک لیں گے اور گرمی سے لوگوں کا جی گھبرانے لگے گا۔ برسات کو نزدیک پاکر لوگ لکڑیاں کاٹنے، بازار سے سودا لاکر گھر میں رکھنے اور طویلوں کے فرش تیار کرنے جیسے سب کام جلدی جلدی نمٹانے لگیں گے۔ جلد ہی دھان کی بوائی کی تیاری شروع ہو جائے گی۔

بودھ رفتہ رفتہ مسلمانوں کے محلے میں کام پر آنے لگیں گے۔ تائی اپنا بلوتا وصول کرنے کے لیے زمینداروں کے گھروں میں جھانکنے لگیں گے اور ان کی حجامت کا کام پھر شروع کر دیں گے۔ ہر بار اؤ ہچکچاتا ہوا پھر قادر خان کی دکان پر آکر بیٹھنے لگے گا۔ لیکن مسلمانوں کو خیال آئے گا کہ صرف دھوبن ہے جواب تک وہاں نہیں آرہی، اور وہ کہیں گے: "اس کو اب تک کس چیز کا غصہ ہے، یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس رانڈ سے کہنا، سامنے کھانا ہوتے ہوئے بھی کیوں بھوکوں مرنا چاہتی ہے۔ دھلائی کا کام کرے اور اپنے دام لے۔" دو چار لوگ اسے بلاوا بھی بھیجیں گے۔ وہ جواب بھجوائے گی کہ آتی ہوں، لیکن آنے کی ہمت نہیں کر پائے گی۔

وہ زمینداروں سے ڈرتی رہے گی۔ اُس رات کے تجربے سے وہ اب تک سنبھل نہیں پائی ہو گی۔ وہ لوگ کون تھے، یہ وہ اب تک نہیں جان پائی ہو گی۔ وہ اس پر ٹڈی دل کی طرح حملہ آور ہوئے تھے۔ اُس زور زبردستی اور کھینچا تانی سے اس کے حواس اب تک بحال نہیں ہوئے ہوں گے۔ مسلمانوں

سے محلے میں جانے سے پہلے اس کا دل آمادہ نہیں ہوگا۔ لیکن یہ سن کر کہ بودھو اور تائی وہاں جاتے تھے تب اسے بھی وہاں جانے کا خیال آئے گا۔ ایک دن وہ اٹھ کر سیدھے نالی واڑے کو پار کر کے مسلمانوں کے محلے کی طرف جانے لگے گی۔

راستے میں اسے مائیں اپنے آنگنوں میں بیٹھی دکھائی دیں گی۔ وہ کچھ دیر رکے گی۔ ان سے رسمی حال احوال کے چار لفظ بولے گی۔ کوئی ان سے پوچھے گا: "کہاں جا رہی ہو؟"

"کھانا وصول کرنے۔" وہ جواب دے کر ان عورتوں کی طرف دیکھنے لگے گی۔ لیکن ان کے چہروں پر پہلے جیسی تحقیر اسے نہیں دکھائی دے گی۔ اسے اطمینان ہوگا۔ کوئی عورت کہے گی، "جاؤ کھانا وصول کرو۔ میرے گھر والے نے تو کب کا لے بھی لیا۔"

"وہ کام بھی کرنے لگا؟"

"ہاں۔ وہ پھیرے کرنے لگے ہیں۔ روز روز بازار کے کتنے چکر لگاتے۔"

"تم بھی کام لانا شروع کر دو۔" ان میں سے ایک اسے صلاح دے گی۔ "غرض دونوں کو ہوتی ہے۔ انہیں کام کی جستجو پیدا کی۔"

وہ ماؤں کی طرف ایک بار پھر غور سے دیکھے گی۔ اسے لگے گا کہ وہ یہ سب باتیں سنجیدگی سے کر رہی ہیں۔ وہ صدام کی بہو کو دیکھنے جائے گی۔ اسے اس میں حیرت انگیز تبدیلی محسوس ہوگی۔ پہلے وہ زیادہ تر کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ اور بولتی بھی تو اپنے ہی بارے میں بولتی تھی۔ دھوبن کو احساس ہوگا کہ دوسروں کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اسے خیال آئے گا کہ اب اس کی چیخیں بھی سنائی نہیں دیتیں۔ اس کو پچھتاوا ہونے لگے گا کہ ان عورتوں کے ڈر سے وہ اتنے دن بے کار گھر بیٹھی رہی۔ وہ تیز تیز قدم رکھتی ہوئی مسلمانوں کے محلے کی طرف چل دے گی۔ دن بھر گھر گھر سے بلوے کے چاول جمع کرے گی۔ جتنا چاول وہ ایک پھیرے میں گھر نہیں لا پائے گی۔ اس کے لیے اسے تین چار چکر کاٹنے پڑیں گے۔ ساتھ میں دھلائی کے لیے کپڑوں کی گٹھریاں بھی لائے گی۔

اس رات، بہت دنوں کے بعد، وہ اپنے گھر کا سامنے والا دروازہ پورا کھول کر رکھے گی۔

صدام کی بہو ایک دن مسلمانوں کے محلے کے کنویں میں کود کر جان دے دے گی۔ وہ رات کے

Scanned with CamScanner

وقت گھر سے بھاگتی ہوئی نکلے گی اور سدام بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہوا آئے گا۔ لیکن وہ اس کے ہاتھ نہیں آئے گی۔ بہت دیر تک کوئی نہیں جان پائے گا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر جب سدام چیخ کر اس کے پیچھے بھاگنے لگے گا تو لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس کی بہو گھر سے بھاگ نکلی ہے۔

رات کا وقت ہوتے ہوئے بھی تب زمین سے گرم بھاپ اٹھ رہی ہوگی۔ مسلمان کھانا کھا کر ہوا خوری کے لیے اپنے اپنے آنگن میں آ گئے ہوں گے۔ سدام زور زور سے چیختا ہوا مسلمانوں کے محلے میں آئے گا اور اپنی بہو کو ڈھونڈنے لگے گا۔ لیکن اسے کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔ وہ پورے محلے کا چکر کاٹے گا۔ تب کوئی اسے سمجھا بجھا کر واپس بھیجے گا، ''آ جائے گی۔ جائے گی کہاں؟'' سدام گھر لوٹ کر رات بھر دروازہ کھولے بیٹھا رہے گا۔ لیکن اس کی بہو واپس نہیں لوٹے گی۔

پھر صبح ہوتے ہی قادر خان کا لڑکا اسے بلانے آئے گا۔ وہ ڈرتا ڈرتا اس سے کہے گا، ''بابا تم کو بلا رہے ہیں۔'' وہ سدام کی طرف دیکھنے سے کترائے گا۔ سدام کا اپنی جگہ سے اٹھنے کو بھی جی نہیں چاہے گا۔ نیند سے بھاری آنکھیں کھول کر وہ بیٹھے بیٹھے پوچھے گا، ''کیوں رے بابا ۔''

قادر خان کے لڑکے کے لیے یہ بالکل غیر متوقع سوال ہوگا۔ وہ چڑ کر جواب دے گا، ''تمھاری کم بختی آ گئی ہے، اس لیے...''

سدام اسے کوئی جواب نہیں دے گا۔ قادر خان کا لڑکا یہ سوچ کر اپنی زبان چبائے گا کہ اسے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ پھر وہ دھیرے سے سدام کو سنائی دینے والی آواز میں بتائے گا، ''تمھاری بہو کنویں میں کود گئی ہے۔''

''ارے یہ کب ہوا بابا، یہ کب ہوا؟'' سدام عام سے لہجے میں کہے گا۔ اس بھیانک خبر کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر ہوگا جیسے اسے پہلے سے معلوم تھا کہ اس کی بہو کا آخر کار یہی انجام ہونا تھا۔

قادر خان کا لڑکا کہے گا، ''مجھے نہیں پتا۔ بابا نے صبح ہی لاش دیکھی۔ سب لوگ وہیں جمع ہیں۔''

سدام جیسے تیسے اٹھ کر کھڑا ہوگا۔ پھر وہ کسی عورت کی طرح گلا پھاڑ کر رونے لگے گا۔ نائی واڑے کے مرد اور عورتیں باہر نکل آئیں گی۔ یہ خبر پاتے ہی سب کنویں کی طرف لپکیں گے۔ ان میں سے کوئی سدام کو بھی کھینچ لے جائے گا۔ ان کے پیچھے قادر خان کا لڑکا سہما ہوا سا چل رہا ہوگا۔

کنویں پر بہت بڑا مجمع اکٹھا ہو چکا ہوگا۔ مسلمان اب تک اس کی لاش باہر نکال چکے ہوں گے۔ گرمی کی وجہ سے کنویں میں پانی کم ہوگا۔ وہ گندہ ہو جائے گا۔ اس لیے مسلمان عورتیں ہمیشہ کی طرح پانی بھرنے اس کنویں پر نہیں آئیں گی۔ قریب ایک فرلانگ دور دوسرے کنویں کا رخ کریں گی۔ اس کنویں پر کلواڑی پانی بھرتے ہیں۔ مسلمان عورتوں کو پانی بھرنے آتے دیکھ کر کلواڑنیں انھیں راستہ دینے کے لیے کچھ بولے بغیر ایک طرف ہو جائیں گی۔

سدام بہو کی لاش کے پاس زور زور سے دہاڑیں مار کر رونے لگے گا۔ لیکن کسی اور کو اس کے مرنے کا کوئی خاص دکھ نہیں ہوگا۔ کوئی جا کر پولیس کو اطلاع دے گا۔ پولیس کے آنے تک لوگ سدام کا رونا دھونا خاموشی سے سنتے رہیں گے۔ پھر ایک ایک کر کے جانے لگیں گے۔ پولیس کے سامنے کوئی شخص سدام کی بہو کی چیخوں کا ذکر نہیں کرے گا، اور پولیس خودکشی کو موت کی وجہ قرار دے کر معاملے پر مہر لگا دے گی۔

اس حادثے سے سدام آخر پاگل ہو جائے گا۔ وہ تمام دن اپنے برآمدے میں بیٹھا رہا کرے گا۔ رات کو دروازہ کھول کر اندر کے کمرے میں جا بیٹھا کرے گا۔ بہو کو زور زور سے پکارتا رہے گا۔ لیکن اس کے چلانے پر کوئی اتنا دھیان نہیں دے گا جتنا اس کی بہو کی چیخوں کو دیا جاتا تھا۔

سدام کی بہو کے کود کر جان دینے کی وجہ سے مسلمان کچھ دن تک اس کنویں کا پانی استعمال نہیں کریں گے۔ پانی نہ نکالے جانے کی وجہ سے کنویں میں پانی کی سطح اونچی ہو جائے گی۔ اس پر کائی جمنے لگے گی۔ اور فرلانگ بھر دور جا کر پانی لانے سے ان کی عورتیں بیزار ہو جائیں گی۔ آخر یہ سوچ کر کہ برسات سر پر آ گئی ہے، مسلمان ایک رات اس کنویں کی پوری طرح صفائی کریں گے۔ اس کی تہہ کی گاد نکالیں گے۔ پھر پوٹاشیم پرمیگنیٹ ڈالیں گے۔ ایک دن تک پانی بڑھنے دیں گے، اور دوسرے دن سے اس کنویں کا پانی پھر سے استعمال کرنے لگیں گے۔

اور پھر ایک دن بارش ہوگی۔ واششٹھی ندی کے پاٹ کو دھنک جیسا خم دار بنانے والی پہاڑی بارش کی سفید چادر سے ڈھک جائے گی۔ جوار پر آئی ہوئی ندی پر بارش کی بوچھاریں پڑنے سے پانی میں لہریں اٹھنے لگیں گی۔ آسمان میں تیرتی دھول بارش کے ساتھ نیچے اتر کر پانی میں گھل جائے گی۔ پیڑ

اور جھاڑیاں جیسے کینچلی بدل کر پھر سے نئی اور ہری بھری دکھائی دینے لگیں گی۔ گیلی زمین سے کچھ دیر تک پانی کی بھاپ نکلتی رہے گی۔ پھر زمین ٹھنڈی ہو جائے گی۔ دھیرے دھیرے ہوا میں بھی ٹھنڈک آئے گی۔ ایسی بارش روز ہونے لگے گی۔ پوری وادی ہری بھری دکھنے لگے گی۔ لوگ وال[۱۷] کے نرم دانے چننے کھیتوں میں جانے لگیں گے... اور اچانک ایک دن لکشمی بھی کہیں سے آ کر ان میں شامل ہو جائے گی۔

صرف سمتی اور جنار دھن کہیں نہیں ہوں گے۔

لیکن سمتی پانچ چھ مہینے بعد مجھے بمبئی میں ملے گی۔ وہ میرا پتا ڈھونڈتی ہوئی میرے گھر آئے گی۔ اب تک اس کی شادی ہو چکی ہوگی۔ اس کا شوہر بھی اس کے ساتھ ہوگا۔ وہ غالباً کہیں کلرکی کرتا ہوگا۔ وہ مجھ سے اس کا رسمی تعارف کرائے گی اور پھر بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرنے لگے گی۔ وہ ہماری باتوں میں شریک نہیں ہوگا۔ خاموشی سے سنتا رہے گا۔ وہ مجھ سے ہمارے گھر کا حال چال دریافت کرے گی۔ قصبے کی خبریں معلوم کرے گی۔ وہ پہلے کے سے کھلے پن سے بولتی رہے گی۔ اس کا شوہر اسے بیچ میں روک کر چلنے کے لیے کہے گا۔ لیکن وہ اس پر دھیان نہیں دے گی۔ جب وہ بار بار اس سے اٹھنے کا تقاضا کرے گا تو وہ ناچار جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی۔ وہ مڑ کر چلنے لگے گی۔ لیکن اس کے قدم سست پڑ جائیں گے۔ مجھے محسوس ہوگا کہ وہ مجھ سے اور باتیں کرنا چاہتی ہے۔ لیکن وہ ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھنے کے بعد تیز تیز قدم اٹھاتی وہاں سے چلی جائے گی۔

اور میں سوچنے لگوں گا کہ وہ دروازے تک پہنچ کر کیوں رک گئی تھی۔ وہ مجھے کیا بتانا چاہتی ہے؟ کیا شوہر کے ساتھ ہونے کی وجہ سے وہ کچھ کہہ نہ پائی؟ کہیں وہ بعد میں اکیلی یہاں آنے کا ارادہ تو نہیں کر رہی؟ اس کے اور میرے سمبندھ کی پار نہ ہو سکنے والی لکشمن ریکھا سے اس کے دل میں جو آگ اب بھی خاموشی سے سلگ رہی ہے، کیا وہ مجھے اس کا احساس دلانے کے لیے مجھ سے دوبارہ ملنا چاہتی ہے؟

ایک بار جب میں قصبے کے پل پر بیٹھا تھا تب وہ مجھے غیر معمولی طور پر حسین معلوم ہوئی تھی۔

۱۷۔ وال سفید چکنے چھلکوں والی پھلیاں، جنھیں پاپڈ بھی کہا جاتا ہے۔

ہمارے بیچ کی لکشمن ریکھ پار کر پانے کا وہی ایک لمحہ تھا۔ وہ پل یونہی گزر گیا، اس کا مجھے احساس ہوا تھا۔ لیکن اب میں اس لمحے کے احساس سے دور رہنے کا خواہش مند ہوں۔ اور میری حد تک یہ کہانی وہیں ختم ہو جائے گی۔

❁ ❁

آج کی کتابیں

آئینہ حیرت
اور دوسری تحریریں
سید رفیق حسین
Rs 375

اس نظم میں
میراجی
Rs 225

ہندی کہانیاں - ۱
انتخاب اور ترتیب
اجمل کمال
Rs 180

ایرانی کہانیاں
انتخاب اور ترجمہ
نیر مسعود
Rs 90

ہندی کہانیاں - ۲
انتخاب اور ترتیب
اجمل کمال
Rs 180

نربدا
اور دوسری نظمیں
اسد محمد خاں
Rs 180

ہندی کہانیاں - ۳
انتخاب اور ترتیب
اجمل کمال
Rs 180

قرۃ العین حیدر کے خطوط
ایک دوست کے نام
خالد حسن
Rs 180

عربی کہانیاں
انتخاب اور ترجمہ
اجمل کمال
Rs 180

شب نامہ
اور دوسری نظمیں
ذی شان ساحل
Rs 150

خطِ مرموز
(کہانیاں)
نعیمہ دریاض
Rs. 100

ای میل
اور دوسری نظمیں
ذی شان ساحل
Rs 150

نیر مسعود

آزاریان

میرے کمرے کے باہر کوئی چیز جل رہی تھی۔ پھر لڑکوں کی آوازیں آئیں

''دیکھو دیکھو، ہاتھی بن گیا ہے۔''

''ایک نہیں، دو دو ہیں۔''

پھر ماچس جلانے کی آواز اور بارود جلنے کی خوشبو آئی، اس وقت مجھے وہ خوشبو ہی معلوم ہوتی تھی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد لڑکوں کی آوازیں پھر آئیں۔

''یہ کیا بنا ہے؟''

''دیکھتے رہو۔''

''پھول معلوم ہو رہا ہے۔''

''نہیں، پھول نہیں ہے۔''

''تو پھر... افوہ، یہ تو...''

پھر سب کے ہنسنے کی آواز آئی۔ سب میرے ہم عمر لڑکے تھے۔ میں ان کی آوازیں سن سن کر بے چین ہو رہا تھا لیکن کمرے سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ بستر سے اٹھنے کی طاقت ہی نہیں تھی۔ مجھ کو ایک مہینے سے میعادی بخار آ رہا تھا۔ لڑکے کمرے کے اندر آگ نہیں جلا سکتے تھے بلکہ کمرے کے اندر آ بھی نہیں سکتے تھے۔ ان کی آوازیں دن بھر مجھ تک پہنچا کرتی تھیں اور میں ان آوازوں سے اندازہ لگانے کی کوشش کرتا تھا کہ باہر کون کون سے کھیل کھیلے جا رہے ہیں

یہ میری سب سے بڑی بہن کی شادی کا زمانہ تھا۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ دن دن بھر عورتیں گاتی بجاتی رہتی تھیں۔ لڑکوں کی ٹولی الگ ہنگامہ مچائے رکھتی تھی۔ بخار کی وجہ سے دوڑ دھوپ کے کھیلوں کو میرا جی نہیں چاہتا تھا، اتنا دم ہی نہیں تھا، لیکن آتش بازی کا مجھے بہت شوق تھا۔ اور آتش بازی اس وقت گھر میں دن بھر چھڑائی جاتی تھی، کبھی میرے کمرے کے قریب، کبھی دور پر صحن میں۔

بیماری کے شروع زمانے میں بہن ہی میری دیکھ بھال کرتی تھی۔ میرے سارے کام اس نے اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ دوا پلانا، ہاتھ منھ دھلانا، کپڑے بدلنا اور سب سے بڑھ کر میرے غصے، سنبھالنا، جو پہلے بھی مجھے بہت آتا تھا، اسی کا کام تھا۔ وہ میرے ہی کمرے میں سوتی اور رات کو کئی کئی بار اٹھ کر مجھے دیکھتی تھی۔ لیکن شادی کے دن قریب آئے تو اس کو ایک کوٹھری میں بٹھا دیا گیا جہاں دوسری لڑکیاں اسے گھیرے رہتی تھیں۔ میں نے کئی دن سے اسے نہیں دیکھا تھا۔ یہاں تک کہ شادی کا دن آ گیا۔ اس دن میری طبیعت اور بگڑ گئی تھی۔ غفلت سی طاری رہتی اور ہوشیار ہوتا تو بڑی بے چینی ہونے لگتی تھی۔ آخر مجھے نیند لانے والی دوا دے کر سلا دیا گیا۔ برات کا آنا، نکاح ہونا، دلھن کا رخصت ہونا، یہ سب ہو گیا اور میں سوتا رہا۔ جانے سے پہلے وہ اپنے دولھا کے ساتھ مجھے دیکھنے آئی تھی اور میرے پلنگ کی پٹی پکڑے دیر تک روتی رہی تھی۔

اس کے بعد میری طبیعت اور بگڑ گئی۔ کئی معالج بدلے گئے، کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بیماری کو چالیس دن سے اوپر ہو گئے۔ ماں باپ پہلے ہی میری صحت سے مایوس تھے، اب مجھ کو بھی یقین ہو گیا کہ میں مر رہا ہوں۔ پڑا ہوا اپنی موت کا تصور کرتا اور زمین کے اندر دفن کر دیے جانے کے خیال سے وحشت کھایا کرتا تھا۔ کبھی عجیب عجیب وصیتیں کرنے لگتا جو مجھ کو اب ٹھیک سے یاد نہیں۔

ڈاکٹر کو، جو میرا آخری معالج تھا، میں نے اسی زمانے میں دیکھا تھا۔ میرے رشتے کے ایک چچا سے اس کی دوستی بلکہ بے تکلفی تھی۔ چچا گھڑ دوڑ کے شوقین تھے اور اس میں اپنی خاصی دولت ضائع کر چکے تھے۔ ڈاکٹر کو غالباً گھڑ دوڑ سے دلچسپی تھی، اس کا کوئی گھوڑا بھی ریس میں دوڑتا تھا۔ چچا کے اصرار پر جب میرے باپ نے مجھے دیکھنے کے لیے اس کو بلانے کا ارادہ ظاہر کیا تو میری ماں کچھ تذبذب کے ساتھ بولیں

"وہ تو مسخرے سے ہیں۔ مریض کو دیکھتے ہیں، ادھر ادھر کی باتیں زیادہ کرتے ہیں۔

''سب سنی سنائی باتیں ہیں۔ آخر دکھانے میں کیا حرج ہے۔ ان کی بھی دوا دے کر دیکھ لیں۔ تم جو کچھ کر رہی ہو، وہ بھی کرتی رہنا۔''

میری ماں طبیبوں سے مایوس ہو کر سب ٹونے ٹوٹکوں پر اتر آئی تھیں اور ان کا خیال تھا کہ ان سے مجھے کچھ فائدہ بھی ہو رہا ہے۔ بہرحال ڈاکٹر کو دکھانے کا فیصلہ ہو گیا، اور چچا جا کر اسے بلا لائے۔

ڈاکٹر کی آواز مکان کے باہر ہی سے آنے لگی تھی۔ وہ چچا کے ساتھ گھر کے اندر آیا، وہ ان سے کسی سیاسی مسئلے پر گفتگو کر رہا تھا۔ گھر کے سب لوگ میرے کمرے میں جمع تھے۔ ڈاکٹر وہیں لایا گیا۔ سیاسی گفتگو ختم کر کے اس نے کمرے میں موجود لوگوں پر ایک نظر ڈالی۔ میں پلنگ پر چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ اس نے مجھ پر بھی سرسری نظر ڈالی۔ ایک بار پھر سب لوگوں کو نظر بھر کر دیکھا، اور پوچھا

''ہاں بھئی، مریض کہاں ہے؟''

چچا نے میری طرف اشارہ کیا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور بولا

''کیوں بھیا، لیٹے کیوں ہو؟ کھانے کھیلنے کے دن ہیں، جاؤ پتنگ اڑاؤ۔ ہم جب تمہارے اتنے تھے...''

کچھ دیر تک وہ اسی طرح کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے سنجیدہ ہو کر میرا معائنہ کیا۔ زبان دیکھی، سینہ دیکھنے کے لیے میری قمیص اوپر کی تو تعویذوں پر نظر پڑی۔ میرے باپ نے معذرت کے انداز میں کہا

''ان کی اماں کو ان چیزوں پر بڑا اعتقاد ہے۔''

''ہماری اماں کو بھی تھا۔ یہ دیکھیے''، اس نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر سبز غلاف والا ایک تعویذ نکالا اور اسے چوم لیا، ''لیکن بیگم صاحب سے کہیے دوا نہ چھوڑیں۔''

میرے باپ اسے میرا حال بتانے لگے جو اس نے ٹھیک سے سنا بھی نہیں۔ وہ نسخہ لکھتا اور علاج سے متعلق ہدایتیں دیتا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا اور مجھ سے کہنے لگا

''اب کوئی شعر یاد ہو تو سنائیے۔''

مجھ کو شعر شاعری سے بچکانی دلچسپی تھی۔ میں نے اسے کوئی الٹا سیدھا شعر سنا دیا اور وہ اس کی

تعریف کرتا ہوا چلا گیا۔

اس کے بعد سے میں نے ڈاکٹر کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کی دواؤں سے مجھے فائدہ ہوا اور میں ٹھیک ہو گیا۔ ان دواؤں میں لال رنگ کا ایک مکسچر اور اس کا ذائقہ مجھے یاد رہ گیا کیونکہ میرا خیال تھا اسی مکسچر کی وجہ سے میں تندرست ہوا ہوں۔

بہن کی شادی مجھے آج تک یاد ہے، اس لیے کہ اس کے رخصت ہونے کے بعد ہی اس کی سسرال اور ہمارے گھرانے میں کچھ باتوں پر ایسی نااتفاقی ہو گئی کہ دونوں خاندانوں نے ایک دوسرے سے کوئی مطلب نہ رکھنے کی قسم کھالی تھی اور اس پر اس قدر سختی سے قائم رہے کہ میرے باپ اور ماں کے مرنے پر بھی وہاں سے کوئی نہیں آیا۔ میری بہن کو بھی نہیں آنے دیا گیا اور حالانکہ وہ میرے ہی شہر میں رہتی تھی، میں نے اپنی بیماری کے دنوں کے بعد سے اس کو نہیں دیکھا تھا اور اب تو اس کی صورت بھی میرے ذہن میں نہیں تھی۔ لیکن اس کی شادی کا زمانہ کبھی کبھی مجھے یاد آتا تھا اور اس کے ساتھ ہی اپنی بیماری، اور ڈاکٹر، اور اس کا مکسچر بھی یاد آتا تھا۔

گھڑ دوڑ والے چچا سے اب بھی میں ملتا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد، جب تک میں اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو گیا وہ ایک طرح سے میرے سرپرست تھے۔ میں ان سے اب تک بہت مانوس تھا۔ وہ بوڑھے سنک گئے تھے اور مجھ سے اس طرح بات کرنے لگے تھے جیسے میں ان کا ہم عمر دوست ہوں۔ میں بھی ان سے ہر طرح کی باتیں کر لیتا تھا۔ انھیں بہت کم دکھائی دینے لگا تھا اور وہ گھر پر پڑے پڑے حراب ہو رہے تھے اس لیے میں ہفتے میں کم سے کم ایک بار ان کے یہاں جاتا اور انھیں لے کر باہر نکلتا تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر چلتے اور راستے بھر خوب چہک چہک کر باتیں کرتے تھے۔ مگر اب نہیں لوگوں کے نام یاد نہیں رہتے تھے۔ گفتگو میں کسی کا ذکر کرتے تو "اُس" اور "وہ" سے کام چلاتے تھے، اس لیے ان کا مطلب سمجھنے میں دقت ہوتی تھی۔ ان کو واپس گھر پہنچا کر میں پھر آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوتا۔ اس وقت وہ مجھ کو بہت دعائیں دیتے، اور یہ مجھے اچھا معلوم ہوتا تھا۔

شروع جاڑے کا زمانہ تھا اور چچا پر سردی کا اثر ہو گیا تھا۔ لیکن جب میں ان کے یہاں پہنچا تو وہ ٹوپی لگائے، چھڑی لیے میرا انتظار کر رہے تھے۔ اس دن میں ان کو برتنوں کے بازار کی طرف لے

گیا۔ بازار ایک لمبی گلی میں تھا۔ یہ شہر میں برتنوں کا سب سے بڑا بازار تھا اور ایک چوڑی سڑک کے متوازی دور تک چلا گیا تھا۔ کچھ کچھ دور پر کوئی پتلی سی گلی اس بازار سے کٹتی اور چوڑی سڑک سے مل جاتی تھی۔ اس وقت بھی یہاں بڑے پتیلوں اور دیگوں اور دوسرے برتنوں کی تیاری ہو رہی تھی۔ ٹھونکنے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تیار برتنوں پر قلعی ہو رہی تھی۔ جگہ جگہ قلعی گروں کی بھٹیاں جل رہی تھیں اور ان کی وجہ سے اُس سایہ دار گلی میں گرمی پھیلی ہوئی تھی۔

چچا نے چلتے چلتے ٹھٹھک کر کہا:

''اماں، یہ کہاں لے آئے؟''

میں نے انھیں بازار کا نام بتا دیا اور کہا:

''سڑک پر سردی زیادہ ہے۔''

وہ کچھ دیر میرا ہاتھ پکڑے خاموشی سے چلتے رہے۔ پھر انھوں نے چہکنا شروع کیا۔ اپنی جوانی کے زمانے کی فلم ایکٹرسوں اور ان کی مشہور فلموں کا ذکر کرتے رہے۔ کچھ بڑے کھلاڑیوں کے قصے سنائے۔ برتن ٹھونکنے کی آوازوں میں ان کی آواز ٹھیک سے سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن یہ سب قصے وہ مجھے پہلے بھی کئی بار بتا چکے تھے اس لیے میں چپ چاپ ان کو ساتھ لیے چلتا رہا۔ اب انھوں نے ایک کھلاڑی کا قصہ چھیڑ دیا جو میں نے ان سے اب تک نہیں سنا تھا۔ یہ قصہ وہ بڑے جوش کے ساتھ سنا رہے تھے، شاید اس لیے کہ اس کھلاڑی کے کئی گھوڑے ریس میں دوڑتے تھے۔ قصہ سناتے سناتے وہ ایک بار پھر ٹھٹھک گئے اور اپنی کمزور آنکھوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ پھر بولے

''یار، وہ بھی یہیں رہتا ہے۔ بائیں طرف والی گلی میں مڑو۔''

''ادھر بائیں طرف کوئی گلی نہیں ہے۔''

''ہے کیوں نہیں۔ ٹھیک سے دیکھو۔''

''داہنی طرف گلیاں دکھائی دے رہی ہیں، بائیں طرف تو۔۔''

''کیا بات کر رہے ہو،'' انھوں نے کہا، ''ابھی جب میں اس کے جہیز کے لیے برتن دیکھنے آیا تھا، تب بھی۔ نہیں اس کے بہت دن بعد بھی ادھر آیا تھا، تب واپسی میں اُس کے مطلب پر رکا تھا۔ برتن کی سب سے بڑی دکان سے ملی ہوئی گلی تھی۔''

معاملہ میری سمجھ میں آ گیا۔ میں نے کہا

"چچا، آنکھوں کے ساتھ آپ کا دماغ بھی جواب دے رہا ہے۔ ابھی ہم واپس نہیں ہو رہے ہیں، اور بڑی دکان پیچھے رہ گئی ہے۔ اس کے پاس گلی بھی ہے۔ اور وہ بائیں طرف نہیں، داہنی طرف ہے۔"

چچا کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، لیکن انھوں نے کچھ بگڑ کر کہا

"میرا دماغ ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"کیا ٹھیک ٹھاک ہے،" میں نے ہنس کر کہا، "آپ کو یہی پتا نہیں کہ آ رہے ہیں یا جا رہے ہیں۔"

"خیر خیر، چلو واپس چلو۔"

ہم واپس ہوئے۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں نے کہا

"لیجیے، بڑی دکان آ گئی۔"

"ٹھیک ہے، اب داہنی طرف مڑو۔"

"داہنی طرف نہیں، بائیں طرف چچا،" میں نے کہا اور گلی میں داخل ہو گیا۔

"یہاں ڈاکٹر کا سائن بورڈ دیکھو۔"

میں نے پوچھا

"داہنی طرف یا بائیں طرف؟"

"اماں یار، کیوں وقت کر رہے ہو۔"

گلی کے خاتمے کے قریب، جہاں سے چوڑی سڑک صاف دکھائی دے رہی تھی، ایک دو منزلہ مکان پر ڈاکٹر کے نام کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس سے ملا ہوا ایک نیا صاف ستھرا مطب تھا۔ اس مطب کے سامنے کا رخ چوڑی سڑک پر تھا۔ میں نے سڑک سے آتے جاتے میں اس کو اکثر دیکھا تھا۔ چچا نے بھی مطب کو دیکھ لیا اور چہک کر بولے

"یہی ہے۔"

ہم سامنے کے رخ پر آ گئے۔ میں نے باہر سے مطب کے اندر دیکھا اور آہستہ سے چچا کو بتایا

''کوئی جوان سے ڈاکٹر ہیں۔''

''بیٹا ہوگا،'' چچا نے بھی دھیرے سے کہا، ''چلو پوچھے لیتے ہیں۔'' اور مجھ سے ہاتھ چھڑا کر مطب کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔

ڈاکٹر نے مریضوں کے گھیرے سے سر اٹھا کر چچا کو دیکھا، کچھ تامل کیا، پھر غور سے دیکھا اور شناش ہو کر کہا:

''ارے، انکل؟ آیئے آیئے۔''

''تم ٹھیک ہو بیٹا؟'' چچا نے اس کے قریب جاتے ہوئے کہا، ''ہمارا دوست اب یہاں نہیں بیٹھتا؟''

ڈاکٹر نے مطب کے پیچھے اشارہ کیا

''وہ وہاں بیٹھتے ہیں۔ ملاقات کے کمرے میں۔ آپ کیسے ہیں؟''

''کیا حال ہے اس کا؟''

''ٹھیک ہیں، کچھ دن سے آپ کو یاد کر رہے تھے۔ اور بتایئے، آپ کیسے ہیں؟'

''بس، اس کا خیال آ گیا۔ سوچا ملتا چلوں۔ تم بیٹھو۔''

چچا نے ڈاکٹر کو کھڑے ہونے سے روکا۔ پلٹ کر میرا ہاتھ پکڑا اور ہم دو منزلہ مکان کے دروازے پر آ گئے۔ میں نے دستک دینے کے لیے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا، لیکن چچا نے مجھے روک دیا اور خود دروازے پر دستک دی، پہلے ایک بار، پھر تین بار، اور ذرا سا وقفہ دے کر پھر پہلے ایک بار، پھر تین بار۔

جواب میں کچھ دیر خاموشی رہی، پھر آواز سنائی دی

''ارے، یہ کون آج رستہ بھول گیا،'' آواز چند لمحوں کے لیے رک کر پھر آئی، ''آؤ آؤ، آ جاؤ یار۔''

چچا نے کچھ فخر کے انداز میں میری طرف دیکھا اور ہم ڈیوڑھی کے اندر دروازے سے ملے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر سامنے ہی آرام کرسی پر سے اٹھ رہا تھا۔ میں اتنے دن بعد اسے کیا پہچانتا، اور اب تو اس کے چہرے پر داڑھی بھی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ چچا کی طرف پھیلا

دیے۔ چچا مجھ سے ہاتھ چھڑا کر لپکے اور ڈاکٹر پر قریب قریب گر پڑے۔ دیر تک دونوں خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کو پکڑے ہوئے کھڑے رہے اور میں ایک کنارے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ آرام کرسی سے ملا ہوا ایک تخت بھی بچھا ہوا تھا لیکن وہ کمرہ مطب ہی معلوم ہو رہا تھا۔ مریضوں کے معائنے والی ایک پتلی لمبی میز تھی، دیوار پر دبیز کاغذ کی بڑی سی رنگین تصویر لگی ہوئی تھی جس میں انسانی بدن کے اندرونی حصے دکھائے گئے تھے۔ تصویر کے رنگ مدھم پڑ چکے تھے۔ ایک الماری تھی جس میں سے انگریزی دواؤں کی ملی جلی خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے اس مکسچر کی خوشبو کو فوراً پہچان لیا جو میرے لڑکپن میں ڈاکٹر کے یہاں سے آتا تھا۔ مجھے اس کا ذائقہ بھی محسوس ہونے لگا جو خوشبو سے کچھ کچھ مختلف تھا۔ پھر میں نے مڑ کر ان دونوں کو دیکھا۔ اب وہ الگ ہو چکے تھے۔ چچی تخت پر بیٹھ گئے تھے۔ ڈاکٹر آرام کرسی پر ان کی طرف جھکا ہوا بیٹھا تھا اور دونوں چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد مجھے محسوس ہونے لگا کہ وہ میری موجودگی کی وجہ سے کھل کر باتیں نہیں کر رہے ہیں۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چچا اور ڈاکٹر دونوں نے میری طرف دیکھا۔ ڈاکٹر نے کہا

''بھائی، تھوڑی دیر تو بیٹھنے دو۔''

چچا بولے:

''ہاں، اور نہیں تو کیا۔''

''جا نہیں رہا ہوں،'' میں نے کہا، ''ذرا بازار دیکھ لوں۔ آپ اطمینان سے بیٹھیے۔''

باہر نکل کر میں اسی گلی کے ایک چھوٹے سے چائے خانے میں بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا ڈاکٹر کے پاس اب بھی کچھ مریض آتے ہیں، ان میں بوڑھے زیادہ تھے کچھ برقع پوش عورتیں بھی تھیں۔ ایک عورت کے ساتھ بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا بھی تھا۔ وہ دیر سے مطب کے اندر تھے۔ میں دونوں کے باہر آنے کا انتظار کرتا رہا۔ آخر کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ چچا دیر سے گھر کے باہر تھے۔ ان کو واپس لے جانے کا وقت آ گیا تھا بلکہ گذر بھی گیا تھا اور اب ان کے سونے کا وقت تھا۔ عورت اور لڑکا ابھی مطب سے نہیں نکلے تھے لیکن میں اٹھا، ہوٹل والے کو چائے کے پیسے دیے۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوا اور خاموشی سے مطب میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ چچا تخت پر دیوار کی طرف منھ کیے ہوئے لیٹے تھے اور شاید

Scanned with CamScanner

سو گئے تھے۔ برقع پوش عورت میز پر پیر لٹکائے ہوئے بیٹھی تھی، لڑکا پاس ہی کھڑا تھا۔ ڈاکٹر اب آرام کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھ میں لکڑی کے تختے پر لگے ایک کاغذ پر کچھ لکھتا ہوا وہ واقعی ڈاکٹر معلوم ہو رہا تھا۔ عورت نے اس سے کہا:

''ڈاکٹر صاحب، ایک مہینے کی دوا لکھ دیجیے۔ بار بار آنا بہت مشکل ہوتا ہے۔''

میں چونک پڑا۔ یہ بالکل میری ماں کا لہجہ تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھنا چاہا لیکن اس نے نقاب سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔

کیا یہ میری بہن ہے؟ میں نے سوچا، پھر لڑکے کی طرف دیکھا تو اس میں مجھے اپنے لڑکپن کی شباہت کا وہم سا ہوا۔ میرا دماغ سنسنانے لگا۔ اسی وقت ڈاکٹر نے کاغذ تختے سے کھینچ کر اس کی طرف بڑھایا اور کہا

''پندرہ دن کی ہے۔ پندرہ دن بعد اس کے ہاتھ حال کہلا دینا۔'' اس نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔

میں بڑھ کر چچا کے پاس پہنچا اور ان کا شانہ ہلانے لگا۔ وہ گہری نیند سو رہے تھے، مشکل سے جاگے۔

''اماں تم نے جگا دیا،'' وہ اب بھی اونگھ رہے تھے، ''ہم اپنے ڈاکٹر کے پاس گئے ہوئے تھے۔''

ڈاکٹر اتنے زور سے ہنسا کہ اسے کھانسی آ گئی۔ کچھ دیر کھانسنے کے بعد بولا:

''اب بھی اسی طرح کے خواب دیکھتے ہو۔''

چچا کی نیند غائب ہو گئی تھی۔ وہ بھی ہنسنے لگے۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا:

''یہ ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھے بیٹھے سو جاتا تھا اور خواب میں دیکھتا کہ ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ ایک بار تو اس نے حد کر دی۔ ہم لوگ دریا کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے...''

''چھوڑ دیار، دل نہ دکھاؤ،'' چچا نے اس کی بات کاٹ دی اور تخت سے اترنے لگے۔

میں نے مڑ کر میز کی طرف دیکھا۔ عورت اور لڑکا مطب سے جا چکے تھے۔ چچا اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر سے چپکے چپکے کچھ باتیں کیں، پھر اداس ہو گئے۔

ڈاکٹر نے آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے ان سے، پھر مجھ سے مصافحہ کیا۔ چچا نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم

آہستہ آہستہ چلتے ہوئے باہر آ گئے۔ گلی میں بھیڑ بڑھ گئی تھی، چوڑی سڑک پر اس سے بھی زیادہ بھیڑ تھی۔ میں نے واپسی کے لیے سڑک ہی کا انتخاب کیا۔ سڑک پار کرنے کے لیے ہم تھوڑا رکے۔ چچا نے شاید اپنے آپ سے کہا:

''اب بھی مریض آتے ہیں اس کے پاس۔''

میں نے انھیں بتایا کہ آخر میں جو عورت آئی تھی وہ شاید میری بہن تھی۔ چچا کچھ نہیں بولے۔ میں نے پھر کہا۔

''چچا، وہ عورت شاید میری بہن تھی۔''

''تمھاری بہن تھی؟'' چچا بولے، ''اب تم بھی خواب دیکھنے لگے؟''

اس کے بعد وہ بالکل خاموش ہو گئے اور ہم نے سڑک پار کر لی۔

**

نیر مسعود

دُنبالہ گرد

۱

وہ شہر سے ذرا ہٹ کر گھنے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ اس کے پیچھے لمبا سا میدان تھا جس کی زمین ہموار کر دی گئی تھی۔ اصل میں یہاں ریلوے لائن بچھنے والی تھی اور اس کے لیے زمین برابر کی جا رہی تھی لیکن بعد میں وہ لائن کسی اور طرف بچھائی گئی اور یہ میدان یوں ہی پڑا رہ گیا۔ میدان سڑک پر سے نظر نہیں آتا تھا۔ وہاں سے صرف بے ترتیب جنگلی جھاڑیاں دکھائی دیتی تھیں۔ ان کے بعد ذرا بلند اور ناہموار زمین کا قطعہ تھا جس کے پیچھے درختوں کے جھنڈ کا صرف اوپری حصہ جھانکتا تھا۔ سڑک پر سے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ درخت قریب قریب لگے ہوئے ہیں یا دور دور، نہ یہ سمجھ میں آتا تھا کہ درختوں کا سلسلہ کہاں تک گیا ہے۔

ایک دن، جب میں اُدھر سے گذر رہا تھا، مجھے تجسس ہوا کہ اس جھنڈ کو دیکھوں۔ اس دن جھنڈ میں پہنچ کر مجھ کو یہ بے رونق میدان نظر آیا۔ ادھر کوئی نہیں آتا تھا۔ کم سے کم میرا خیال یہی تھا، اس لیے مجھ کو یہ جگہ چہل قدمی کے لیے پسند آئی تھی۔ خود چہل قدمی مجھے پسند نہیں تھی، لیکن شبہ کیا گیا تھا کہ میرے دل میں کوئی خرابی پیدا ہو رہی ہے جس کو روکنے کے لیے مجھ کو سویرے سویرے ذرا تیز قدموں سے چلنا بتایا گیا تھا۔ دل کی بیماری سے اس وقت میں ڈرتا تھا۔ مجھے اچانک مر جانے کے تصور سے وحشت ہوتی تھی اور اپنے بچپن کے ایک بزرگ کا قول بار بار یاد آتا تھا۔ ان کو اچانک مرنے کے بہت سے واقعے معلوم تھے، مثلاً ایک صاحب بیٹے کی برات لے کر روانہ ہو رہے تھے۔ براتیوں کو انھوں نے جلدی

کر کے گاڑیوں پر سوار کرایا۔ آخر میں خود سوار ہونے کے لیے پیر اٹھایا اور گر کر مر گئے۔ برات گاڑیوں سے اتر پڑی اور ان صاحب کے آخری انتظام شروع ہو گئے۔ بزرگ اس طرح کے واقعے مزے لے کر بیان کرتے تھے لیکن بیان کرنے کے بعد بڑے غصے کے لہجے میں یہ ضرور کہتے تھے:

"اے صاحب، یہ بے ہنگام مرنا کیسا؟"

ایک اور صاحب کا واقعہ بھی بہت بیان کرتے تھے

"اُن کی بیٹی کا رشتہ لے کر باہر سے مہمان آ رہے تھے۔ یہ ان کے انتظار میں پھاٹک پر کھڑے اخبار پڑھ رہے تھے۔ گھر کے اندر عزیز رشتے دار جمع تھے۔ دعوت کا انتظام ہو رہا تھا۔ مہمان آ پہنچے۔ یہ ان کا استقبال کرنے بڑھ رہے تھے کہ لڑکھڑائے، اخبار ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ مہمانوں نے لپک کر ان کو سنبھالا، مگر وہ دوسری دنیا میں پہنچ چکے تھے۔ لیجیے جناب، کیسا رشتہ، کہاں کی دعوت۔ مہمان جو مٹھائی لے کر آئے تھے، وہ ان کے سامان ہی میں بندھی رہ گئی۔ بے چارے ان کے کفن دفن میں شریک ہو کر واپس چلے گئے۔" اور پھر وہی:

"اے صاحب، یہ بے ہنگام مرنا کیسا؟"

اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر بے ہنگام موت کا ذمہ دار مرنے والے کو ٹھہرا رہے ہیں۔ ان بزرگ کی باتوں کو سن کر بچپن ہی سے مجھے اچانک مرنے کا خیال برا معلوم ہوتا تھا اور اس میں طرح طرح کی قباحتیں نظر آتی تھیں۔ اس لیے میں نے سویرے چہل قدمی کا مشورہ مان لیا تھا۔ شہر کے اندر کی سیر گاہوں میں مجمع بہت رہتا تھا۔ میں نے کسی ویران مقام کی تلاش شروع کر دی۔ اس تلاش میں بھی میں اچھا خاصا چل لیتا تھا۔ اس تلاش میں مجھے جھنڈ کے پیچھے یہ میدان ملا تھا۔ اخیر جاڑوں کی سخت سردی کا زمانہ تھا۔ میں گرم کپڑوں میں خود کو لپیٹ کر صبح سویرے نکل جاتا تھا اور میدان میں کہیں تیز قدموں سے، کہیں آہستہ آہستہ چلتا تھا۔ لیکن سردیاں ختم ہوتے ہوتے میں نے دیکھا کہ وہاں بھی بہت سے لوگ آنے لگے ہیں۔ ان میں بوڑھے زیادہ تھے۔ کئی لوگ تو تقریباً دوڑ کر چلتے تھے، کچھ دھیرے دھیرے اور لڑکھڑاتے ہوئے چلتے تھے۔ ان کو دوسرے لوگ سواریوں پر پہنچاتے تھے اور میدان میں ان کو چھوڑ کر خود آرام سے بیٹھے رہتے تھے۔ پھر ان کو سوار کرا کے واپس لے جاتے تھے۔ مجھے اس مجمعے کے ساتھ اپنا ہونا گوارا نہیں تھا لیکن اس میدان کے سوا کوئی اور مناسب جگہ میرے علم میں نہیں تھی۔ ناچار

میں نے اس رات کے آخری حصے میں، جب ابھی اندھیرا پھیلا ہوتا، وہاں جانا شروع کیا۔ اس میں میری نیند خراب ہوتی تھی لیکن میدان مجھے خالی مل جاتا تھا اور دوسرے لوگوں کے آنے سے پہلے ہی میری واپسی کا وقت آ جاتا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میں وہاں تنہا ہوتا ہوں لیکن کبھی کبھی مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ درختوں کے جھنڈ میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ یہ مجھ کو اپنا وہم معلوم ہوتا تھا لیکن ایک دن میں نے اسے دیکھ لیا۔ اس دن مجھے واپسی میں دیر ہو گئی تھی اور صبح کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ وہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا اور میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ دوسرے لوگوں کے آنے کا وقت قریب تھا، اس لیے میں اس کو غور سے دیکھے بغیر جھنڈ سے نکل کر شاہراہ پر آ گیا۔ اس کے بعد کئی بار میں نے اس کو دیکھا، جھنڈ کے مشرقی کنارے پر، اسی درخت کے نیچے اور گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے ہوئے۔ اندھیرے میں وہ ایک خیالی صورت کی طرح نظر آتا تھا اور میں محض اندازے سے سمجھ لیتا تھا کہ وہ بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے کبھی اسے میدان میں ٹہلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ نہ وہ کبھی میری طرف متوجہ ہوا تھا۔

ایک دن میں جھنڈ میں سے ہوتا ہوا واپس جا رہا تھا کہ اس کی آواز سنائی دی۔ میں رک گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ میں اس کے قریب آ گیا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہاں درد ہو رہا ہے،'' اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

اس نے درد کی جگہ کی طرف اشارہ بھی کیا ہوگا، لیکن اندھیرے میں مجھے ٹھیک سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ گرا پڑ رہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اُسے سنبھالا اور درخت کے تنے سے ٹکا کر بٹھا دیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، اس لیے چپ چاپ اس کے قریب کھڑا رہا۔ شاید دیر تک میں اس کے پاس کھڑا رہا، یہاں تک کہ صبح کی روشنی پھیل گئی اور دوسرے لوگوں کا آنا بڑھ گیا۔ روشنی میں اس نے مجھے دیکھا اور دھیرے سے میرا نام لیا۔

''تم؟'' اس نے کہا، ''یہ تم ہو؟''

میں نے بھی اسے غور سے دیکھا۔ وہ میرے دفتر کا کوئی پرانا ساتھی تھا۔ لیکن کس دفتر کا؟ میں نے شروع میں کئی دفتروں میں کچھ کچھ دن عارضی طور پر کام کیا تھا اور اب مجھے وہ سب دفتر بھی یاد نہیں

تھے، نہ ان دفتروں کے کسی ساتھی کا نام یاد تھا۔ وہ انھی دفتروں میں سے کسی میں کام کرتا تھا۔ اس کے کاندھے سے ایک چوکور تھیلا لٹکا رہتا تھا۔ تھیلا اب بھی اس کے کاندھے سے لٹکا ہوا تھا، اور اسی کی وجہ سے وہ مجھے یاد آ گیا تھا۔ وہ مجھ سے پہلے سے اس دفتر میں کام کر رہا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ دفتری معاملات میں میری مدد بھی کی تھی۔ اس کا نام چھوٹا سا تھا۔ لیکن اب نہ اس کا نام مجھے یاد آ رہا تھا، نہ یہ کہ وہ کس دفتر میں میرے ساتھ تھا۔ اس سے میرے زیادہ مراسم نہیں تھے۔ میں ہر دفتر میں اپنے ہم عمروں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا، وہ مجھ سے بڑا تھا اور مجھ کو غالباً غیر دلچسپ معلوم ہوتا تھا۔

''تم یہاں کیوں آنے لگے؟'' اس نے پوچھا۔

''دل،'' میں نے کہا، ''مجھے سویرے چہل قدمی بتائی گئی ہے۔ اور آپ؟ آپ کو کیا ہوا ہے؟''

''دھواں،'' اس نے کہا، ''میرے مکان کے آس پاس ہوٹل بہت ہیں۔ رات رہے سے ان کی بھٹیاں سلگائی جاتی ہیں۔ ان کا دھواں میرے لیے، مطلب میرے پھیپھڑوں کے لیے، زہر ہے۔''

''بھٹیاں تو دن بھر جلتی رہتی ہیں۔''

''دن بھر میں باہر رہتا ہوں۔'' وہ رکا، پھر بولا، ''نہیں، دن بھر تو وہ جلتی رہتی ہیں۔ لیکن جب سلگائی جاتی ہیں تو...''

اچانک اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ اس نے کھڑے ہو کر تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نکالنے کی کوشش کی۔ پھر تھیلا مجھے پکڑا کر دہرا ہو گیا۔

''کسی اور کو بھی بلا لو،'' اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا اور زمین پر بیٹھ گیا۔

میں نے درختوں کے جھنڈ میں سے نکل کر ادھر اُدھر دیکھا۔ میدان میں اب کئی بوڑھے ٹہل رہے تھے لیکن مجھے وہ سب خود مدد کے محتاج معلوم ہوئے۔ میں میدان کے دور کے حصوں تک گیا۔ وہاں بھی کچھ بوڑھے لڑکھڑاتے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ ان کے مددگار بھی ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے دیر تک ان میں سے ایک ایک کو غور سے دیکھا لیکن مجھے محسوس ہوا کہ وہ اپنے اپنے بوڑھے کی جلد ہی واپسی کے منتظر ہیں اس لیے میں نے ان سے کچھ نہیں کہا اور مایوس ہو کر درختوں کے جھنڈ میں واپس آ گیا۔ مجھے یاد نہیں آیا کہ میرا دفتری ساتھی کس درخت کے نیچے تھا۔ میں نے آس پاس کے درختوں کے نیچے دیکھ لیا۔ اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ میں نے شاہراہ سے میدان کو آنے والی کچی سڑک کے

داہنے بائیں نظر دوڑائی۔ پھر شاہراہ پر آکر اپنے مکان کی طرف چلا۔ راستے بھر مجھے یقین رہا کہ وہ کہیں نہ کہیں دھیرے دھیرے چلتا ہوا، یا کھڑا ہوا، یا بیٹھا ہوا، یا پڑا ہوا مل جائے گا۔ لیکن وہ کسی بھی حالت میں نہیں ملا اور میں اپنے گھر پہنچ گیا۔

گھر پر جب میں کپڑے تبدیل کر رہا تھا تو میں نے دیکھا اس کا تھیلا اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔

۲

کئی دن تک میں میدان کے آس پاس اور شاہراہ سے کٹنے والے دوسرے راستوں پر اسے تلاش کرتا رہا۔ دو تین بار جھنڈ کے قریب آنے پر مجھے شبہ ہوا کہ وہ اندھیرے میں کسی درخت کے نیچے موجود ہے لیکن جب میں وہاں پہنچا تو درخت کے نیچے صرف پتیوں سے ڈھکی ہوئی اوس تھی۔ اپنے پرانے دفتروں میں سے جو مجھے یاد رہ گئے تھے، میں نے ان میں بھی جانے کا ارادہ کیا اور دو دفتروں میں گیا بھی، لیکن میں نے وہاں صرف دو دو چار چار مہینے کام کیا تھا۔ سب ان میں نہ کوئی میرا جاننے والا تھا نہ میں کسی کو جانتا تھا، نہ میری سمجھ میں یہ آیا کہ اپنے اس ساتھی کے بارے میں کس طرح دریافت کروں جس کا مجھے نہ نام یاد تھا نہ عہدہ۔ آخر میں ادھر اُدھر کی باتیں پوچھ کر چلا آیا اور دفتروں میں اسے تلاش کرنے کے خیال سے درگذرا۔

وہ اب میدان کی طرف نہیں جاتا تھا۔ کم سے کم اس وقت نہیں جاتا تھا جب میں وہاں ہوتا تھا۔ اس طرح اس کو ڈھونڈھ نکالنے کی میری کوششیں بے کار گئیں اور اس کا عجیب نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے میدان میں جانا چھوڑ دیا۔ اسی کیفیت میں ایک دن میری نظر اس کے تھیلے پر پڑ گئی جو میرے کپڑوں کی الماری میں رکھا رہ گیا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر تعجب ہوا کہ ابھی تک مجھ کو تھیلے کے سامان کا جائزہ لینے اس کے مالک کا پتا چلانے کا خیال نہیں آیا تھا۔ میں نے بڑے تجسس کے ساتھ تھیلے کو میز پر الٹ دیا۔ اس میں کچھ معمولی رقم کے نوٹ تھے، کچھ دوائیں تھیں، کچھ رسیدیں تھیں جو اب غیب سے پڑھنے میں نہیں آتی تھیں۔ دو تین خط تھے جو بہت پہلے کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور کسی "جناب بھائی صاحب" کے نام کسی "آپ کا تابع دار اچھن" کی طرف سے تھے۔ لفافہ کسی خط کے ساتھ نہیں تھا، نہ یہ

معلوم ہوتا تھا کہ یہ کب اور کہاں سے اور کس پتے پر بھیجے گئے ہیں۔ میں نے جھجکتے جھجکتے ان خطوں کو پڑھ ڈالا۔ لیکن یہ بھی ”چھوٹی خالہ“ اور ”منجھلی پھپھی صاحب“ کے بیمار یا بخیریت ہونے کی اطلاع دے کر رہ گئے۔ ایک کسی ڈیڑھ دو سال کی بچی کی تصویر بھی تھی جس کی پشت پر لکھا ہوا تھا: ”امینہ بسکٹ کھا رہی ہیں۔“ میں نے یہ ذاتی خط پڑھنے پر خود کو مجرم محسوس کیا اور سامان کے مالک کا پھر بھی سراغ نہ ملا۔

اب وہ تھیلا میرے سینے پر بوجھ تھا۔ میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ اس کے مالک کا کیا ہوا ہوگا۔ وہ مجھے جانتا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ میں میدان میں مل سکتا ہوں، لیکن اس نے مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ کیا وہ زندہ یا مردہ اپنے گھر پہنچ سکا تھا؟ کیا اسے گھر والوں نے تلاش کیا تھا؟ کیا وہ اپنے گھر میں اکیلا رہتا تھا؟ کیا وہ کسی گاڑی کے نیچے آ گیا تھا اور لاوارث لاش کی طرح ٹھکانے لگا دیا گیا تھا؟ سوال ہی سوال تھے اور مجھے کسی بھی سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ پھر مجھے یہ وحشت زدہ کر دینے والا خیال آیا کہ میرے پاس ایک غائب ہو جانے والے شخص کا سامان ہے اور اس کے بارے میں مجھ سے پوچھ گچھ ہو سکتی ہے۔ اگر وہ کسی حادثے میں کسی انجان آدمی کی وجہ سے مر گیا ہے یا ابھی تک اس کا کچھ پتا نہیں چلا ہے تو مجھ کو ملزم ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد طرح طرح کے اندیشوں نے مجھے گھیر لیا اور ہر اندیشہ پولیس، جرح اور حوالات تک پہنچتا تھا۔ میری زندگی یوں بھی کچھ اچھی نہیں گذر رہی تھی لیکن ایک ملزم بلکہ مجرم کی سی زندگی کا خیال میری برداشت سے باہر تھا۔ جب یہ خیال مجھ پر ہر وقت مسلط رہنے لگا تو ایک دن میں نے گھر کا دروازہ اندر سے بند کر کے تھیلے کو نکالا۔ یہ ہاتھ کے کرگھے پر بنے ہوئے کپڑے کا مضبوط اور نیا تھیلا تھا۔ مجھے بہت پسند آیا۔ تھیلے کے اندر کے سامان کو میں نے ایک بار پھر باہر نکال کر دیکھا اور واپس تھیلے میں رکھ دیا اور بہت سی آگ جلائی۔ شروع میں اس کا دھواں میرا دم گھونٹنے لگا، پھر شعلے بھڑک اٹھے۔ میں نے تھیلے کو آگ میں ڈال دیا اور جب تک وہ بالکل راکھ نہیں ہو گیا، ایک لکڑی سے اسے الٹتا پلٹتا رہا۔ اس طرح جناب بھائی صاحب اور تابع دار اچھن، اور چھوٹی خالہ اور منجھلی پھپھی صاحب، اور امینہ اور اس کا بسکٹ، اور وہ دوائیں اور وہ رقم اور رسیدیں نابود ہو گئیں۔ میرا خیال ہے سب سے بعد میں امینہ کا بسکٹ جل کر راکھ ہوا۔

جب میں راکھ کو سمیٹ رہا تھا تو مجھ کو ایسا معلوم ہوا کہ اب واقعی میں نے اس شخص کو مار ڈالا ہے۔ اس خیال نے مجھے کم تکلیف نہیں پہنچائی، لیکن پھر میں ایسے مجرم کی طرح مطمئن ہو گیا جس نے

Scanned with CamScanner

اپنے جرم کے سارے ثبوت ضائع کر دیے ہوں۔

۳

کچھ دن تک مجھے اس کا خیال ستاتا رہا۔ یہ خیال بھی کئی بار آیا کہ مجھ کو اس کا تھیلا جلانا نہیں چاہیے تھا، ہو سکتا ہے وہ زندہ ہو۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ میں اسے بھول بھال گیا۔ اس عرصے میں ایک بار میرا طبی معائنہ بھی کیا گیا۔ دل کی خرابی بڑھ کر رک گئی تھی۔ چہل قدمی کو پوچھا گیا تو میں نے بتا دیا اب بھی کرتا ہوں، لیکن اس سے میری مراد یہ تھی کہ روز گھر سے باہر نکلتا ہوں۔ لیکن میرے باہر نکلنے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ جب بھی جی چاہتا، نکل کھڑا ہوتا اور ادھر ادھر آوارہ گردی کر کے واپس آ جاتا۔

ایک دن میرا گذر ایک ایسے محلے میں ہوا جو شہر میں مشہور تھا لیکن میں ادھر کبھی نہیں آیا تھا۔ یہ ایک بڑے بازار کے بعد پڑتا تھا اور اس کے بعد سے اور تجارتی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس محلے میں گلیاں بہت تھیں۔ میں ان گلیوں میں بھٹک رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون سی گلی مجھے محلے سے باہر لے جا سکتی ہے۔ ایک گلی سے دوسری گلی میں جا رہا تھا کہ سامنے سے آتے ہوئے ایک آدمی نے مجھے دیکھا اور ٹھٹھک کر رک گیا۔ میں بھی اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

"ارے، تم؟" اس نے کہا۔

"تم؟" میں نے بھی کہا، اور ہم دونوں بغل گیر ہو گئے۔

وہ میرے اسکول کے دنوں کا گہرا دوست تھا۔ اتنے دن بعد بھی ہمیں ایک دوسرے کو پہچاننے میں دقت نہیں ہوئی۔ وہیں کھڑے کھڑے ہم نے اپنی موجودہ زندگی، پھر اسکول کی باتیں شروع کر دیں۔ پرانے ماسٹروں کا ذکر آیا، پرانے ساتھیوں کا حال معلوم کیا گیا اور اپنی شرارتیں یاد آئیں۔ وہ بہت زندہ دل لڑکا تھا۔ اب بھی اس کی باتوں میں شوخی جھلک جاتی تھی۔ مجھ کو اس کا اچانک مل جانا اچھا معلوم ہوا۔ وہ گاتا بھی بہت تھا اور اس وقت کے مشہور گانوں کی نقل اچھی کر لیتا تھا۔ لیکن کوئی گانا پورا نہیں گاتا تھا۔ ایک گانا شروع کرتا اور ایک دو بولوں کے بعد اس میں کسی دوسرے گانے کا جوڑ ملا دیتا، پھر تیسرے گانے کا۔ اسی طرح پندرہ بیس گانے سنا دیتا۔ کوئی اس سے پورا گانا سنانے کی فرمائش کرتا تو کہہ دیتا تھا، "پورا یاد نہیں۔" اور سچی بات یہ ہے کہ ہم کو اس سے ادھورے گانے سننے ہی میں مزہ آتا تھا۔

میں نے اس کے کانوں کا ذکر چھیڑ دیا اور پوچھا

"اب بھی چوہدری کا نے گاتے ہو؟"

"اب کہاں، میری آواز دیکھ رہے ہو؟" اس نے کھوکھلی آواز میں کہا اور چپ ہو گیا۔

واقعی اس کی آواز خراب ہو چکی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا

"اتنے دن بعد ملے ہو۔ آؤ تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں۔ [illegible]"

ہم ایک اور گلی میں داخل ہوئے۔ تھوڑا چلنے کے بعد وہ ایک چھوٹے سے ہوٹل کے سامنے رکا اور ہوٹل والے سے کچھ کہہ کر آگے بڑھا۔ تین چار ہوٹل ایک دوسرے سے متصل ملے۔ پھر اس کا مکان آ گیا۔ دالان کا دروازہ چھوٹا تھا لیکن اندر کشادہ مکان تھا۔ صحن بھی تھا۔ دروازے کے قریب ایک کمرے میں ہم دونوں بیٹھے۔ ایک دوسرے سے اپنا اپنا حال [illegible] کسی نے [illegible] دروازہ کھٹکھٹایا۔ دوست نے آواز دی

"چلے آؤ"

ایک چھوٹا سا لڑکا جو شکل سے بیٹا معلوم [illegible] ہاتھوں میں چائے [illegible] طشتریاں لیے ہوئے داخل ہوا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس نے دو ہاتھوں میں چار پانچ چیزیں سنبھال رکھی ہیں۔ سب سامان اس نے ایک میز پر رکھا اور دوڑتا ہوا واپس چلا گیا۔

اس وقت ہم اپنے ماسٹروں کو یاد کرتے ہوئے [illegible] رہے تھے۔

"ماسٹر طبلہ یاد ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"انھیں بھی کوئی بھول سکتا ہے؟"

"وہ ہمارے ماسٹروں میں سب سے بوڑھے تھے۔ [illegible] بہت غصہ آتا تو دونوں ہاتھوں سے اس کی پیٹھ پر [illegible] سے طبلہ سا بجا دیتے تھے۔"

"ان کا کوسنا بھی یاد ہے؟"

"نہیں،" میں نے کہا، "کیا وہ کوستے بھی تھے؟"

"ایک بار میں [illegible] سے کام کر کے نہیں لے گیا تھا۔ انھوں نے بار بار پوچھا، 'کام کیوں نہیں کر کے لائے؟' میرے پاس جواب نہیں تھا، چپکا کھڑا رہا۔ انھوں نے کہا، 'بولتا کیوں نہیں؟ بول، نہیں تو

کوستا ہوں۔ میں پھر چپکا رہا۔ کہنے لگے، 'نہیں بولے گا؟ تو کوسوں؟' پھر پوچھا، 'کوسوں؟' میں نے کہا، 'کوسیے۔' تو بولے، 'مردہ لڑکا!' مجھے یہ کوسنا سن کر ہنسی آ گئی۔''

''پھر؟'' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''پھر کیا اب ان کو اصلی غصہ آیا اور انھوں نے میری پیٹھ پر طبلہ بجا دیا۔ اسکول چھوڑنے کے بہت دن بعد ایک بار ان سے ملاقات ہوئی۔ انھیں سانس کی شکایت ہو گئی تھی۔ یار، ہمارا مکان بڑا واہیات ہے۔''

اس نے ایک بات میں دوسری بات کا جوڑ لگا دیا، جس طرح گانوں میں لگایا کرتا تھا۔ میں نے کہا:

''کیوں؟ واہیات کیوں؟ اتنا اچھا تو مکان ہے۔''

'ہاں، لیکن یہاں ہوٹل بہت ہیں۔''

میرے دماغ میں گھنٹی سی بجنے لگی۔ میں نے کہا

''ہوٹل ہیں تو تمھارا کیا بگاڑتے ہیں؟ کھانے پینے کی آسانی رہتی ہوگی۔''

اس نے وہی کہا جو میں سننے کی توقع کر رہا تھا۔ بولا

''وہ تو ٹھیک ہے، لیکن اندھیرے منھ ان کی بھٹیاں سلگائی جاتی ہیں۔ سارے میں دھواں پھیل جاتا ہے۔ میرا تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں میری آواز اسی سے خراب ہوئی ہے۔''

میں چاہتا تو اس گفتگو کو آگے بڑھا سکتا تھا لیکن اچانک مجھے اس تھیلے کا خیال آیا جسے میں نے جلا دیا تھا۔

کوئی فائدہ نہیں، میں نے سوچا اور اٹھنے کو ہوا، لیکن اسی وقت دوست نے کہا

''پڑوس میں ایک صاحب رہتے تھے۔ وہ تو بھٹیاں سلگنے سے پہلے گھر سے باہر نکل جاتے تھے۔ معلوم نہیں کہاں جاتے تھے۔ سورج نکلنے کے وقت واپس آتے تھے۔ لیکن اس طرح کب تک کام چل سکتا تھا۔''

اب مجھ سے نہیں رہا گیا۔ میں نے پوچھا'

''تو اب نہیں نکلتے؟''

"نہیں، ایک دن بالکل ہی نکل گئے۔ ان کے مکان سے ملا ہوا ایک اور ہوٹل کھل گیا ہے۔ ہے نا مزے کی بات؟" پھر اسے کچھ یاد آیا۔ بولا، "ارے ہاں، وہ ان کا تھیلا۔۔ کیا نام تھا ان کا؟"

"کیسا تھیلا؟" میں نے بہ مشکل کہا۔

"وہ کسی وقت بھی ان سے الگ نہیں ہوتا تھا۔ ہم لوگوں کے ساتھ کرکٹ میچ کھیلتے وقت بھی ان کے کندھے سے لٹکا رہتا تھا۔"

مجھے یاد آ گیا۔

"اچھا وہ؟" میں نے کہا۔ "ہاں وہ ڈرائنگ ماسٹر۔ ایک بار رن لینے کے لیے دوڑے، آدھے راستے میں تھیلا گر گیا تو اٹھانے کے لیے رک گئے اور۔۔"

"رن آؤٹ ہو گئے!" اس نے کہا اور زور سے قہقہہ لگایا۔ میں بھی ہنسنے لگا۔ کچھ دیر ہم ڈرائنگ ماسٹر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ چلتے چلتے میں نے کہا

"ایک بات بتاؤ۔"

"ہاں بولو۔"

"ان گلیوں میں ہوتا ہوا یہاں پہنچا ہوں۔ باہر جانے کا راستہ کون سا ہے؟"

"بس؟" وہ ہنسا۔ "یہی سامنے والی گلی ہے۔ سیدھے آگے بڑھتے جاؤ۔ کہیں مڑنا مت۔ گلی اپنے آپ تمھیں بازار میں پہنچا دے گی۔ یا چلو میں تمھارے ساتھ سڑک تک چلتا ہوں۔"

گلی کے سرے پر پہنچ کر وہ پھر مجھ سے بغل گیر ہوا اور بولا

"یار، کبھی کبھی آ جایا کرو۔"

"ضرور آؤں گا۔" میں نے کہا اور سڑک پر آ گیا۔

چند قدم بڑھنے کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ گلی میں مڑ رہا تھا۔ اس کا مکان مجھے یاد تھا لیکن یقین تھا کہ دو دن بعد یاد نہیں رہے گا۔ اس لیے میں پلٹ کر اس کے پیچھے چلا۔ وہ مکان میں داخل ہو رہا تھا کہ میں نے اسے جا لیا۔ وہ کچھ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا

"یار، ایک بات پوچھنا بھول گیا تھا۔"

"ہاں ہاں، کہو۔"

پھر مجھے جھجکتے دیکھ کر بولا:

''آؤ، کچھ دیر اور بیٹھتے ہیں۔ کتنے دن بعد تو ملاقات ہوئی ہے۔''

کمرے میں کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے کہا

''تم کچھ پوچھ رہے تھے۔''

''ہاں،'' میں نے کہا، ''وہ۔ تم کہہ رہے تھے یک اور ہوٹل کھل گیا ہے۔''

''ہوٹل تو کھلتے ہی رہتے ہیں،'' وہ بولا، ''اور بند بھی ہوتے رہتے ہیں۔''

''نہیں،'' میں نے کہا، ''ان کے مکان سے ملا ہوا... جو صاحب دھوئیں کی وجہ سے...''

''اچھا، ملک صاحب کو پوچھ رہے ہو؟''

اور مجھے بھی اس کا نام یاد آ گیا۔

''ملک صاحب،'' میں نے کہا، ''ان کے ساتھ کچھ دن دفتر میں کام کیا تھا۔ دو تین بار ان کے گھر بھی آیا تھا۔'' حالانکہ نہیں آیا تھا۔ ''وہ مجھ پر بہت مہربان تھے۔ میں بھی ان سے بے تکلف تھا۔''

پھر میں نے اس کی مہربانیوں اور اپنی بے تکلفی کے کئی قصے بھی گڑھ کر سنائے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے اتنے بہت سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ دوست نے میری باتوں کو دل چسپی کے بغیر سنا، پھر بولا:

''ہاں، وہ سیدھے سادے آدمی تھے، اور میں سمجھتا ہوں کچھ کچھ سنکی بھی تھے۔''

''سنکی؟''

''یا شاید نہ ہوں — لیکن ان کا تھیلا...'' وہ رکا، پھر بولا، ''تھیلا ہر وقت ان کے پاس رہتا تھا۔''

''ہمارے ڈرائنگ ماسٹر کی طرح؟''

''ڈرائنگ ماسٹر تو جب ان کا تھیلا خراب ہو جاتا تھا تب بدلتے تھے۔ ملک صاحب ہر دوسرے تیسرے مہینے نیا تھیلا خریدتے تھے۔ یہ سنک ہی تو تھی ایک قسم کی۔''

''اُن کے بیوی بچے؟''

''کہیں اور ہوں تو ہوں۔ یہاں اکیلے ہی رہتے تھے۔ آخر میں اُن کا شاید کوئی دوست بھی نہیں تھا۔''

''تم بھی نہیں؟''

''میری ان سے بس کنجی بھر کی دوستی تھی۔''

اس نے بتایا کہ سویرے گھومنے جاتے وقت وہ اپنے دروازے کی کنجی اس کے دروازے پر لٹکا جاتا تھا اور واپس آ کر اتار لیتا تھا۔

''اس دن دوپہر تک کنجی یوں ہی لٹکی رہی۔ تیسرے پہر کے قریب ایک آدمی ان کی خبر لے کر آ گیا۔ ریلوے میدان میں ٹہلنے جاتے تھے۔ وہیں ختم ہو گئے۔''

پھر دوست نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ میدان میں ٹہلنے والوں کو درختوں کے جھنڈ میں کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی لیکن جب تک لوگ آواز پر پہنچے وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اتفاق سے ان میں دو لوگ ایسے تھے جو کبھی اس کے ساتھ دفتر میں کام کر چکے تھے۔ انھوں نے اسے پہچانا، اسپتال لے گئے۔ اسپتال میں بتایا گیا کہ وہ مر چکا ہے۔ اس کے دفتر میں اطلاع کی گئی۔ دفتر والوں نے اپنے پرانے ریکارڈ میں اس کے گھر کا پتا دیکھ کر محلے والوں کو اطلاع کی اور محلے والے اسپتال اور پولیس سے نپٹ کر اس کی لاش لے آئے۔

''بے ہنگام مرنا،'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''اگر وہاں ٹہلنے والوں میں کوئی شناسا نہ نکلتا تو معلوم نہیں بے چارے کا کیا حشر ہوتا۔''

میں نے لاوارث لاشوں کے حشر کا تصور کیا، پھر اُدھر سے دھیان ہٹا کر پوچھا

''تو وہ اسی جھنڈ میں ملے؟''

''وہ شاید اس میں سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن غلطی سے جھنڈ کے اندر تک چلے گئے۔''

''یہ کس طرح کہہ رہے ہو؟''

''ان کے تھیلے کی وجہ سے۔ جہاں پر وہ پائے گئے وہاں تھیلا نہیں تھا۔ کہیں درختوں میں گر گیا ہوگا۔''

''ہو سکتا ہے اس دن تھیلا نہ لے گئے ہوں۔''

''کوئی سوال نہیں۔ تھیلا ہر وقت ان کے پاس رہتا تھا۔ جب ان کی طبیعت خراب ہوئی اور انھوں نے درختوں میں سے نکلنا چاہا تو راستے میں کہیں ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہوگا۔''

Scanned with CamScanner

''مگر وہ نہیں ملا؟''

''کسی نے پار کر دیا ہوگا، نیا تھیلا تھا۔ یا شاید اب بھی کہیں درختوں میں پڑا ہو۔''

میں نے بات بدلنے کے لیے کہنا شروع کیا۔

''ان کے گھر والے..''

''بتایا نا، وہ اکیلے رہتے تھے۔ لیکن انھوں نے پڑوس کے دو ہوٹل والوں کو روپے دے رکھے تھے کہ انھیں کچھ ہو جائے تو ''

پھر اس نے کفن دفن، قبرستان کا ذکر چھیڑ دیا جو میں نے کچھ سنا، کچھ نہیں سنا۔ اس کے بعد ہم کچھ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ آخر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ دوست نے پھر کہا

''یار، کبھی کبھی آجایا کرو۔''

''دیکھو، اگر گلیاں یاد رہ گئیں۔''

اس نے سڑک سے اپنے مکان تک کی نشانیاں بتانا شروع کیں۔ پھر اسے کچھ یاد آیا، بولا:

''ارے بھئی، ملک صاحب کا مکان تو جانتے ہو، بس اس کے بائیں طرف تیسرا مکان...''

میں نے کہا

''تم بھی کبھی کبھی آجایا کرو۔''

اس نے اپنا پتا نہیں بتایا، اس لیے کہ یہ مکان سکول کے راستے میں پڑتا تھا اور ہم اکثر وہاں کھڑے ہو کر باتیں کیا کرتے تھے۔

میں وہاں سے چلا آیا۔ کچھ دن تک سوچتا رہا کہ اگر اسے درختوں کے جھنڈ ہی میں تلاش کرتا تو شاید وہ بچ جاتا، لیکن پھر اس کو، اور اپنے دوست کو بھی، بھول بھال گیا۔

۴

اب یہ ہنگام مرنے کا اندیشہ میرے دل سے نکل گیا تھا، اس لیے کہ ایک مرتبہ پھر میرا طبی معائنہ ہوا تو دل کی حالت ٹھیک ٹھاک نکلی جس کے بعد میں نے باہر نکلنا بہت کم کر دیا۔ زیادہ تر اپنے چھوٹے سے باغ کے پیڑ پودوں یا گھر میں پلی ہوئی مرغیوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

ایک دن میں محلے کی چکی پر سے مرغیوں کا دانہ لے کر آ رہا تھا۔ دیکھا وہاں دوست میرے مکان کی طرف سے چلا آ رہا ہے۔ قریب آتے ہی بولا

"خوب ملے۔ میں واپس جا رہا تھا۔"

"بس ذرا دیر کے لیے باہر نکلا تھا۔ آؤ، بیٹھتے ہیں۔"

"بیٹھوں گا نہیں،" اس نے کہا، "اس وقت یہ بتانے آیا ہوں کہ وہ لوگ، ملک صاحب کے گھر والے، آ گئے ہیں۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"میں کیا کروں،" اس نے میری بات کو دہرایا اور زور سے ہنسا، "یاد ہے؟"

مجھے یاد آیا۔ اسکول کے دنوں میں ہماری ایک تفریح یہ بھی تھی کہ اپنے کسی ساتھی سے کسی دلچسپ خبر کی تفصیل پوچھتے اور جب وہ خاصے جوش کے ساتھ بتا چکتا تو روکھا منھ بنا کر کہہ دیتے، "تو میں کیا کروں؟"

"ہاں، یاد ہے،" میں بھی ہنسنے لگا، "لیکن ملک صاحب کے گھر والے آ گئے ہیں تو میں واقعی کیا کروں؟"

"بھئی وہ تم سے ملنا چاہ رہے ہیں۔"

"مجھ سے کیوں؟"

"تم ملک صاحب سے بے تکلف تھے نا؟ وہ لوگ ان کے ملنے والوں سے مل رہے ہیں۔"

"میری ان سے زیادہ ملاقات نہیں تھی۔ بس دفتر کے دنوں میں..." پھر میں رک گیا۔

"چلو، جو کہنا ہے انھی سے کہنا۔ وہ لوگ آج واپس جا رہے ہیں۔"

"اور آئے کب تھے؟"

"کئی دن ہو گئے۔ آج میں نے ان سے تمھارا ذکر کیا تو "

میں نے دل ہی دل میں اسے کوسا، دانے کی پوٹلی گھر میں پہنچائی، اور اس کے ساتھ چل دیا۔

راستے میں اس نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ کسی دوسرے ملک میں بس گئے ہیں اور یہاں اپنے رشتے داروں سے ان کا رابطہ نہیں رہ گیا تھا۔ "بلکہ ملک صاحب کے سوا کوئی رشتے دار ہی نہیں رہ گیا

Scanned with CamScanner

تھا۔" ملک صاحب سے ان کا کیا رشتہ تھا، یہ اسے معلوم نہیں تھا۔

ہم وہاں پہنچ گئے۔ مکان کچھ کچھ ویسا ہی تھا جیسا میرے دوست کا مکان تھا۔ مہمانوں کی وجہ سے وہاں بڑی چہل پہل تھی۔ ان میں دو نوجوان تھے، ایک میاں بیوی تھے، یہ بھی جوان ہی تھے، ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی اور دو ایک بچے تھے۔ لباسوں اور ساتھ کے اسباب سے خاصے خوش حال لوگ معلوم ہوتے تھے۔ دوست نے میرا تعارف کرایا اور میں ان کے سوالوں کے لیے تیار ہو گیا جس کے جواب راستے بھر سوچتا آ رہا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے بس سرسری طور پر میرے بارے میں کچھ سوال کیے۔ کہاں رہتا ہوں، کیا کرتا ہوں وغیرہ۔ ان کو میرے جوابوں سے دلچسپی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ زیادہ تر وہ اپنے بارے میں مجھ کو بتاتے رہے۔ ادھیڑ عورت میرے دوست سے دھیرے دھیرے باتیں کرتی رہی۔ میں نوجوانوں کی طرف متوجہ رہا لیکن ان کی باتیں دھیان سے نہیں سن سکا۔ بس اتنا سمجھ میں آیا کہ انھوں نے مکان کے لیے خریدار کا انتظام کر لیا ہے، گھر کا سامان ٹھکانے لگا چکے ہیں، اور یہ کہ شام کو ان کی واپسی ہے اور جانے سے پہلے وہ شہر کی تاریخی عمارتیں دیکھیں گے۔

میں نے دوست کو واپس چلنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ ادھیڑ عورت ابھی تک دوست سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے آخری جملے مجھے یاد ہیں:

"مجھے تو وہ یاد بھی نہیں ہیں۔ اچھن بھائی کے پاس ان کے خط دیکھے تھے۔ بڑی محبت سے لکھتے تھے،" اس نے ٹھنڈی سانس بھری، "ان کے سامان میں ہم لوگوں کے کھلونے بھی نکلے۔ ابھی تک انھیں سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔"

❀❀

Ralph Russell

Findings, Keepings

Life, Communism and Everything

Published by
Shola Books, London

Available at
City Press Bookshop
316 Madina City Mall, Abdullah Haroon Road, Saddar, Karachi 74400
Tel (92 21) 5650623 5213916
E-mail : city_press@email.com

Price in Pakistan:
Rs.950

سیمین دانشور

چار کہانیاں

ترجمہ
وفا یزدان منش
اجمل کمال

سیمین دانشور کا نام ''آج'' کے پڑھنے والوں کے لیے نامانوس نہیں۔ فارسی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل خصوصی شمارے (نمبر ۱۵، سرما، بہار ۱۹۹۴ء) میں ان کی کہانی ''سیدانیس'' اور شمارہ ۳۱ میں ''بازارِ وکیل میں'' کا ترجمہ شائع کیا گیا تھا۔ اس بار ان کی چار منتخب کہانیاں پیش کی جا رہی ہیں جو ایرانی معاشرے، خصوصاً اس میں عورتوں کی صورتِ حال، کے مختلف پہلوؤں کو بڑی عمدگی سے ظاہر کرتی ہیں۔ سیمین دانشور شیراز میں ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے ۱۹۴۱ء میں صحافت اور ادب کے میدان میں قدم رکھا اور ۱۹۴۸ء میں ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''آتشِ خاموش'' شائع ہوا جو کسی ایرانی خاتون افسانہ نگار کا پہلا مجموعہ تھا۔ ۱۹۶۱ء میں ان کا دوسرا مجموعہ ''شہری چون بہشت'' (بہشت جیسا شہر)، ۱۹۸۰ء میں تیسرا مجموعہ ''بہ کی سلام کنم'' (کسے سلام کروں) اور ابھی چند سال پہلے تازہ ترین مجموعہ ''از پرندہ ہای مہاجر بپرس'' (مہاجر پرندوں سے پوچھو) شائع ہوا ہے۔ لیکن ۱۹۶۹ء میں ان کے پہلے ناول ''سووشون'' (سیاوش کے سوگوار) کی اشاعت نے انھیں جدید فارسی فکشن کے بلندترین مقام پر پہنچا دیا۔ ان کا دوسرا ناول ''جزیرۂ سرگردانی'' ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ سیمین دانشور کی ایک اور تصنیف ''غروبِ جلال'' ہے جو ان کے شوہر اور فارسی کے ممتاز ترین ادیبوں میں سے ایک، جلال آلِ احمد، کی یادوں اور ان کی موت کے حالات کے بارے میں ہے۔ اس وقت سیمین دانشور تہران یونیورسٹی سے منسلک ہیں اور ایران کی محترم ترین شخصیات میں شمار ہوتی ہیں۔

موجودہ انتخاب میں سیمین دانشور کی جو کہانیاں شامل ہیں ان کے فارسی عنوانات یہ ہیں: ''بی بی شہربانو''، ''شہری چون بہشت''، ''بہ کی سلام کنم'' اور ''ایمان''۔

سیمین دانشور

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

بی بی شہر بانو

انھوں نے بڑی مشکلوں سے اماں کو تو سوار کرا دیا لیکن جب اوپر آئے تو تینوں میں سے کسی کے بیٹھنے کے لیے جگہ نہ تھی۔ ابھی ان کے پیچھے اور بھی مسافر 'یا علی' کہتے ہوئے چڑھے چلے آتے تھے۔ بدن کے پسینے کی بو ڈیزل کی بو میں گھلی ہوئی تھی۔ ڈرائیور کے بائیں طرف ایک فوجی بیٹھا تھا۔ وہ خود کو اپنی ٹوپی سے ہوا جھل رہا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ پر بھی ایک بڑے سے پیپے پر ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ مریم نے بس کے مسافروں پر نظر ڈالی جن میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو اپنے ہاتھوں میں پنکھے لیے بیٹھی تھیں۔ لیکن ان میں سے کسی نے ذرا سا سرک کر مریم کی اماں تک کو جگہ نہ دی۔ وہ سوچنے لگی، ''اتنا بھی نہیں دیکھتیں کہ یہ معذور ہیں؟'' پھر اس نے اماں کی طرف دیکھا جو اپنی کھلی ہوئی بے نور آنکھوں سے تکتی، خاموش کھڑی تھیں، جیسے مسافروں کی بھنبھناہٹ پر کان لگائے ہوں۔ وہ تینوں بس کے بیچوں بیچ حیران کھڑے تھے اور کسی سے نظر ملانے کی جرأت نہ کر پا رہے تھے، کہ ڈرائیور کے شاگرد نے آواز لگائی، ''آگے بڑھو، آگے!'' مریم نے اماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور انھیں بس کے پچھلے حصے کی طرف کھینچنے لگی۔ یکا یک اس نے ادھر اُدھر دیکھا تو اسے اپنا بھائی دکھائی نہ دیا۔ مگر جب اسے پیپے پر نوجوان کے ساتھ بیٹھے دیکھا تو حیرت میں پڑ گئی۔ افسوس، یہ نہ ہو سکتا تھا کہ اماں کو پیپے پر بٹھا دیتی۔

بس نے مسافروں کی صلوات پڑھنے کی آوازوں کے درمیان پیچھے کو حرکت کی، پھر گھوم کر دوسری بسوں کے درمیان سے باہر نکل آئی۔ کئی سڑکوں سے گزر کر آخر وہ شہر رے جانے والی بڑی

سڑک پر بڑھنے لگی۔ مریم نے اماں کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ اپنی بغل میں دبا ہوا بچہ اسے بہت بھاری لگ رہا تھا۔ اُدھر سیاہ چادر تھی کہ اس کے سر سے ڈھلکی آتی تھی، اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس کا دھیان رکھے۔ اس نے چادر کے کونے کو دانتوں میں دبا لیا۔ بس کے ہر جھٹکے پر وہ دونوں بھی جھول جاتے۔ مریم کو ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں بس کے فرش پر نہ لڑھک پڑیں۔ یعنی اگر بس کے فرش پر لڑھکنے کی جگہ ہوتو۔

جب مریم اپنی حالت کی ذرا عادی ہوگئی تو اس کی نظر ایک بوڑھی عورت پر پڑی جو معلوم ہوتا تھا بہت دیر سے ان دونوں پر نظر جمائے ہوئے ہے۔ مریم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے التجا کی۔ وہ بڑے بڑے بدن کی تھی اور اس کا کوبڑ چادر میں ابھرا ہوا لگتا تھا۔ آخر بڑی بی نے سرک کر تھوڑی سی جگہ پیدا کی۔ آگے جھک کر مریم کی اماں کا ہاتھ پکڑا اور انھیں اپنے برابر بٹھا لیا۔ اس کے برابر میں بیٹھی جوان عورت زیرِ لب بولی: "ہونھ!" اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔ مریم نے بغل میں دبا ہوا بچہ اماں کی گود میں رکھ دیا اور بس کے آہنی ڈنڈے کو پکڑ کر کھڑی ہوگئی۔ اب اسے کچھ سکون ملا۔ بڑی بی کے بیچ پیچھے کی ہوا اس تک پہنچ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ بڑی بی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

جوان عورت اونچی آواز میں بولی: "اور کسی کا معدہ ہو تو ماں بن جاتی ہیں، میری بات ہو تو سوتیلی ماں۔" بڑی بی نے اسے ٹوکا: "بس کر، بس۔"

بس کے بے شیشہ اور بے پردہ دریچے سے ڈوبتے سورج کی روشنی اندر آرہی تھی۔ بس کی جھولوں اور بے آرام گہوارے کی سی گرمی سے مریم کو نیند آنے لگی۔ عورتیں اسی کی طرح بس کے سیٹوں کے درمیان کے حصے میں کھڑی تھیں اور اپنے ہاتھوں میں کوئی نہ کوئی چیز تھامے ہوئے تھیں، اس لیے اسے اپنا بھائی نظر نہ آتا تھا۔ ایک بار بس کے جھٹکے سے عورتیں لہرا کر ایک طرف کو ہوئیں تو اسے بھائی کے چہرے کی جھلک دکھائی دی۔ وہ نوجوان سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی: "کیا باتیں کر رہا ہوگا؟" اس کا تخیل راہ پر لگ گیا۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتی تو ضرور نوجوان کو رام کرنے کی کوشش کرتی۔ شادی کی عمر کا ہے، مسیں بھیگ رہی ہیں۔ کہتی: "بھائی صاحب، دیکھیے۔ میری ایک بہن ہے جو شادی کے قابل ہے۔" نہیں، یوں نہیں۔ کہتی: "میری بہن پورے گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ ہاتھ میں ایسا رَس ہے کہ کھانے والا راس ٹپکا دے۔ کوٹ پتلون پر ایسی استری کرتی ہے کہ گیا دکان پر ہوتی ہوگی۔ پانچ

Scanned with CamScanner

جو ہمیں پڑھائی جاتی ہے... تاریخ، جغرافیہ، حساب... پھر بھی: "بھائی صاحب! آپ کے کام کون کرتا ہے؟ آپ کی جرابیں کون رفو کرتا ہے؟" نہیں، اس سے بھی کچھ فائدہ نہیں۔ ممکن ہے وہ جواب میں کہے: "میری ماں" یا "بہن"۔ بہتر ہوگا کہ بھائی نوجوان سے کہے: "بھائی صاحب، کیوں نہ ہم دونوں اپنا اپنا گھر بسائیں۔ شادی کریں اور گھر بار کی فکر کریں۔" نہیں، میں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔ نوجوان اپنی بہن کا ہاتھ بھائی کے ہاتھ میں تھما دے گا اور میں یونہی پوٹلی پکڑے کھڑی رہ جاؤں گی۔ وہ زیادہ چالاک ہے؛ عمر میں بھی بڑا ہے۔

بس نے زور کا جھٹکا کھایا اور سارے مسافر لہرائے۔ مریم کی اماں بڑی بی کے پاس سے گرتے گرتے بچیں۔ مگر گرتیں تو جاتیں کہاں؟ وہ اور بڑی بی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے سنا، بڑی بی اماں کو دلاسا دے رہی تھیں: "تو یہ سب مسافر آخر جا کس لیے رہے ہیں؟ بلا وجہ تھوڑی۔ بی بی شہربانو، اس پہ میری جان قربان، سب کے کام بنا دیتی ہیں۔" اور اماں کہہ رہی تھیں: "اگر میری مراد مل جائے، میری آنکھیں روشن ہو جائیں، تو اگلے سال چاندی کی آنکھیں چڑھاؤں گی۔" اماں کی یہ منت سن کر مریم کو ایک اور خیال آنے لگا۔ اس نے عورتوں کے بیچ میں سے سر نکال کر بھائی کو دیکھا جو اب بھی باتوں میں مشغول تھا۔ میری کہاں فکر ہے۔ کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ بابا لڑکی جوان ہو گئی ہے۔ اماں کی سب کو فکر ہے۔ ٹھیک بھی ہے۔ خود میں ان کا خیال نہیں رکھتی؟ انھیں سہارا نہیں دیتی؟ میں نے گھر کی دیکھ بھال کرنے کے لیے مدرسہ نہیں چھوڑ دیا، کہ ابا کا منھ بند ہو؟ صبح سے شام تک جان کھا کے کام نہیں کرتی؟ ٹھیک ہے، مجھے کرنا بھی چاہیے، مگر کوئی مذاق ہے؟ خیر، آخر وہ میری اماں ہیں۔ کیا پتا، بھائی اماں کے بارے میں بات کر رہا ہو۔ آخر اسی کی خاطر ان کی آنکھوں کی روشنی گئی۔ شاید وہ کہہ رہا ہو، "میری آنکھوں میں ککرے ہو گئے تھے، بالکل معذور ہو گیا تھا۔ جوتوں کے کام پر جانے کے قابل نہ رہا۔ میری ماں نے کتنی ہی نذر نیاز کر لی، کتنے ہی پیسے حکیموں اور دواؤں پر صرف کر ڈالے، مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ انھوں نے دیوار سے سر ٹکرایا، سر پر دو ہتڑ مارے، سینہ پیٹا اور آسمان کی طرف دیکھ کے کہا: اے خدا! میری آنکھیں لے لے اور میرے بیٹے کی آنکھیں ٹھیک کر دے۔ بس، پہلے ان کی داہنی آنکھ، پھر بائیں آنکھ جاتی رہی۔ آنکھوں کے پردے پھٹ گئے۔ اور اس طرح ہم سب اس مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔"

Scanned with CamScanner

مریم کے سینے میں ہوک اٹھی، گلے میں کچھ اٹکنے لگا۔ اس نے اماں کو دیکھا جو سیٹ پر ٹیڑھی ہو کر بیٹھی تھیں۔ اپنے جھریوں بھرے ہاتھوں سے آگے کی سیٹ کا ڈنڈا تھام رکھا تھا۔ بے نور آنکھیں سامنے کسی نقطے پر جمی ہوئی تھیں، جیسے کسی آواز پر کان لگائے ہوں۔ مریم نے خود پر لعنت بھیجی۔ خودغرض لڑکی، تجھے شرم نہیں آتی؟ اگر تو نے شادی کر لی تو اماں کو کون سہارا دے گا؟ کون انھیں نہلائے دھلائے گا؟ کون گھر کا خیال رکھے گا کہ ابابیل نہ نوچنے لگیں؟ ضرور بھائی اماں کی معذوری کے بارے میں ہی بات کر رہا ہوگا۔ کیا؟ اگر نوجوان نے کہا کہ میں تمھاری بہن سے شادی کرنا چاہتا ہوں، تو وہ کہے گا، ''یہ نہیں ہوسکتا۔ بہن اماں کا خیال رکھتی ہے۔'' نہیں، اسے چاہیے کہ میری شادی نہ ہونے دے۔ میں نے بلاوجہ بی بی سے مراد مانگی۔ میں اتنی بڑی بدبختی کے ساتھ شوہر کے گھر کس طرح جا سکتی ہوں۔ اچانک اماں کی آواز نے اسے چونکایا جو بڑی بی سے کہہ رہی تھیں

''کیا کہا؟ شہزادی؟''

بڑی بی نے کہا، ''اور کیا۔ تمھیں نہیں معلوم شہربانو شہزادی تھیں؟''

اماں بولیں، ''نہیں، بھلا مجھے کیسے معلوم ہوتا... میں تو گھر سے باہر قدم نہیں نکالتی۔''

بڑی بی نے گلا صاف کیا اور کہنے لگی، ''ہاں، تو میں کیا کہہ رہی تھی؟ بی بی شہربانو شہزادی تھیں۔ میرے جان قربان، انھیں عربوں نے اغوا کر لیا، بیچنے کے لیے شام کے بازار میں لے گئے۔ امیرالمومنین حسین سے معلوم ہو گیا کہ وہ شہزادی ہیں۔ انھوں نے بی بی کو سلمان فارسی کی سپردگی میں دیا اور سلمان نے انھیں حضرت امام حسین تک پہنچایا۔''

بڑی بی نے آگے جو کچھ کہا وہ بس کی گھرگھراہٹ میں دب گیا جو ناہموار راستے پر چلتے ہوئے بری طرح ڈول رہی تھی۔ بڑی بی کے سامنے والی سیٹ پر ایک بچہ اپنی ماں کی گود میں روئے جا رہا تھا اور دودھ نہیں پی رہا تھا۔ ماں بری طرح جھنجھلائی ہوئی تھی۔ آس پاس چھوٹی بڑی عمر کے کئی بچے اس سے چمٹے ہوئے بیٹھے تھے۔

مریم کو بڑی بی کے برابر میں بیٹھی جوان عورت کی آواز سنائی دی۔

''نہیں جی۔ یزید بھی بی بی شہربانو کا خواستگار تھا۔ مگر بی بی شہربانو امام حسین کی بیوی بنیں۔ یہ لو کہلا بھیجا کہ دنیا تم رکھو، میں تو امام کی بیوی ہوں گی تاکہ آخرت کے دن، جو پچاس ہزار سال

طویل ہوگا، وہ میری اور میرے لوگوں کی شفاعت کریں۔"

بڑی بی نے تیکھا جواب دیا، "اے وہ، کیا علی خواجہ اور کیا خواجہ علی۔ ور میں کیا کہہ رہی ہوں؟ لگتا ہے، میری یہ زیارت حرام ہو کر رہ جائے گی۔"

مریم کو اماں کی آواز آئی جوان دونوں کے جھگڑے میں دخل دے رہی تھیں، "خانم جان، بہو سے نبھانا ہی پڑتی ہے۔ صلوات پڑھو۔" بڑی بی خشم ناک انداز سے بولی، "یہ تو نعمت ہے کہ تم بے اولاد ہو۔ کہیں بچے والی ہوتیں تو نجانے کیا آفت ڈھاتیں۔"

جوان عورت نے منہ کھولا۔ مریم کو پتا نہ چلا کہ جواب دینے کو یا آہ بھرنے کو۔ جو بھی ہو، مسافروں کے صلوات پڑھنے کی آوازیں ہر طرف بلند ہو رہی تھیں اور بس ڈھلان پر تیزی سے اتر رہی تھی۔

گھر گھراتی ہوئی بس ایک پہاڑی کے نیچے پہنچ کر رک گئی اور سب مسافر اتر گئے۔ مریم سب سے آخر میں اماں کا ہاتھ پکڑے اتری اور سب کے پیچھے چلنے لگی۔ مسافروں کی ایک ٹولی لالٹین ہاتھ میں لیے چل رہی تھی اور رات گزارنے کے لیے ٹھکانے کی تلاش میں تھی۔ فوجی نے اپنی ٹوپی سر پر رکھ لی تھی اور ایک بڑی سی مٹی کے تیل کی لالٹین میں ہوا بھر رہا تھا۔ کچھ عورتیں، نئی سیاہ چادریں اوڑھے، اس کے ارد گرد کھڑی تھیں اور اپنے چہروں کو سختی سے ڈھانپے ہوئے تھیں۔

مریم کا بھائی، لپٹا ہوا بڑا سا خاک آلود بستر کندھے پر اٹھائے، پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ مریم نے بھائی کا بازو پکڑ کر ہلایا اور بولی، "بھیا، دیکھو، مجھے لگتا ہے یہ عورتیں کسی بڑے اور شریف گھر کی ہیں۔"

اماں نے پوچھا، "بیٹی، کیسی ہیں؟"

مریم اماں کا دل توڑنا نہ چاہتی تھی، آخر اسی کی آنکھیں اماں کی بھی آنکھیں تھیں۔ "ان کی چادریں نئی ہیں۔ ایک فوجی ساتھ ہے، ایک ہاتھ میں بڑا سا سوٹ کیس اور دوسرے میں مٹی کے تیل کی لالٹین لیے۔ ان میں سے ایک بہت لمبے قد کی ہے، چادر میں لپٹا سر و معلوم دیتی ہے۔"

بھائی نے سوال کیا، "پھر اس کھٹارا بس میں کیوں سفر کر رہی ہیں؟"

مریم بولی، "ضرور چاہتی ہوں گی کہ کسی کی نگاہ میں نہ آئیں۔"

اماں نے کہا، ''نہیں، میری جان، زیارت میں آدمی جس قدر سختی اٹھاتا ہے اسے اتنا ہی اجر ملتا ہے...''

پھر بھائی کی آواز آئی ''بھلا انھیں اور کیا چاہیے؟ سب کچھ تو ہے ان کے پاس۔''

اس چھوٹے سے خاندان کے پاس کوئی چراغ نہ تھا۔ باقی تقریباً سب کے پاس روشنی کا کچھ نہ کچھ بندوبست تھا۔ فوجی کی مٹی کے تیل کی لالٹین دوسرے لوگوں کی ٹمٹماتی لالٹینوں کے بیچ جگمگا رہی تھی۔ دوسروں کی لالٹینیں بے نام ستاروں کی طرح کبھی گم ہو جاتیں، کبھی پھر جل اٹھتیں۔ مریم بار بار رک جاتی، مڑ مڑ کر دیکھتی جیسے کسی کو ڈھونڈ رہی ہو اور وہ مل نہ رہا ہو۔ آخری بار جو رکی تو اسے اپنی ہم سفر بڑی بی کی شکل دکھائی دی جو مٹی کے تیل کی لالٹین کے گرد کھڑی عورتوں میں سے مسکرا کر اسے اشارہ کر رہی تھیں۔ بھائی سے نہ رہا گیا۔ فوراً مریم کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور بولا، ''چلو، مڑ مڑ کر دیکھنا ٹھیک نہیں۔''

''ہاتھ چھوڑو، دکھتا ہے۔ تمھیں کیا؟''

اماں نے اپنا ہمیشہ کا سبق چھیڑ دیا۔ ''مریم، بھائی جو کچھ کہے، جواب میں کہا کرو، بہت اچھا بھیا۔''

''میں نے کچھ کہا بھی نہیں۔ خواہ مخواہ بگڑ رہا ہے۔''

''اچھا اچھا، آدمی کو ہزار مصیبتیں اٹھانی ہوتی ہیں۔ میرا بہت دل کرتا ہے کہ اماں کی آنکھیں ٹھیک ہو جائیں۔ میرا دل کرتا ہے کہ تمھارا گھر بس جائے۔ میں تم دونوں سے بندھا ہوا ہوں۔ اگر نہ ہوتا تو اب تک کہیں ہندوستان جا پہنچا ہوتا۔''

اماں بولیں، ''کہو، خدا چاہے تو۔''

بدبختی کالی گھٹا کی طرح ان پر چھائی ہوئی تھی۔ اسی میں ہاتھ پیر مارتے ہوئے تینوں کبھی ایک دوسرے کا دل دکھا بیٹھتے، اور بعد میں ایک دوسرے کی ڈھارس بندھاتے۔ مریم کا دل بھائی کے لیے ایسا پگھلا کہ قریب تھا اسے گلے سے لگا لے۔ خود سے بولی، ''اسے میری بھی فکر ہے۔ میری بھی فکر ہے۔''

اماں کی آواز نے اسے طرف متوجہ کیا۔ وہ کہہ رہی تھیں، ''افسوس، رضا حرم میں نہیں جا سکتا۔ اگر جاتا تو بی بی اس کی بھی مراد پوری کر دیتیں۔ کہتے ہیں کوئی مرد حرم کے نزدیک پہنچے تو پتھر کا ہو جائے۔ پر کیا پتا، جھوٹ کہتے ہوں۔''

''میری مراد تو میرے بازو میں بندھی ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں حرم میں جاؤں اور پتھر نہ ہو جاؤں؟''

اماں نے کہا، ''بیٹا، استغفار کرو۔ آدمی کو شک کرنا خوب نہیں... میں خود تمھارے لیے چراغ جلاؤں گی۔ کہتے ہیں ایک سیاہ فام شخص نے شک کیا تھا، لیکن جب حرم کے نزدیک پہنچا تو پتھر کا ہو گیا... ایسی باتیں نہ کرو، میری طبیعت پریشان ہوتی ہے۔ ایسا کلمہ بھی منھ سے نہ نکالنا کہ حرم میں جاؤں گا... بیٹا، کہتے ہیں غار کے باہر اگا شہتوت کا پیڑ بھی مرادیں پوری کرتا ہے۔ میں اس پیڑ پر باندھنے کے لیے دعا کی دھجیاں بھی ساتھ لائی ہوں۔ ایک تمھارے لیے، ایک تمھاری بہن کے لیے، ایک تمھارے ابا کے لیے۔ اپنے لیے بھی لائی ہوں۔ مگر بی بی سے کہوں گی کہ پہلے میرے بچوں کی مرادیں پوری ہوں، پھر میری آنکھوں کو شفا بخشیں۔ وہ جوان ہیں۔ ہم تو ڈوبتا سورج ہیں۔''

مریم نے اماں کو اپنی رنج اور آرزو کی یادوں سے نکالنے کے لیے سوال کیا

''اماں، یہ سب آپ کو کس نے بتایا؟''

''اس عورت نے جو میرے پاس بیٹھی تھی۔ بتایا کہ غار میں ایک نہر ہے جو فرات سے جا ملی ہے، اور بی بی شہر بانو اسی غار سے نکل کر پہاڑ پر چڑھی تھیں۔''

''ویسے وہ بڑی بی کس لیے زیارت پر آئی ہیں؟ اپنی بہو کو کیسا ڈانٹ رہی تھیں۔ اور بہو بھی کیسا تیز تیز بول رہی تھی...''

اماں بولیں، ''پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ ہمارے اپنے گناہ کیا کم ہیں کہ دوسروں کے گناہوں کا بوجھ بھی اپنے پر لاد لیں؟''

مریم نے کہا، ''مجھے پتا ہے وہ کس لیے زیارت پر آئی ہیں۔ جس وقت آپ سے بات کر رہی تھیں، میں سن رہی تھی۔ اس لیے آئی ہیں کہ ان کی بہو حاملہ ہو جائے۔''

اس کا بہت دل چاہتا تھا کہ پلٹ کر جائے اور اس نوجوان کو تلاش کرے جو بس میں اس کے بھائی کے پاس بیٹھا تھا۔ نوجوان کی رنگت سانولی اور آنکھیں کالی تھیں۔ کاندھے اتنے چوڑے تھے کہ مریم کے ذہن سے ان کا خیال محو نہ ہوتا تھا۔

انھوں نے اپنی بساط بڑی نہر کے کنارے بچھا لی۔ پہلے انھوں نے زمین پر رات کی بڑی چادر

بچھائی اور پھر اس کے اوپر کمبل۔ موسم رفتہ رفتہ خنک ہو چلا تھا۔ نرم ہوا چل رہی تھی۔ مینڈکوں کی ٹراہٹیں دور سے آنے والی آوازوں میں گھل مل رہی تھیں۔ کچھ کچھ دیر کے بعد انھیں کسی پرندے کے پر پھڑپھڑانے کی آواز سنائی دیتی۔ اور مسافروں نے بھی اپنے اپنے بستر نہر کے کنارے بچھا لیے تھے۔ ان میں سے کچھ وضو کر رہے تھے اور کچھ نماز پڑھنے میں مشغول تھے۔ کبھی کبھی اللہ اکبر کی آواز کانوں میں پڑتی۔ فوجی کی مٹی کے تیل کی لالٹین ایک پیڑ پر لٹکی ہوئی جگمگا رہی تھی۔ بڑے اور شریف گھر کی عورتیں ایک غالیچے پر بیٹھی تھیں۔ فوجی اپنی قمیص کا گریبان کھولے ان کے سماوار کو دہکانے کے لیے پھونکیں مار رہا تھا۔ اس کی ٹوپی بھی پیڑ پر لٹکی ہوئی تھی۔ مریم کمبل پر لوگوں کی طرف چہرہ کیے ماں کے برابر میں بیٹھی تھی اور اس کی آنکھیں ماں کی آنکھوں کا کام کر رہی تھیں۔ نہیں، اس بار اس کی آنکھیں خود اپنے لیے دیکھ رہی تھیں۔ وہ کسی کھوئے ہوئے کو ڈھونڈ رہی تھی جو دکھائی نہ دیتا تھا۔ ان کے سامنے بچوں والی عورت زمین پر لیٹی بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اس کی چھاتی کھلی ہوئی تھی۔ اس کا شوہر، جو قمیص اور جانگیا پہنے تھا، اپنے کنبے کے سامان کو سمیٹ کر رکھ رہا تھا۔ دوسرے بچے جو بس میں ٹھنسے ہوئے بیٹھے تھے، اب ماں کے اردگرد منڈلا رہے تھے۔ بڑا بیٹا باپ کا ہاتھ بٹا رہا تھا اور روغن دار رکابیوں کو رنگ اڑے کمبل کی تہوں میں سے نکال نکال کر باہر رکھ رہا تھا۔ کچھ کچھ دیر بعد روٹی کا ٹکڑا ان بچوں میں سے کسی کے ہاتھ میں تھما دیتا۔

نہیں، وہ ان سب کے درمیان نہیں تھا۔

بہت سے بچوں والے خاندان کے بعد بڑی بی اور ان کی بہو بیٹھی تھیں، ان کے بعد اور لوگ، اور سب سے آخر میں بڑے گھر کی عورتیں۔ ان میں سے تین ہجوم کی طرف پیٹھ کیے بیٹھی تھیں اور دراز قد عورت کا رخ لوگوں کی طرف تھا۔ مگر وہ وہاں بھی نہ تھا۔ مریم کا دل بے چین ہو رہا تھا کہ بھائی کے لوٹنے سے پہلے اپنے راز میں ماں کو شریک کر لے۔ مگر کون سا راز؟ وہ راز جس کی بدبخت تاریکی میں مریم گم ہو گئی تھی۔ وہ اپنے گم شدہ شخص اور باقی لوگوں کے درمیان کسی رابطے کی تلاش میں تھی۔ اس نے ایک بار پھر سب پر نگاہ دوڑائی۔ لیکن بڑی بی اور ان کی بہو تک اس کے لیے اجنبی تھیں۔ لیکن وہ... اسے تو لگتا تھا وہ صدیوں سے جانتی ہے۔

آخر بھائی لوٹ آیا۔ انھوں نے رومال میں بندھا ہوا کھانا نکالا اور اندھیرے اور خاموشی میں

کھانے لگے۔ مریم اپنے خیالوں میں گم تھی، بھائی سے پوچھنا چاہتی تھی، "بھیا، تمھارا وہ ہم سفر کیا ہوا؟ اسے زمین کھا گئی کیا؟"

ایک آواز اسے اپنے آپ میں واپس لے آئی۔ "بسم اللہ، بقرہ عید۔ کسی قابل تو نہیں، پھر بھی۔"

بڑی بی اپنا محبت کا ہدیہ، نان پر رکھے ہوئے دو بڑے کباب، لیے کھڑی تھیں اور کہہ رہی تھیں، "تازہ دم کی ہوئی چائے بھی ہے۔ چاہو تو وہ بھی لاؤں؟"

ابھی وہ کھانا کھا ہی رہے تھے کہ بڑی بی چائے کے دو پیالے لیے آئیں اور ماں کے برابر میں بیٹھ گئیں۔ دونوں دیر تک باتیں کرتی رہیں اور مریم کو خوشی ہوئی کہ اماں کو کوئی ہم صحبت مل گیا۔ وہ سب تاریکی میں بیٹھے تھے۔ دوسرے مسافروں سے دور تھے۔ یا شاید دور نہیں تھے، غریب تھے اور تنہا۔ اماں کے نابینا ہونے نے انھیں باقی تمام لوگوں سے جدا کر دیا تھا، اور ان کے بچے بھی گویا اب بچے نہیں رہے تھے، وہ بھی اسی تاریکی میں زندگی بسر کرتے تھے جس نے اماں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ تنہا، اور اندھیرے میں، اور ایک ایسے دکھ کے ساتھ جو ان کے گلوں میں اٹک گیا تھا۔

بڑی بی باتیں کر رہی تھیں اور مریم کو صرف ان کی آواز سنائی دے رہی تھی اور اکا دکا فقرے۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھی۔ اس کا دل بے قرار تھا اور آنکھیں مسلسل ہجوم میں بھٹک رہی تھیں۔ کاش وہ اسے تلاش کر سکتی۔ اچانک بڑی بی کی آواز اس کے کان میں آئی اور وہ چونک پڑی۔ ان کی بات سنتے ہوئے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"اگر اسے گدھے نہ مل سکے تو بڑی ہنسی کی بات ہوگی۔ ان شان اور عزت والی عورتوں کی کرکری ہو جائے گی۔ صبح سورج نکلنے تک اسی طرح غالیچے پر بیٹھا رہنا پڑے گا۔"

مریم بھی گفتگو میں شریک ہو گئی۔ "مگر یہ ہیں کون؟ کتنے آدمی ان کے ساتھ ہیں؟" وہ اپنی ہی آواز سے حیرت میں پڑ گئی، کیسی کنویں میں سے نکل کر آ رہی تھی!

بڑی بی بولیں، "ہم غریبوں کو بڑے لوگوں کی باتوں کا کیا پتا۔ ضرور ان کے شوہر فوجی افسر ہوں گے، تبھی تو اردلی ساتھ میں ہے۔ جو جوان ان کے بستر لے کر آ رہا ہے، وہ ان کا نوکر ہوگا۔"

مریم کے گلے میں جیسے کوئی چیز اٹک رہی تھی، لیکن وہ ہنسنے کو ہوئی۔

اس نے اپنی چادر کی گٹھری سی بنا کر سر کے نیچے رکھ لی اور اماں کے برابر میں لیٹ گئی۔ بھائی کے خراٹے اونچی آواز میں پہلے ہی گونج رہے تھے۔ لیکن مریم جانتی تھی کہ اسے نیند نہیں آنے والی۔ نہ صرف اس کے سر کا تکیہ بہت نیچا تھا بلکہ اس کے بدن کے نیچے زمین سخت اور نمناک تھی۔ نہ صرف یہ کہ مسافروں کے چلنے پھرنے اور بولنے چالنے کا شور اب تک نہ تھما تھا اور زیادہ تر روشنیاں، خصوصاً مٹی کے تیل والی لالٹین، اب تک بجھی نہ تھیں بلکہ نوجوان بھی لوٹ آیا تھا اور مریم اپنے تمام حواسوں سے اس کی طرف متوجہ تھی۔ مریم اماں کی طرف پیٹھ اور لوگوں کی طرف رخ کیے کروٹ سے لیٹی تھی اور اپنی نگاہوں سے نوجوان کا متواتر پیچھا کر رہی تھی۔ اس کی توجہ نہ تو بہت سے بچوں والے خاندان کی طرف تھی جو رات کا کھانا کھانے میں مشغول تھا، اور نہ بڑی بی اور ان کی بہو کی طرف۔ سارے زائرین اس کی نظروں کے سامنے تھے لیکن اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ صرف نوجوان کو دیکھ رہی تھی جو بڑے سے سوٹ کیس میں سے کوئی چیز باہر نکال رہا تھا۔ پھر وہ اسے لالٹین میں ہوا بھرتا دکھائی دیا اور اس کے بعد بستر بچھاتا...

وہ اس وقت تک جاگتی رہی جب تک مٹی کے تیل کی لالٹین بجھ نہ گئی، اور اس کے بعد ایک ایک کر کے تمام روشنیاں۔ مریم کے پڑوسی خاندان نے صرف اپنی لالٹین کی لو نیچی کر لی۔ مریم نہیں جانتی تھی کہ نوجوان کہاں لیٹا ہوگا لیکن اتنا جانتی تھی کہ وہ بہت زیادہ دور نہیں تھا۔

اس نے بچے کی ماں پر نظر جمادی جو اس کے قریب ہی سو رہی تھی اور اس کے بچے نے ہنور اس کا سر پستان اپنے منھ میں داب رکھا تھا۔ وہ لالٹین کی مدھم روشنی میں عورت کے چہرے کو دیکھنے لگی جس کی رنگت پھیکی پڑی ہوئی تھی اور آنکھیں یوں جھکی تھیں جیسے بچے کو دیکھ رہی ہو۔ مریم کے دل میں ایک تازہ غم گھر کر رہا تھا۔ اس نے کتنی ہی دیر اپنی آنکھیں زور سے بھینچ کر رکھیں، لیکن نیند نہ آئی۔ وہ اماں سے بھی، ان کے اتنا قریب لیٹے ہونے کے باوجود، کہیں دور تھی۔ اسے کچھ نہ معلوم تھا کہ کہاں لیٹی ہوئی ہے اور کون سی رات ہے۔ جونہی خیالوں میں گم ہونے لگتی اسے وہ رات یاد آ جاتی جب اماں بینائی سے محروم ہوئی تھیں۔ یعنی جب ان کی داہنی آنکھ ضائع ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ اس وقت تک بائیں آنکھ سے دیکھ سکتی تھیں۔ مریم اور رضا نے سوگ کیا اور بہت عرصے تک اپنے ابا کو اس بات سے لاعلم رکھا۔ اسے ہمیشہ وہ دن یاد آتا جب اس نے اپنے ہم جماعتوں، اسکول کی پرنسپل اور استانیوں کو

الوداع کہا تھا۔ اس سے پچھلی رات اماں کی دوسری آنکھ بھی جاتی رہی تھی۔ وہ سرِ شب باورچی خانے سے باہر نکلیں، تالاب کے کنارے جا بیٹھیں اور زور زور سے چیخیں مارنے لگیں۔ کیسی دلدوز چیخیں تھیں وہ! ان کے منہ سے گھوڑے کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اور رات بھی کیسی سرد تھی۔ مریم سمجھ گئی کہ اماں کی آنکھیں جاتی رہیں۔ وائے! اسے وہ دن یاد آیا جب وہ اماں کو لے کر اسپتال گئی تھی اور ڈاکٹر نے ان سے کہا تھا: ''بڑی بی، آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ اب کسی دوا سے آپ کی آنکھیں روشن نہیں ہوں گی۔'' مریم رو پڑی تھی اور اماں نے کہا تھا: ''قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے!'' اسے یاد آیا کہ انھوں نے اس واقعے کو کئی دن تک خالہ، اور پھوپھی اور عم زادوں سے چھپائے رکھا تھا۔ ہر رات تینوں بیٹھ کر ابا کا انتظار کیا کرتے۔ وہ اور رضا سر جوڑ کر بیٹھتے۔ اکثر راتوں کو لالٹین بھی روشن نہ کرتے۔ روشنی کس کام کی تھی! ہر بار مریم کے خیال بدلے ہوئے ہوتے۔ ہر بار اس کے بدن میں کسی ایسی جگہ درد ہو رہا ہوتا جس پر وہ انگلی نہ رکھ سکتی۔ لیکن آج رات کون سی شے اس کی جلد کے اندر گھس گئی تھی؟ اس کے سر میں کیسے خیالات گردش کر رہے تھے؟ وہ کتنی ہی ان خیالوں پر لعنت بھیجتی اور استغفار کرتی، اس سانولی رنگت، بڑی بڑی آنکھوں اور چوڑے کاندھوں والے نوجوان کا خیال اس کے ذہن سے محو نہ ہوتا تھا۔

اس نے خود کو بچے کو دودھ پلاتے محسوس کیا لیکن اس کے پستان گول اور سخت تھے۔ اس نے ان پر ہاتھ رکھ لیے اور انھیں دو فاختاؤں کی طرح سہلانے لگی۔ پھر اس کے ہاتھ بدن پر نیچے کی طرف سرکنے لگے۔ اس کا بدن نرم اور ہاتھ کھردرے تھے۔

پھر وہ نوجوان آیا اور اماں کی جگہ لیٹ گیا۔ ''کیسی سیاہ آنکھیں ہیں!'' مریم نے خود کو سرزنش کی، ''لڑکی، حیا کر! کیا تو نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ اماں کی دل و جان سے خدمت کرے گی؟ کیا تو نے خود سے عہد نہیں کیا تھا کہ اماں کو انگلی تک نہ ہلانے دے گی؟ اماں سے نہیں کہا تھا کہ میں آپ کی آنکھیں بنوں گی؟ کہا نہیں تھا؟ جب اماں ٹٹولتی، لڑکھڑاتی باورچی خانے میں آ کر چوکی پر بیٹھ جاتیں اور پوچھتیں میں کیسے تمھارا ہاتھ بٹاؤں؟ تو تیری آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر چولھے میں نہیں گرنے لگتے تھے؟ اور کیا ایک روز اماں کو پتا نہیں چل گیا تھا؟ اور انھوں نے آ کر تیری آنکھوں پر ہاتھ نہیں رکھ دیا تھا؟ کیا تو نے ان کے گلے میں بانہیں نہیں ڈال دی تھیں؟ کیا تو نے نہیں کہا تھا اماں، میں آپ کی

آنکھیں ہوں؟ اب تو انھیں چھوڑ کر چلی جانا چاہتی ہے؟ کس طرح؟ کیسی ہنسی کی بات! اور پھر، تجھے چاہے گا کون؟"

لیکن مریم کو یقین تھا کہ کوئی اسے ضرور چاہے گا۔ اس کا تمام بدن آرزو سے چور ہوا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پھر اپنے پستانوں پر چلے آئے۔ وہ تپ رہے تھے، اور بائیں پستان کے نیچے کوئی شے زور زور سے، زور زور سے دھڑک رہی تھی۔ اپنی حالت پر اس کا دل بھر آیا۔ "کیا ایسا ممکن ہے کہ بی بی میری مراد بھی پوری کر دیں اور اماں کو شفا بھی بخش دیں اور..." رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں بھاری ہوتی چلی گئیں۔

وہ ایک وسیع صحرا میں کھڑی تھی۔ اس کے ارد گرد کھجور کے پیڑ تھے۔ دور جہاں تک نگاہ جاتی تھی، صحرا کشتوں کی لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ مریم ان لاشوں کے درمیان سرگرداں تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس کے چہرے پر نگاہ ڈالے۔ تپتے ہوئے سورج کی تیز شعاعیں اس کے سر میں گھسی جا رہی تھیں۔ خون کی بو، لاشوں کے منظر اور سورج کی تپش سے مریم کی طبیعت مالش کرنے لگی۔ وہ قے کرنے کو ہوئی۔ اس نے چاہا کہ دوڑ کر وہاں سے دور چلی جائے، لیکن قدم آگے کو نہ اٹھتا تھا۔ دور اسے دریا کے کنارے ایک خیمہ دکھائی دیا۔ خیمہ سرخ رنگ کا تھا۔ ایک سپاہی خیمے کے پردے کے باہر کھڑا تھا۔ ہاتھ میں لمبی تلوار تھی۔ اس کی زرہ کا رنگ بھی سرخ تھا۔ خیمے کے اندر کا حال صاف دکھائی نہ دیتا تھا۔ اچانک مریم نے خود کو خیمے کے پاس کھڑا پایا۔ سپاہی ٹوپی سے خود کو ہوا جھل رہا تھا۔

گھوڑے پر سوار ایک عورت تیزی سے مریم کے پاس سے گزری اور گھوڑے نے ایک لمبی زقند بھر کر اسے دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچا دیا۔ گھوڑے کے پر تھے اور وہ ہوا میں اڑ رہا تھا۔ کیسا شاندار گھوڑا تھا! سر اور گردن کیسے حسین تھے۔ لیکن ایال خون میں تر تھی۔ عورت گھوڑے پر بالکل سیدھی بیٹھی تھی لیکن چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے تھی۔

مریم دریا کے کنارے پر تھی لیکن دریا خشک تھا۔ اس نے چاہا کہ واپس جا کر سپاہی سے ایک کٹورا پانی مانگے۔ شاید پانی پی کر جان میں جان آئے۔ لیکن وہاں نہ خیمہ تھا اور نہ سپاہی۔ بہت دور اسے کالی آنکھوں والا نوجوان دکھائی دیا۔ وہ پانی کا مشکیزہ اٹھائے اور عربی لباس پہنے ہوئے، لیکن

ننگے پیر تھا۔ مریم نے بھرے ہوئے مشکیزے کو منہ سے اگایا اور پینے لگی۔ اس میں شربت گلاب تھا۔
''اے ابی عبداللہ حسین، تیرے لب تشنہ کی یاد میں۔'' مریم پیتی رہی اور سیر نہ ہوئی، یہاں تک کہ مشکیزہ خالی ہو گیا۔ مریم نے خالی مشکیزے کو ہوا میں ہلایا اور نوجوان کو دے دیا۔ بولی، ''اے جوان، خدا تمھیں آب کوثر نصیب کرے۔''

اس نے دوبارہ خود کو خیمے کے پاس پایا۔ خیمے کے اندر سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے کوئی تکرار ہو رہی ہو۔ مرد کسی ایسی زبان میں جو مریم کے لیے اجنبی تھی، آپس میں بحث کر رہے تھے۔ پھر نوجوان ایک گدھے پر بندھے دو بستروں پر بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ دور سے آ رہا تھا۔ وہ خیمے میں تھا۔

نقاب دار عورت اب دور جا چکی تھی لیکن مریم کو اب بھی دکھائی دے رہی تھی۔ دریا کے اس طرف دو جوان کھڑے تھے۔ ان کے بدن پر کشمیری جبے تھے۔ چہرے پر باریک نقاب تھی اور سر پر تاج۔ دریا کے دوسری طرف دو اور جوان، بالکل ان دو جوانوں کے ہم شکل، نقاب دار عورت کے رہوار کے پاس کھڑے تھے۔ ان جوانوں کو دیکھتے ہی مریم ان کی طرف دوڑ پڑی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ نظر سے اوجھل ہو جائیں ان کے سامنے جا پہنچی۔ اس نے ان میں سے ایک کے جبے کا دامن پکڑ لیا۔ تاجدار جوان نے اپنے چہرے کی نقاب الٹی۔ یہ وہی کالی آنکھوں والا نوجوان تھا۔ مریم نے اس سے التماس کیا۔

''اے جوان، میں راستہ بھول گئی ہوں۔ یہ صحرا بہت خوفناک ہے۔ خدارا مجھے یہاں سے باہر لے چلو۔''

جوان نے مریم کو بغل میں لیا اور چشم زدن میں دریا کے دوسرے کنارے پر کھجور کے اونچے پیڑ کے نیچے پہنچا دیا۔ لیکن خود غائب ہو گیا۔ اس کی خوشبو مریم کے بدن میں باقی رہ گئی۔ یہ مٹی کی خوشبو تھی۔ مریم کی بغل میں جہاں جوان نے اپنا ہاتھ رکھا تھا، جھرجھری سی اٹھ رہی تھی۔ اسے کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ ماشاءاللہ، کیسا قد آور اور خوش رو، وہ جوان تھا۔ کتنے چوڑے کاندھے تھے اور بالائی ہونٹ کیسا سرسبز تھا۔

مریم نقاب دار عورت کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ مریم آگے بیٹھی تھی اور گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے عورت کے بازو مریم کے پستانوں کو چھو رہے تھے۔ مریم نے مڑ کر نقاب دار عورت پر نگاہ

ڈالی۔ عورت نے نقاب اٹھائی۔ اس کا چہرہ حسن سے جگمگا رہا تھا، سورج کے تھال کی طرح بھویں آپس میں ملی ہوئی تھیں، آنکھیں بادام کی شکل کی، ناک ترشی ہوئی، ہونٹ اور دانت پتلے اور قد مریم سے سر بھر اونچا تھا۔ کشمیری جبے پہنے دو فرشتے عورت کے ہم رکاب تھے۔ دونوں کے چہروں پر نور تھا۔ ان میں سے ایک فرشتے کا بالائی ہونٹ سرسبز تھا اور چہرے پر پڑی باریک نقاب میں سے جھلک رہا تھا۔

نقاب دار عورت نے فرشتے کی طرف رخ کر کے کہا: "مریم میری ہم شہر ہے..."

"ہم جانتے ہیں، شہزادی خانم۔"

مریم نے فرشتوں سے پوچھا: "شہزادی خانم کہا تم نے؟"

"ہاں، شہزادی، دخترِ شاہ۔"

"پتا نہیں کیا کہہ رہے ہو۔"

لبوں پر سبزے والا فرشتہ مسکرایا۔ دوسرے کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ مریم کو تیوری چڑھانے والا فرشتہ نہ بھایا۔ اس کا کشمیری جبہ اس کے بدن پر بہت ڈھیلا تھا اور لٹک رہا تھا۔ اس کے چہرے کی نقاب بار بار اتر جاتی تھی اور وہ اسے بار بار ٹھیک کرتا تھا۔

وہ اجنبی سرزمینوں سے گزرے۔ بے آب و گیاہ صحراؤں، تپتے ہوئے بیابانوں، اور آب اور خاک کے قسم قسم کے قطعوں سے۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز متواتر آتی رہی۔

فرشتے تھک گئے تھے۔ انھوں نے اپنے تاج اتار لیے تھے اور ان سے خود کو ہوا جھل رہے تھے۔ تیوری چڑھانے والے فرشتے کی نقاب اتر چکی تھی اور مسکرانے والے فرشتے نے اپنی نقاب سر کے اوپر کھینچ لی تھی۔ ایک بار اس خوش رو فرشتے کا جبہ اس کے بدن سے الگ ہوا تو مریم کو اس کی پیٹھ پر دو چھوٹے چھوٹے خوبصورت پر دکھائی دیے۔

پھر وہ ایک پہاڑی خطے میں پہنچے۔ جہاں تک آنکھ کام کرتی تھی، پہاڑوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ دروں میں نیلا پانی بہہ رہا تھا۔ نقاب دار عورت نے فرشتوں کو واپس بھیج دیا۔ بولی، "پہنچ گئے۔ اب تم لوگ واپس جا سکتے ہو۔ یہ جگہ میری جانی پہچانی ہے۔" فرشتوں نے اپنے جبے اتارے، جھاڑے اور تہہ کر کے بغل میں دبا لیے۔ پھر وہ اپنے پر پھڑ پھڑانے لگے، اور کبوتروں کی طرح پرواز کر گئے۔

مریم نقاب دار عورت سے بات کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ اس کا

منہ کھلتا لیکن کوئی آواز برآمد نہ ہوتی۔

اچانک نقاب دار عورت بولی، "میں شہر بانو ہوں۔"

مریم فوراً سمجھ گئی۔ پکار کر بولی، "اے دل غافل! بی بی، میں تو آپ ہی کی تلاش میں نکلی تھی۔ آپ سے کیا خوب ملاقات ہوئی۔ میری مراد پوری کیجیے۔ نہیں نہیں، پہلے میری اماں کو شفا دیجیے۔ میں چاندی کی دو آنکھیں نذر میں لائی ہوں۔ دیکھوں کہاں ہیں۔" اس نے اپنا سینہ ٹٹولا، لیکن چاندی کی آنکھیں وہاں نہ تھیں۔ کہاں گر پڑیں؟ مریم نے بہت ڈھونڈا، مگر نہ ملیں۔

ایک اندھیرا غار تھا جس میں سے نقاب دار عورت اور مریم گزر رہی تھیں۔ غار کے فرش پر پتلی سی نہر بہہ رہی تھی۔ گھوڑے کے سُم کیچڑ میں دھنسنے لگے۔ غار ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ وہ آگے بڑھتے گئے اور تاریکی قائم رہی۔ مریم گھوڑے کی ایال سے چمٹی ہوئی تھی۔ وہ التجا کرنا چاہتی تھی، لیکن اس کے منہ سے پھر کوئی آواز نہ نکلی۔ شہر بانو نے کہا، "نیچے اتر جاؤ، اور چاندی کی آنکھیں ڈھونڈ کر لاؤ۔"

اچانک ان کی آنکھوں پر روشنی پڑی۔ اپنے سامنے سرخ ملبوس اور سرخ زرہ والے سوار، سر پر کلاہ اور پیروں میں جوتے پہنے، ہاتھوں میں ننگی تلواریں سونتے دکھائی دیے۔ وہ قہقہے لگا رہے تھے۔ مریم اب گھوڑے پر سوار نہ تھی۔ شہر بانو نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، اور مریم نے دیکھا کہ ان کے منہ سے نکلا، "اے پہاڑ، مجھے اگل دے!" اور پہاڑ نے اپنا اژدہے جیسا منہ کھولا اور شہر بانو کو گھوڑے سمیت نگل گیا۔ پھر پہاڑ پھاٹک کی طرح بند ہو گیا لیکن ان کی پھول دار چادر وہاں اٹکی رہ گئی۔ ان کی نقاب زمین پر آ گری تھی۔ سرخ پوش سپاہیوں کے قہقہے پہاڑوں میں گونج رہے تھے۔

مریم نے اماں کو فجر کی نماز کے لیے بیدار کیا۔ وہ خود بہت پہلے جاگ گئی تھی۔ شاید اس کی آنکھ لگی ہی نہ تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی کہ رات اس نے خواب دیکھا تھا یا خیال باندھا تھا، وہ نیند میں تھی یا بیدار؟ آخر وہ اٹھ کر اماں کو وضو کرانے نہر کے کنارے لے گئی۔

مریم نے اپنے چہرے پر پانی کے دو تین چھپاکے مارے اور چلو بھر پانی پیا۔ خود سے بولی، "اگر یہ خواب تھا تو گھوڑے کی ایال ضرور مراد ہے اور بی بی یقیناً میری اور اماں کی مراد پوری کرنے والی ہیں۔"

مریم وضو کر کے اماں کے انتظار میں نہر کے کنارے کھڑی تھی کہ وہی نوجوان، سماور ہاتھ میں

اٹھائے، نہر کے پاس آیا۔ مریم بے دست و پا ہو کر رہ گئی۔ اس نے چادر میں چہرہ چھپا لیا۔ نوجوان نہر کے کنارے بیٹھ گیا۔ اماں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور ہاتھ پھیلائے ہوئے تھیں۔ مریم نے انھیں دیکھا، نوجوان کو بھی دیکھا جو سماوار کو دھو رہا تھا۔ اس نے اماں کا ہاتھ نہ تھاما۔ اس کے حواس گم تھے۔ اماں کی آواز آئی "بیٹی، مریم، کہاں چلی گئیں؟" مریم نے سنا لیکن کچھ جواب نہ دیا۔ اماں کا ہاتھ پہلے مریم کی چادر پر پڑا اور پھر ہاتھ پر۔ بولیں، "مریم جان، کیا سردی سے کانپ رہی ہو؟" پھر وہ دونوں چلنے لگیں۔

دونوں نماز کے لیے کھڑی ہو گئیں۔ لیکن مریم کے حواس بجا نہ تھے۔ 'شرفا' کے گھر کی عورتیں بھی پھول دار چادریں اوڑھے نماز پڑھ رہی تھیں۔ نوجوان نے سماوار غالیچے پر رکھ دیا تھا اور اردلی سوٹ کیس بند کر رہا تھا۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ تمام نمازیوں نے اپنی نماز توڑ دی۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ مریم کے برابر والے خاندان کا باپ اپنے چھوٹے لڑکے کو یوں اٹھائے کھڑا تھا جیسے کوئی ڈوبا ہوا چوہا ہو۔ بچہ پانی میں شرابور تھا اور اس کے بالوں سے بھی پانی ٹپک رہا تھا۔ پھر باپ نے اسے لا کر ماں کے پہلو میں لٹا دیا جو شیر خوار بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اس نے شیر خوار بچے کو خود سے الگ کیا اور دونوں ہاتھوں سے سر پیٹنے لگی۔ چھوٹے بڑے سب بچے ماں باپ کے ارد گرد زمین پر بیٹھے تھے۔ کچھ رو رہے تھے اور کچھ سہمے ہوئے تھے۔ ماں رو رو کر سر پر ہاتھ مار رہی تھی۔ اس کی گود کا بچہ بھی رو رہا تھا۔ مریم، جس نے نماز کی چادر کو گلے کے نیچے گرہ دے رکھی تھی، اسی طرح ننگے پیر بچوں کی ماں کی طرف لپکی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اماں بھی ٹنول ٹنول کر ان دونوں تک آ پہنچیں۔ مریم نے شیر خوار بچے کو ماں کی گود سے لے لیا۔ بچہ اس کی گود میں بدن اکڑا اکڑا کر رو رہا تھا۔ اماں بچوں کی ماں کے پاس زمین پر بیٹھ گئیں۔ پوچھا، "تم پر کیا افتاد پڑی، بہن، کیا ہوا؟" اور اس کے سینے اور گردن کو سہلانے لگیں۔

عورت روتے ہوئے بولی، "میرا بچہ نہر میں گر پڑا۔"

اماں نے پوچھا، "تو کیا اسے کچھ ہو گیا؟"

"اب تک ہوش میں نہیں آیا۔ میں اس لیے زیارت پر آئی تھی کہ بی بی اب مجھے اور بچے نہ بخشیں۔ اس لیے نہیں کہ جو ہیں وہ بھی جاتے رہیں۔ اے خدا، مجھے موت دے دے۔ کیسی ناشکری کی میں نے!... بچے کو کس قدر ستایا" یہ کہہ کر وہ دوبارہ رونے لگی۔

سارے مسافر ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ دراز قد عورت نے بچے کو پیروں سے پکڑ کر ہوا میں

اٹھایا۔ پھر اسے زمین پر لٹا کر اس کے منھ پر منھ رکھا اور تنفس دیا۔ ایک بار پھر ایسا ہی کیا، اور پھر بچے کے بازو پکڑ کر اسے اوپر نیچے جھلانے لگی۔ مریم نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ بچے کے بدن میں جنبش ہوئی اور زرد عورت بولی: ''الٰہی، تیرا شکر!''

مریم کی متلاشی نگاہ بھٹکتی ہوئی بھائی پر جا ٹکی جو نوجوان سے باتوں میں مشغول تھا۔ اس کا دل پھر بے قرار ہو گیا۔ اس نے اپنی گود کے بچے کو زور سے بھینچا۔ اس میں کون سا احساس بیدار ہو رہا تھا؟ جیسے کسی اور کا بچہ اس کی آرزو کے درخت کا پھل تھا۔ بچے سے صرف دودھ کی بو نہیں آ رہی تھی۔ لیکن پھر بھی مریم اسے خود سے جدا نہ کرنا چاہتی تھی۔

آخر سب کچھ پرسکون ہو گیا۔ مریم نے رات کا بچا ہوا کھانا کمبل پر چن دیا تا کہ ناشتہ کر کے وہ لوگ زیارت کے لیے جائیں۔ وہ اماں اور بھائی کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ اماں بڑی بی سے باتوں میں لگی تھیں اور بھائی نوجوان سے۔ مریم نے اپنے سینے میں ہاتھ ڈال کر دعا کا سبز بستہ باہر نکالا۔ اس پر بندھی ہوئی سبز ڈوری کھولی۔ اچانک وہ اپنے دل کی مراد کو اچھی طرح جان گئی۔ بھائی آ کر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ پھر بڑی بی اماں کو لے کر آ گئیں۔ اماں کی صورت ہمیشہ سے زیادہ شکستہ معلوم ہو رہی تھی، جیسے تراشی ہوئی ہو۔ رنگت خاکستری ہو رہی تھی۔ مریم نے پوچھا: ''ماں، کیا بات ہے؟''

اماں بیٹھ گئیں اور کھانا کھاتے ہوئے بولیں: ''لا الہ الا اللہ۔ کیا لوگ ہیں!''

مریم کے بھائی نے پوچھا: ''ہوا کیا؟''

''یہی بڑی بی، جو ہماری ہم سفر تھیں، مریم کا رشتہ مانگ رہی تھیں۔''

مریم کا بھائی خوشی سے اچھل پڑا اور بولا: ''واقعی؟ کیا ان کا کوئی بن بیاہا بیٹا ہے؟''

''نہیں، اسی بیٹے کے لیے جو شادی شدہ ہے۔ اس کی بیوی کے بچہ نہیں ہوتا۔''

''یعنی میں اس کی سوکن بنوں؟''

''ہاں...''

''نہیں اماں، میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میں آپ کی آنکھیں ہوں۔''

اور مریم نہ جانے کیوں اچانک خوش ہو گئی۔ اماں سیدھی بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے کی تمام جھریوں میں ایک عزم جھلک رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے ان کی آنکھوں میں بینائی کی لہر سی کوند گئی ہو۔ بولیں،

Scanned with CamScanner

''میں اپنے جگر گوشے کی قسمت ہرگز، ہرگز خراب نہیں کروں گی۔'' یوں معلوم ہوتا تھا گویا تن تنہا بدبختی سے لڑنے اٹھ کھڑی ہوں گی۔ نیند سے بیدار ہونے والی کسی شیرنی کی طرح جس نے سر اٹھا رکھا ہو لیکن جس کی آنکھیں ابھی اجالے سے مانوس نہ ہوئی ہوں۔

❋❋

سیمین دانشور

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

بہشت جیسا شہر

ہر رات سیہ فام لڑکی مہرانگیز آتی اور بچوں کے کمرے میں سونے کے لیے لیٹ جاتی۔ پانچ دروازوں والے بڑے کمرے میں بستر برابر برابر بچھائے جاتے تھے اور علی اور اس کی دونوں بہنیں کمرے میں اپنے کھیل کود کا گرد و غبار پھیلا کر اپنے اپنے بستر پر لیٹ جاتے تھے۔ اس قطار کا کونے والا، سب سے پرانا بستر مہرانگیز کا ہوتا تھا۔ بڑی بہن چراغ کی لو دھیمی کر دیتی تاکہ مہرانگیز آ جائے۔ مہرانگیز بڑے کمرے کے سامنے باورچی خانے میں برتن دھو رہی ہوتی۔ علی کو برتنوں کے بجنے اور پانی کے بہنے کی آوازیں سنائی دیا کرتیں اور جب مہرانگیز باورچی خانے کی بتی بجھا دیتی تو علی خوشی کے مارے اپنے بستر پر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا اور جھک کر تکیے میں سر دے لیتا۔ مہرانگیز پھونک مار کر چراغ بجھا دیتی اور بستر پر دراز ہو جاتی۔ اتنی آہستگی سے کہ اگر علی اس کے انتظار میں جاگ نہ رہا ہوتا تو اسے اس کے کمرے میں آنے کا پتا بھی نہ چلتا۔ پھر علی مہرانگیز کو آواز دے کر اس سے کہانی سنانے کی فرمائش کرتا۔ اور ہر رات وہی کہانیاں دہرائی جاتیں، مہرانگیز اور اس کی ماں، اور دوسری حبشنوں کی کہانیاں۔

مہرانگیز کی ماں ابھی بچہ ہوتی ہے، ور بالکل ننگی دوسرے سیاہ فام بچوں کے ساتھ دریا کے کنارے کھیل رہی ہوتی ہے کہ ایک آدمی، کفیہ پہنے اور سر پر عقال باندھے، اونٹ کے کجاوے سے اترتا ہے اور زور سے عربی میں پکارتا ہے: "آ! آ!" صرف مہرانگیز کی ماں، جو بہت کم سن ہے، دوڑ کر اس کی طرف آتی ہے۔ آدمی کچھ شکر چڑھے بادام اس کے ہاتھ میں تھماتا ہے اور اسے بغل سے اٹھا کر کجاوے میں

ڈال لیتا ہے۔ مہرانگیز کی ماں، جو بہت چھوٹی ہے، رونے چلانے اور ہاتھ پیر مارنے لگتی ہے۔ آدمی کا ہاتھ اس کے منہ کو کس کر بند کر دیتا ہے۔ مہرانگیز کی ماں ہاتھ پر کاٹ لیتی ہے۔ وہ ہاتھ اس کے منہ پر زور کا تھپڑ رسید کرتا ہے اور منہ سے خون بہنے لگتا ہے۔ پھر وہ رو رو کر نڈھال ہو جاتی ہے اور تھک کر سو جاتی ہے۔ بیدار ہونے پر خود کو ایک جہاز میں پاتی ہے۔ وہاں نہ اس کی ماں ہے نہ باپ۔ لیکن کالے مرد عورتیں اور بچے بڑی تعداد میں ہیں۔ پھر وہ روتی رہتی ہے، روتی رہتی ہے، یہاں تک کہ ایک سیاہ فام عورت اس کے ہاتھ میں ایک سیب دے دیتی ہے۔ مہرانگیز کی ماں، اپنے بھولپن میں، اس عورت سے پوچھتی ہے، ''اماں کے پاس جا رہے ہیں نا؟'' سیاہ فام عورت اپنے ہاتھ کو دوسرے ہاتھ کی پشت پر زور سے مارتی ہے اور اپنی زبان میں کہتی ہے، ''اے داد بیداد! اے داد بیداد!'' مہرانگیز کی ماں کو اب تک وہ زبان یاد ہے، لیکن مہرانگیز کو نہیں آتی۔ پھر مہرانگیز کی ماں کو علی کے نانا کے ہاتھ بیچ دیا جاتا ہے جو اس کا نام رکھتے ہیں باجی دلنواز۔

علی یہ کہانی بے شمار بار سن چکا تھا اور ہر رات اسے نئے سرے سے سن کر وہ قول دیتا کہ اگر کہیں وہ اجنبی آدمی اسے مل گیا تو وہ باورچی خانے کی چھری سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ اور مہرانگیز کہتی، ''اچھا ٹھیک ہے، اب سو جاؤ۔'' کسی اور رات یہ کہانی سنائی جاتی۔ نور الصباح جو نواب کی حبشی کنیز تھی، تمام حبشنوں سے بڑھ کر تھی۔ ایک تو اس کی رنگت دلنواز اور مہرانگیز جیسی سیاہ نہیں تھی۔ ناک چپٹی ہوئی نہیں بلکہ چھوٹی تھی۔ آنکھیں بھی گول نہیں بلکہ بادام کی شکل کی تھیں۔ بال بھی ان دو سیاہ فام لڑکیوں کے مجسموں جیسے گھنگھریالے نہیں تھے جو استقبالی کمرے میں لگی ہوئی بڑی گھڑی کے دونوں طرف رکھے ہوئے ہیں۔ ''میری طرح نہیں تھی، جانم، کہ بھنویں ہیں ہی نہیں، آنکھیں ہیں تو پھٹے ہوئے مٹروں جیسی، ناک ہے تو چٹائی کی طرح چپٹی، ہونٹ ہیں تو چھڑیوں جیسے۔ جانم، میں ابھی تمہارے نانا جان کے گھر میں رہتی تھی کہ ایک دن وہ آقا نواب کے گھر سے آقا بزرگ کے گھر آئی۔ وہ سب گھر والوں کو آقا نواب کے پرسے کے لیے بلاوا دینے آئی تھی۔ آقا نواب کو تو غسل خانے کے سامنے گولی مار دی گئی تھی۔ سر پر سیاہ کریپ کی اوڑھنی لیے ہوئے تھی۔ جب کمرے کے دروازے سے اندر آئی تو سر کو جھکا لیا کہ کہیں چوکھٹ سے نہ ٹکرا جائے، کیونکہ لمبے قد کی تھی۔ اس نے خانم بزرگ کے شانے کو بھی نہیں چوما۔ کہا تو بس اتنا، سلام۔ پھر سیاہ ریشمی رومال میں بندھی قہوے کے بیجوں سے بھری طشتری

نکالی اور خانم بزرگ کے سامنے رکھ دی...

''بعد میں پورے شیراز شہر میں خبر پھیل گئی کہ وہ کون تھی اور کیا تھی۔ جانم، ایک روز تین بالکل نئی بگھیاں آقا نواب کے گھر کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں۔ سب سے آگے والی بگھی میں سے ایک سیاہ فام آدمی، کوٹ پتلون اور فردار ٹوپی پہنے نکلتا ہے۔ اس کے پیچھے اور سیاہ فام آدمی، سب کے سب فردار ٹوپیاں پہنے اور ٹائیاں اور بولگائے ہوئے۔ ان سب کے آخر میں ایک اور شخص اترتا ہے جس کے ہاتھ میں سرخ مخمل کی پوشش والا ایک صندوقچہ ہے۔ جانم، یہ سب نورالصباح کے شہر کے وزیر وزرا ہوتے ہیں۔ وہ آقا نواب کے دروازے پر دستک دے کر گھر میں آ جاتے ہیں۔ خانم نواب نورالصباح کو بلواتی ہے، اور جب نورالصباح آتی ہے تو یہ سب سیاہ فام مرد اس کی تعظیم میں جھک جاتے ہیں۔ بار بار جھکتے ہیں۔ صندوقچے میں، جانم، بنارسی لباس اور ہیرے جواہر ہوتے ہیں۔ وہ یہ سب نورالصباح کو دیتے ہیں اور وہ پہن لیتی ہے۔ جب وہ ان کے ساتھ بگھی میں سوار ہونے کو چلتی ہے تو وہ سب دوبارہ اس کی تعظیم میں جھکتے ہیں۔ اتنا جھکتے ہیں کہ سر گھٹنوں کو چھونے لگتا ہے... اب وہ ضرور اپنے شہر کی ملکہ ہوگی۔ اس دن کے بعد سے، جانم، شیراز کی تمام حبشنوں کی آرزو ہے کہ کوئی آئے اور انھیں اپنے ساتھ لے جائے۔''

اور علی کہتا، ''شاید تمھیں بھی لینے آئیں۔ ننھ، اگر وہ آئے تو کیا تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟''

مہرانگیز جواب دیتی، ''اب سو جاؤ۔ صبح ہوگی تو دیکھا جائے گا۔''

اس طرح علی کو معلوم ہوا کہ باجی دلنواز مہرانگیز کی ماں ہے۔ لیکن اس کا باپ؟ علی کی اماں ہمیشہ اپنے ابا کی کنیزوں کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ اور اس دسترخوان کا جس پر بیس آدمی بیٹھتے تھے۔ اور اپنی اماں کے سفرِ حج کا اور اپنے ابا کے مذاق کا جو وہ جہاز کے کپتان سے کیا کرتے تھے۔ لیکن ان سب کو اس نے دیکھا نہ تھا، بس ان کے قصے ہی سنے تھے۔

علی کی اماں بتایا کرتیں کہ باجی دلنواز ساری کنیزوں میں سب سے زیادہ قرب رکھتی تھی۔ یہاں تک کہ مکہ کے سفر میں بھی وہ ساتھ گئی تھی۔ البتہ اس سفر سے واپسی پر اس کا دماغ ٹھکانے پر نہ رہا۔ کیسی کیسی باتیں کرنے لگی تھی! مہرانگیز بھی آقازادوں اور خانم زادوں کے کھیل کود کی ساتھی تھی۔ وہ اماں کو غصہ تھا کہ مجبوراً انھیں مہرانگیز کو اپنے شوہر کے گھر میں کام پر لگانا پڑا تھا۔ ''اپنے جہیز میں آنے والی کنیز کو

کون کام پر لگاتا ہے۔ وہ تو خانم کے صندوق کی نگران ہوتی ہے۔ مگر یہاں صندوق ہی کہاں رکھا ہے کہ مہرانگیز اس کی نگرانی کرے۔"

علی کو یہ بھی یاد تھا کہ ایک روز باجی دلنواز، لاٹھی ٹیکتی ہوئی اور پھٹے پرانے چیتھڑے پہنے، کسی بوڑھے درخت جیسی، ان کے گھر آئی تھی۔ علی کی اماں حوض کے پاس بیٹھی وضو کر رہی تھیں۔ پیروں کا مسح کرتے ہوئے انھوں نے پکار کر کہا تھا: "مہرانگیز، ادھر آ، تیری ماں آئی ہے۔" مہرانگیز لپک کر باورچی خانے سے باہر نکلی تھی اور اپنی ماں سے لپٹ گئی تھی۔

علی کی اماں نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی تھیں۔ علی اور اس کی دونوں بہنیں استقبالی کمرے میں جمع تھے اور ہمیشہ کے برخلاف ساکت اور دوزانو بیٹھے تھے۔ باجی دلنواز کمرے کے کونے میں، دروازے کے پاس بیٹھی تھی، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ بتا رہی تھی کہ اس کے مالک نے اس بڑھاپے میں اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ اب اس کے پاس سر چھپانے کو کوئی جگہ نہیں ہے۔ علی اور اس کی چھوٹی بہن رونے لگے۔ لیکن بڑی بہن بولی: "چلو، چل کر کھیلتے ہیں۔" علی کی چھوٹی بہن نے اپنا پرانا کوٹ لا کر دلنواز کو دے دیا۔ علی کو اس کی یہ بات اچھی لگی۔ وہ بھی جا کر اپنی چھپائی ہوئی کشمشیں اور دوسری چیزیں نکال لایا اور دلنواز کے دامن میں ڈال دیں۔ اماں اسی طرح نماز پڑھتی رہیں اور نماز پڑھتے میں کبھی کبھی ان کی آواز اونچی ہو جاتی۔ علی اپنی کمسنی کے باوجود سمجھ گیا کہ وہ انھیں جھڑکیاں دے رہی ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھ گیا کہ وہ اپنی نماز کو جان بوجھ کر طول دے رہی ہیں۔ دعائے قنوت کو انھوں نے اتنا لمبا کر دیا کہ علی کا صبر جاتا رہا۔ آخرکار جب اماں نے تین بار اپنے زانو پر ہاتھ مارا، تب علی کی سانس میں سانس آئی۔ دلنواز نے آ کر اماں کے شانے کو بوسہ دیا۔ اس سے بات نہ کی جاتی تھی۔ وہ اپنی کہانی شروع سے سنانے لگی۔ "اگر آقا زندہ ہوتے تو آج میں یوں دربدر نہ ہوتی۔"

علی کی اماں نے کہا: "یہ سب میں پہلے بھی سن چکی ہوں۔ اب بس کر۔ بس۔"

دلنواز بولی: "اگر اجازت دیں تو میں کوئلے کی کوٹھری میں آج رات رہ جاؤں۔"

اماں نے کہا: "یہ نہیں ہو سکتا۔ آخر ہم کتنوں کو پالیں؟ یہاں مہرانگیز ہی فالتو ہے۔"

دلنواز بولی: "مجھے بھیک مانگنی پڑ جائے گی۔ معذور ہوں۔"

اماں نے کہا: "تو میں کیا کروں؟ بھیک مانگنی ہے تو مانگ۔"

علی اور اس کی چھوٹی بہن رو کر اماں سے التجا کرنے لگے کہ دلنواز کو رکھ لیں۔ اماں نے دونوں کو گھور کر دیکھا۔

پھر دالان سے دلنواز کے لاٹھی ٹیکنے کی آواز انھیں سنائی دی۔ کھڑکی کے تختے اوپر اٹھے ہوئے تھے اور علی چوکھٹ میں بیٹھا اماں سے بار بار وہی التجا کر رہا تھا۔ اماں نے کہا، ''لڑکے، نیچے اترو۔ دیکھتی ہوں۔'' پھر پکار کر بولیں، ''دلنواز، منور خانم کے گھر چلی جا۔ بڑی بہن ہوں تو آخر کیا گناہ ہو گیا؟''

پھر علی باورچی خانے میں مہرانگیز کے پاس گیا۔ مہرانگیز چولھے میں ایندھن ڈال رہی تھی، علی اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ مہرانگیز کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر نیچے گر رہے تھے۔ ایک آنسو اس کی ٹھوڑی سے ٹپک کر گردن پر گرا۔ علی نے کہا، ''نہ جان، روؤ مت۔ اگر خالہ نے انھیں نہ رکھا تو میں بڑا ہو کر...''

مہرانگیز بولی، ''روتی نہیں رہی ہوں۔ آنکھوں میں دھواں چلا گیا ہے۔''

علی نے کہا، ''کہاں ہے دھواں؟''

مہرانگیز اپنی ناک پر انگلی رکھ کر بولی، ''خانم سے مت کہنا کہ میں رو رہی تھی۔''

ایک مہینہ گزرا۔ یا شاید ایک مہینہ بھی پورا نہیں ہوا تھا۔ ایک روز سہ پہر کے وقت منور خانم کے میاں مہرانگیز کو ڈھونڈتے ہوئے آئے۔ مہرانگیز حمام گئی ہوئی تھی۔ منور خانم کے میاں نے علی کی اماں سے سرگوشی میں کچھ باتیں کیں، جس پر اماں نے سر ہلایا اور کہا، ''لا الہ الا اللہ! میری بہن کس مصیبت میں پڑ گئی۔'' پھر وہ انھیں اور بولیں، ''علی، دوڑ کر حمام جاؤ اور مہرانگیز سے کہو فوراً آئے۔'' ابھی علی جوتے پہن رہا تھا کہ اس نے اماں کو منور خانم کے میاں سے کہتے سنا، ''آپ بھی چلے جائیے۔ میں نہیں چاہتی وہ یہاں آ کر چیخ پکار مچائے۔ اسے وہیں سے لے جائیے۔''

علی اور اس کے خالو حمام پہنچے اور کپڑوں کے پردے کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ خالو نے حمام کی مالکن کو بلایا اور اس سے دھیمی آواز میں کچھ کہا۔ مالکن چلی گئی اور یہ دونوں پردے کے پاس کھڑے رہے۔ علی نے مہرانگیز کو کہتے سنا، ''میں اپنا یہ کمبخت سر دھولوں تو آتی ہوں۔'' جواب میں مالکن نے کہا، ''نہیں، بہت ضروری کام ہے۔ جلدی کرو۔''

مہر انگیز کی آواز آئی: ''کیا کوئی میرا رشتہ لے کر آ گیا ہے، مالکن؟'' پھر اس کے چٹکی بجانے کی آواز سنائی دی۔ مالکن بولی: ''تمھاری ماں مر رہی ہے اور تم چٹکیاں بجا رہی ہو؟''

اس پر کسی کے رونے کی چیخ سنائی دی کہ علی رو پڑا۔

تینوں چل پڑے اور گلی میں تین بار مہر انگیز ٹھوکر کھا کر گری۔ وہ منور خانم کے گھر میں داخل ہوئے۔

منور خانم نے خالہ سے پوچھا: ''بچے ساتھ آئے ہیں؟''

''خود ہی آ گئے۔''

خالہ نے پکارا: ''علی، ادھر آؤ، دیکھو تمھاری جان آئی ہے۔'' پھر خالہ سے مخاطب ہو کر بولیں: ''خدا اس کی روح کو سکون دے۔ بڑی دقت سے مری ہے۔ بہت برا ہوا ہے۔''

''یہ دیکھو تیسرے چچے ... بیٹھو، مرد وہ تھیں۔''

علی نے پوچھا: ''نانی، وہ مر گئی کیا؟''

انھوں نے کہا: ''ہاں مر گئی۔ اب اسے خدا کے پاس جا رہے ہیں۔''

منور خانم کے دفن ہونے کے بعد مہر انگیز صرف تربت ہی کی قبر پر گئے۔ بہت بھٹکتے پھرے، بہت ڈھونڈنے کے بعد وقت ہوا، تب انھوں نے قبر کا پتا پایا۔ وہ مٹی کا ایک ڈھیر تھا جس کے سرہانے ایک اینٹ رکھی ہوئی تھی۔ مہر انگیز اس ڈھیر سے لپٹ گئی اور یوں پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ علی ڈر گیا۔

اس رات علی کو بخار چڑھتا رہا۔ مہر انگیز باورچی خانے کا چراغ بجھا کر آئے اور کہانیاں سنائے۔ اب ان کہانیوں میں ایک نئی کہانی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی ماں کی موت کی کہانی کا۔ لیکن مہر انگیز نہ آ رہی تھی۔ باورچی خانے کا چراغ بجھ گیا تب بھی مہر انگیز نہ آئی۔ علی کو بے قراری کے ساتھ نیند آ گئی تھی ... رات دیر تک جاگتی رہی کہ اسے مہر انگیز کے کوٹھری میں بولنے کی آواز آئی اور پھر اس کے سامنے سے علی کے ابا کا سایہ گزرا۔

علی کے ابا کی عینک گم ہو گئی۔ رات بھر جلد ڈھونڈا گیا، یہاں تک کہ بچے بھی اس تلاش میں شامل ہوئے، لیکن اماں کو ذرا خیال نہ ہوا کہ آقا کی عینک گم ہو گئی ہے، اور انھوں نے اس تلاش میں کوئی مدد نہ

Scanned with CamScanner

کی۔ان کے ہونٹوں پر کٹیلی مسکراہٹ تھی۔علی کو یہ مسکراہٹ اچھی نہ لگی۔علی اماں کی جانماز کے پاس گیا کہ کہیں ابا کی عینک جانماز کی تہوں میں نہ ہو۔ابھی اس نے جانماز کو کھولا ہی تھا کہ اماں نے اسے بازو سے پکڑ کر کمرے کے بیچ میں پٹک دیا۔ چیخ کر بولیں،''ناپاک کر دو گے!'' آخر ابا بغیر عینک کے کام پر گئے۔اس کے بعد رات کو عینک لگا کر سونے لگے۔ابھی علی نے اسکول جانا شروع نہیں کیا تھا۔لیکن دونوں بہنیں اسکول جاتی تھیں۔مہر انگیز بچیوں کو اسکول پہنچاتی اور واپس لاتی تھی۔علی کی اماں باورچی خانے میں تھیں۔علی کھڑکی کی چوکھٹ میں بیٹھا تھا۔جونہی مہر انگیز باورچی خانے میں داخل ہوئی، اماں نے ایندھن کی ایک لکڑی اٹھا کر اس کے سر پر ماری۔علی فوراً کھڑکی سے صحن میں کود پڑا، بھاگ کر باورچی خانے میں گیا وراماں کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔وہ رو رہا تھا۔لیکن اماں کے ہونٹوں پر وہی کٹیلی مسکراہٹ تھی۔مہر انگیز کا سر پھٹ گیا تھا اور خون بہہ رہا تھا۔علی روتے ہوئے بولا،''مت ماریں، مجھے ڈر لگتا ہے، مجھے ڈر لگتا ہے۔'' لیکن مہر انگیز بالکل نہیں رو رہی تھی۔اماں بولیں،''خون اس حبشن کے بہہ رہا ہے۔تمھیں کیا تکلیف ہے؟'' پھر مہر انگیز صحن میں حوض کے پاس جا کر اپنے سر کا زخم دھونے لگی۔لیکن خون بند ہی نہ ہوتا تھا اور علی کو مہر انگیز کے نہ رونے پر حیرت ہو رہی تھی۔اماں نے حوض کے پاس رکھی حقے کی چلم اٹھائی اور جلا ہوا تمباکو مہر انگیز کے سر کے زخم میں بھرنے لگیں۔بولیں،''آخر تجھے رنڈی ہی بننا ہے۔'' علی پوچھتا رہا،''رنڈی کیا ہوتی ہے؟'' اماں نے کہا،''میں بلاتی ہوں دائی کو۔'' علی نے کہا،''دائی کون؟'' مہر انگیز رونے لگی۔

گرمیوں میں خرابی یہ تھی کہ علی اور مہر انگیز میں جدائی ہو جاتی تھی۔حوض کے پاس بستر لگ جاتے اور اماں، ابا اور بچے ان پر سوتے۔مہر انگیز صحن کے بیچ میں زمین پر سوتی۔

ایک روز مغرب کے وقت منور خانم اور ان کی بیٹی نیراں کے گھر آئیں۔منور خانم علی کی اماں کے پاس بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئیں۔حقے کی نے ان کے ہونٹوں میں دبی ہوئی تھی اور وہ آہستہ آہستہ اماں سے کچھ باتیں کر رہی تھیں۔وہ روتی جا رہی تھیں اور اپنے پلو سے آنسو پونچھتی جا رہی تھیں۔بچے استقبالی کمرے کو جانے والی سیڑھیوں پر قلعہ گیری کھیل رہے تھے۔نیر اور علی ایک پالی میں تھے اور باقی بچے دوسری میں۔ایک بار جب نیر اور علی نے قلعہ فتح کر لیا تو ایک دوسرے کے گلے میں

باتیں کر کے ایک دوسرے کو چوم لیا۔ علی کی اماں کی نگاہ کھیلتے ہوئے بچوں پر تھی اور کان بہن کی درد بھری کہانی پر۔ علی کو پکار کر بولیں، "بیٹے، کیا کر رہے ہو؟ شرم کرو۔" منور خانم ہنستے ہنستے بتا کر کہنے لگیں، "کیا حرج ہے، بہن؟ کیا ہم نے انھیں ایک دوسرے کے لیے بڑا نہیں کیا ہے؟" اماں نے کہا، "دیکھو تقدیر کیا دکھاتی ہے۔"

منور خانم اور ان کی بیٹی اس رات وہیں ٹھہرے اور علی کے ابا کی جگہ تخت پر سوئے۔ بہت بحث تکرار کے بعد مہر انگیز کو دیکھتے ہوئے برتن باورچی خانے کے تخت سے اٹھا کر الماری پر رکھنے کو کہا گیا۔ پھر وہ تخت کو باورچی خانے سے گھسیٹ کر باہر لائی اور اس پر علی کے ابا کا بستر بچھایا۔ علی کی اماں کا اصرار تھا کہ مہر انگیز اس رات اندر کمرے میں سوئے۔ لیکن منور خانم کی اس سیانی گری پر کہ "بہن، اندر تو [illegible]،" انھوں نے ناچار اسے باہر سونے کی اجازت دی۔

چاندنی رات تھی اور علی کو آنکھوں میں چاندنی کی چمک کے باعث نیند نہیں آ رہی تھی۔ نیند آئی تو تھوڑی دیر کو آنکھ لگی ہی تھی۔ اسے فکر بھی ہو رہی تھی کہ کہیں اس سے پہلے بستر کو صبح منور خانم اور مہر کے سامنے دھوپ میں ڈالنا پڑ جائے۔ اماں عموماً ایسے وقت بہت غصہ دکھاتی اور چیختی چلاتی تھیں۔ اماں سو رہی تھیں اور منور خانم خراٹے لے رہی تھیں۔ علی کو لگا جیسے اس نے مہر انگیز کی سرگوشی کی آواز سنی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی، "چلو، دیکھیں تو جاگ رہے ہو؟" وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے دکھائی دیا کہ ابا کا غلاف پھول گیا ہے۔ جیسے بھوت کا دیو آیا، جس کی کہانی مہر انگیز نے سنائی تھی۔ وہ منتظر تھا کہ ابھی ابا بھوت کی مٹی کی ناک پکڑ لیں گے اس کی خوفناک چہرے کا حصہ، جس میں خر اندر بڑا ہوا ہے۔ لیکن اسے بھوت کی ناک دکھائی نہیں دے رہی تھی اور بھوت مسلسل پھٹتی ہی جا رہا تھا۔ علی کو خوف نے آ لیا، لیکن وہ اب بھی پرامید تھا۔ آخر بھوت کا خوف اب بیٹھ گیا اور بھوت اس میں سے نکل کر چلا۔ علی پکار کر بولا، "پکڑ لیں، اس کی ناک پکڑیں!" اماں نے اسے ڈانٹا، "سو جاؤ!" اور علی نے بستر گیلا کر دیا۔

اگلی صبح باورچی خانے کی کھڑکی تھی اور مہر انگیز کا پیٹھا ہوا سر، اور علی کا گیلا بستر جسے دھوپ میں دیوار پر سوکھنے کے لیے ڈال دیا گیا تھا۔ مہر انگیز نے اس پر غمگین نگاہ ڈالی اور کہا، "تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

Scanned with CamScanner

منور خانم اور نیر کچھ روز ان کے گھر ٹھہرے یہاں تک کہ ایک روز علی کے خاندان کے یہاں آئے۔ منور خانم استقبالی کمرے کے پیچھے جا کر چھپ گئیں۔ پھر روتی ہوئی باہر نکلیں اور وہ تینوں چلے گئے۔ رخصت کے وقت علی کی اماں نے زور سے کہا، ''بہن، بھول مت جانا، اسے ضرور بھیج دینا۔''

کچھ دن بعد ایک سرخ بالوں اور مہندی لگے ہاتھ پیروں والی ایک تگڑی عورت ان کے گھر آئی۔ علی کی اماں نے اس کے سامنے جا کر اسے سلام کیا اور عزت سے بٹھایا۔ لیکن اگرچہ مہرانگیز کو بہت آوازیں دی گئیں کہ شربت لے آئے، اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اماں نے علی کو بھیجا کہ مہرانگیز کو بلا لائے۔ مہرانگیز باورچی خانے کے تخت پر اکڑوں بیٹھی تھی اور اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ ''کیا ہوا؟ سردی لگ رہی ہے؟ دھوپ میں آ جاؤ نا۔'' لیکن مہرانگیز نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی اور علی کی اماں کی آوازیں سنتے ہوئے بھی کوئی جواب نہ دیا۔ آخر وہ تگڑی عورت باورچی خانے میں آئی۔ اپنی کمر پر ہاتھ رکھے ہوئے بولی، ''آتی ہوں یا میں آؤں؟'' مہرانگیز کو گھسیٹ کر کمرے میں لے جایا گیا اور دروازہ بند کر لیا گیا۔ علی اور اس کی بہنیں دروازے کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ بڑی بہن نے چھوٹی بہن کے کان میں کوئی بات کہی اور دونوں کھلکھلانے لگیں۔

کمرے سے مہرانگیز کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ علی رونے لگا اور روتے روتے بولا، ''میری ننھ! میری ننھ جان!''

*

علی ہائی اسکول کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا کہ اس کے ابا بیمار پڑ گئے۔ ابا کی بہت سی آرزوئیں تھیں جن میں کوئی بھی پوری نہ ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ گھر میں بجلی بھی نہ لگوا سکے، جبکہ منور خانم کے یہاں بجلی آئے ایک سال ہو چکا تھا۔ جب ابا کی بیماری بہت بڑھ گئی تھی، انھی دنوں علی کی چھوٹی بہن کے لیے ایک رشتہ آیا۔ ابا نے بڑی بہن کا خیال کر کے اس پر اعتنا نہ کی۔

اگلے روز فزکس کا پرچہ تھا اور علی مختلف اجسام کے وزن مخصوص (specific gravity) یاد کرنے میں مشغول تھا کہ مہرانگیز ہراساں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی آنکھیں وحشت سے گول ہو رہی تھیں اور وہ ہانپ رہی تھی۔ بہت کمزور لگ رہی تھی۔ علی نے پوچھا، ''کیا ہوا؟'' مہرانگیز بولی،

''چھوٹے آقا، ایک الو چھت پر آ کر بیٹھ گیا ہے۔ ہنس رہا ہے۔ الو کو ہر بات کا پتا ہوتا ہے۔ پرندوں کا پیغمبر ہوتا ہے۔''

علی نے کہا: ''تو ڈر کاہے سے رہی ہو؟''

''بڑے آقا...''

علی نے پوچھا: ''اچھا تو پھر اب کیا کرنا چاہیے؟''

مہرانگیز بولی: ''آقا ہمیں جا کر اس کو قسم دینی ہوگی۔''

علی اور مہرانگیز پچھواڑے کے زینے سے چھت پر گئے۔ مہرانگیز نے ہاتھ میں ایک سینی اٹھا رکھی تھی جس میں قرآن، سبز پتے، نان اور نمک رکھا تھا۔ وہ دونوں دبے پاؤں چھت کے پیچھے کی طرف الو کے پاس پہنچے اور اس کے سر کے بالکل پیچھے بیٹھ گئے۔ اس نے قرآن ہاتھ میں لے کر گنگنا کر کہا: ''تجھے اس قرآن کی قسم، تجھے اس نان اور نمک کی قسم...'' علی کو ہنسی آنے لگی۔ الو نے پنکھوں کی طرح اپنے پر پھیلائے اور اڑ گیا۔ مہرانگیز خوش ہو کر بولی: ''چلا گیا۔ اب اپنے ویرانے میں چلا جائے گا۔ گھونسلہ نہیں بناتا۔ ویرانے میں رہا کرتا ہے۔ چلو ہمارے سر سے تو بلا ٹلی۔''

اس سے گلے ہفتے علی کے ابا کا انتقال ہو گیا اور علی اپنے امتحان میں فیل ہو گیا۔ اور اگلے سال گھر کا کمانے والا بن جانے کی وجہ سے اس نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ جس دفتر میں علی کے ابا حساب دار تھے، اس میں علی کو جگہ دے دی گئی۔ کام پر جانے کے پہلے دن سہ پہر کو لوٹ کر علی مہرانگیز اور اپنی بہنوں کے سامنے اپنے دفتر کے اعلیٰ افسر کی نقل اتار رہا تھا۔ وہ چھڑی کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے چلا، تھوکنے کے لیے رکا، میز کی دراز کو چابی سے کھولا، ماچس کی ڈبیا میں چائے انڈیلی، اور شکر کے چھ ٹکڑے گن کر میز پر رکھے۔ اس کی بہنیں اور مہرانگیز ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھیں۔ لیکن اماں نے بچوں کو ڈر سے ڈانٹا: ''مت ہنسو، ابھی تو تمھارے باپ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا ہوگا۔''

مہرانگیز ''باپ'' اور ''کفن'' کے لفظ سنتے ہی باورچی خانے میں چلی گئی اور زاری کرنے لگی۔ اماں نے چیخ کر کہا: ''مہرانگیز، تو اپنی چیزیں سمیٹ لے اور اس گھر سے چلی جا۔ مجھے فالتو کھانے والے نہیں چاہئیں۔'' یہ سن کر مہرانگیز کی گریہ وزاری اور بلند ہو گئی۔ وہ زور زور سے سر پر ہاتھ مارنے اور بال نوچنے لگی۔ علی اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر کھینچتا ہوا اسے حوض کے کنارے لایا اور بولا: ''اپنے منہ پر

پانی کا چھینٹا ڈالو۔ میں تمھیں گھر سے جانے دوں گا کیا؟"

اخیر جاڑوں میں منور خانم کے بہت کہنے پر علی کے گھر والوں نے سوگ کا سیاہ لباس اتار دیا، لیکن مہر انگیز اب بھی کالی اوڑھنی سے سر ڈھکے رہی۔ علی کی اماں کا زور نہ چلا کہ سے اس کے سامان سمیت گھر سے نکال دیں لیکن ان کا اس پر چیخنا چلانا اور اس کے بارے میں علی سے تکرار کرنا جاری رہا۔ خزاں کا موسم شروع ہوا تو چھوٹی بہن کی شادی اسی خواستگار سے ہوئی جسے علی کے باپ نے رد کر دیا تھا۔ منور خانم اور نیر ایک ہفتہ دن رات دلہن کے گھر میں ٹھہریں۔

شام کے وقت تمام لڑکے لڑکیاں مہر انگیز کے ساتھ پانچ دروں والے کمرے میں جمع ہو جاتے۔ بڑی بہن کسی فکر میں کھوئی لگتی تھی اور منھ سے کچھ نہ کہتی۔ چھوٹی بہن سرخی لگے گالوں، چہرے سے صاف کر دیے گئے روئیں اور ترشی ہوئی بھنوؤں کے ساتھ کوئی اور ہی فرد معلوم ہوتی تھی۔ نیر اس کے باوجود کہ اب علی سے چہرہ چھپانے لگی تھی، کبھی کبھی ہنسی سے ایسی بے اختیار ہوتی کہ اس کے سر سے چادر سرک جاتی۔ وہ بڑی ہو گئی تھی اور عشوہ گری کرنے لگی تھی۔

علی کسی نہ کسی کی نقل تارنا شروع کر دیتا۔ جس وقت سب کے پیٹ میں ہنسی سے بل پڑ رہے ہوتے، بڑی بہن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہ آتی۔ علی بھی اس کے سوا ہر ایک کی نقل اتار کرتا۔

ایک روز علی ایک لمبی سی چھڑی ہاتھ میں لے کر اس سے دیوار پر لگے خیالی نقشے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ پہلے اس نے تاریخ کے استاد کی نقل اتاری، پھر جغرافیے کے استاد کی، اور پھر دونوں مضامین کو خلط ملط کر دیا۔ "یہ لمبی اور پتلی سی پٹی مصر ہے۔ اور یہ رہا دریائے نیل۔ مصر کے فرعون خود کو خدا سمجھتے تھے اور خدا کے بنائے ہوئے پہاڑوں کی طرح انھوں نے بھی پہاڑ بنائے تھے تاکہ ان پر چڑھ کر آسمان تک پہنچ سکیں۔"

بڑی بہن نے ناگواری سے منھ بنایا اور علی کی بات کاٹتے ہوئے بولی، "علی، کیا کفر بکتے ہو! استغفار پڑھو۔"

نیر بولی، "عزت جان، ہم تو یونہی کھیل رہے ہیں۔ تفریح کر رہے ہیں۔ اس میں کیا برائی ہے؟"

"کھیل رہا ہے! بچہ ہے کیا؟ شادی ہو گئی ہوتی تو میرے برابر اس کے بچے ہوتے۔"

مہرانگیز نے کہا: ''انشاءاللہ آقا کی شادی ہوگی۔ ان کے بچوں کو میں خود پالوں گی۔ تم بھی عزت خانم، اس سال نہیں، اگلے سال اپنے گھر کی ہو جاؤ گی۔ میرے دل کو یقین ہے۔''

عزت خانم نے اس پر کچھ نہیں کہا۔ نیر بولی: ''ہاں علی آقا، یہاں تک پہنچے تھے کہ انھوں نے پہاڑ بنائے ..''

اور علی نے اپنا قصہ پھر شروع کیا۔ ''ہاں، لیکن پہاڑ بنانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آدمی خدا کی طرح تو ہے نہیں کہ پلک جھپکتے میں پہاڑ کھڑا کر دے۔ بس اتنا کہے: ہو جا! اور ہو جائے۔ یہ پہاڑ تو غلاموں سے بنوائے گئے تھے۔ ان میں سے بہت سے تو سورج کی تپش اور کوڑوں کی مار سے ہلاک ہو گئے۔ بہت سے پتھر کی سلوں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھتے گئے اور، یا علی مدد، اوپر ہی اوپر پہنچتے گئے۔ لیکن فرعونوں کا ہاتھ تب بھی آسمان تک نہ پہنچا۔ یہیں زمین پر مرے۔ بعد میں انھیں حنوط کر کے انھی پہاڑوں میں دفن کیا گیا۔''

مہرانگیز نے حیرت سے پھیلی آنکھوں کے ساتھ سوال کیا: ''آقا، مصر میں حبشی بستے ہیں؟''

علی بولا: ''نہیں مہرانگیز، حبشی نہیں ہیں۔ لیکن ظلم صرف حبشیوں پر تھوڑی ہوتا ہے۔''

اماں نے استقبالی کمرے میں لگی ہوئی بڑی گھڑی اور اس کے دونوں طرف رکھے سیہ فام لڑکیوں کے مجسمے بیچ دیے۔ اس سے جہیز خریدا اور علی کی چھوٹی بہن کو رخصت کر کے اس کے گھر بھیج دیا۔ اس کے اپنے شوہر کے گھر چلے جانے کے باوجود، اور اس کے باوجود کہ علی کو اس کے افسر نے اپنا منشی بنا لیا تھا، گزر بسر مشکل سے ہوتی تھی۔ اور مہرانگیز کے فالتو خرچ کا باعث ہونے پر اس کی نکتہ چینی مسلسل ہوا کرتی تھی۔ مہرانگیز کو جب کبھی موقع ملتا وہ علی سے مصر کے مُردوں کا ذکر چھیڑ دیتی اور ان کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتی: ''وہ اب تک خاک کیوں نہیں ہوئے؟ آخر کیسے؟ آقا، کیا حبشیوں کو مصر سے لایا گیا ہے؟ مصر میں دریا بہتا ہے؟ جانم، تم نے خود کہا تھا کہ ہر علاقے میں دریا ہوتے ہیں۔ میں نے سنا ہے نورالصباح کا شہر مصر سے نیچے ہے، بالکل ایسا شہر ہے جیسے بہشت۔ نورالصباح اسی شہر کی شہزادی تھی۔''

علی کی اماں نے وہ بڑی دیگ بیچ دی جس میں ہر سال امام حسن کے قتل کے دن سے ایک دن پہلے شلہ زرد پکا کر بانٹا جاتا تھا۔ اسے بیچ کر جو رقم حاصل ہوئی اس میں سے آدھی ایک بڑھیا کو دی گئی جو عامل بخت کشا تھی، اور باقی آدھی علی کی نوعروس چھوٹی بہن کی پاکشائی کی تقریب میں صرف ہوئی۔ تقریب کے دن علی نے دفتر سے چھٹی کی اور مہمانوں کا استقبال کرتا رہا۔ منور خانم اور نیر تلے ہوئے بینگن کے قتلوں کو قاب میں رکھنے اور لڑکی کے سسرال کی عورتوں کا دل بہلانے میں مشغول تھیں۔ علی کی اماں ہمیشہ کی طرح کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی تھیں اور مہرانگیز کو مسلسل ہدایتیں دے رہی تھیں۔ مہرانگیز پھرکی کی طرح گھوم رہی تھی۔ چیزیں لا کر رکھنا، اٹھا کر لے جانا، مہمانوں کی خاطر مدارات۔ مغرب سے کچھ پہلے مہمان رخصت ہوئے۔ لیکن منور خانم اور نیر ٹھہر گئے۔ علی بڑے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ نیر بھی اسی کمرے میں نماز پڑھ رہی تھی۔ اس کے رخساروں پر سرخی تھی اور نگاہ علی پر سے ہٹتی نہ تھی۔ علی بھی اس طرح لیٹا ہوا تھا کہ نیر کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ مہرانگیز اتنے دبے پیروں کمرے میں داخل ہوئی کہ علی کو احساس تک نہ ہوا۔ اس نے مہرانگیز کے ہاتھ کو اپنے چہرے سے مس ہوتے محسوس کیا۔ مہرانگیز نے اس سے سرگوشی میں کہا، ''آقا، ذرا میرے ساتھ آؤ۔'' علی تھکا ہوا تھا اور نیر کے گول چہرے اور مسکراتی ہوئی شرمگیں آنکھوں سے دور نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لیکن مہرانگیز کا دل بھی نہیں توڑ سکتا تھا۔ اسی عورت نے اسے پالا تھا۔ وہ ماں سے بڑھ کر اس کے قریب تھی۔ وہ اٹھ کر اس کے پیچھے چل دیا۔ دونوں استقبالی کمرے کے بند دروازے کے پاس کھڑے ہو کر اندر سے آتی ہوئی آوازیں سننے لگے۔ منور خانم کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

''رشتہ تو اچھا ہے، لیکن جو قول دے رکھا ہے...''

علی کو منور خانم کے باقی الفاظ حقے کی گڑگڑاہٹ میں سنائی نہ دیے۔ علی کی اماں حقہ پی رہی تھیں۔ پھر ان کا جواب سنائی دیا: ''تقدیر کے آگے کسی کا کیا زور چلے۔''

منور خانم نے لمبی سی بات کہی جس کا فقط ایک نامکمل فقرہ ان کے کانوں تک پہنچا، ''ہاتھ باندھ کر...'' لیکن اماں کے جواب نے منور خانم کی بات کو واضح کر دیا۔ ''بہن، میں تم سے بالکل توقع نہیں رکھتی کہ ہمارے انتظار میں بیٹھی رہو۔ تم تو جانتی ہو، علی کی تنخواہ میں گھر کا خرچ بھی مشکل سے چلتا ہے۔ کس برتے پر اس کی دلہن لے آؤں؟''

''اس لیے کہتی ہوں کہ شاید دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ کہیں ان کا دل توڑنے سے گناہ نہ ہو۔''

اماں کا کڑا جواب آیا کہ ''علی ابھی بچہ ہے۔ چاہنے والے کو ابھی عمر پڑی ہے۔''

منور خانم کا جواب بھی صاف اور واضح سنائی دیا ''اس لیے کہہ دیا کہ کہیں بعد میں تمھیں شکایت نہ ہو۔''

علی جلدی سے کپڑے بدل کر، منور خانم اور نیر کو خدا حافظ کہے بغیر، گھر سے نکل گیا۔ مہر انگیز جو اس کے لیے گھر کا دروازہ کھولنے آئی تھی تاکہ اس کے جانے کے بعد اسے بند کر لے، بولی: ''آقا، رنج نہ کرنا۔ رنج آدم زاد کو شکھا دیتا ہے۔''

علی دروازے میں رک کر بولا: ''میں کمرے میں جا کر ان سے کہوں کہ نیر میری ہے، انھیں اس کی شادی کہیں اور کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ کہوں گا، نیر بچپن سے میری منگیتر ہے۔ ہمیشہ سے میری رہے۔''

یہ کہہ کر وہ واپس مڑا لیکن مہر انگیز نے اس کا بازو پکڑ لیا اور کہنے لگی

''آقا، خانم بہت برا مانیں گی۔ شاید لڑنا شروع کر دیں۔ کہیں بات اور بگڑ نہ جائے...''

پھر بولی

''کاش میرے پاس سیاہ کریپ کی اوڑھنی ہوتی تو اسے سر پر اوڑھ کر منور خانم کے یہاں جاتی اور کہتی منور خانم، میرے آقا کیا کہنا ٹھیک ہوتا، جانم؟''

ایک روز سہ پہر کو علی دفتر سے واپسی پر دیر تک گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا رہا لیکن کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ گھر کے اندر سے چیخنے چلانے اور برا بھلا کہنے کا شور سنائی دے رہا تھا۔ علی نے جھنجھلا کر اور زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ آخر بہن نے دروازہ کھولا۔ علی اندر آیا۔ مہر انگیز کو دیکھا کہ باغیچے کے کنارے پر پڑی ہے اور سر سے خون بہہ رہا ہے، اور باورچی خانے کی بڑی چھری حوض کے پاس پڑی چمک رہی ہے۔ علی نے اماں کی طرف دیکھا جو لرزاں اور وحشت زدہ دکھائی دیں۔ علی کے گلے میں کوئی چیز اٹکنے لگی۔ اس نے پوچھا، ''کیا ہوا؟ خدا کے لیے کچھ تو بتائیے کہ یہ سب کیا ہے؟''

اماں نے کہا، ''اب یا تو میں رہوں گی یا یہ بمباسی حبشن۔ تم سب اس بدشکل کالی کو مجھ پر ترجیح دیتے ہو۔ جیسا باپ ویسا بیٹا۔ جانتی ہوں تم بھی اسی کے پھیر میں پڑو گے۔''

علی حیرت زدہ ہو کر اماں کو دیکھتا رہ گیا۔ بولا، ''خدا کے لیے بس کیجیے۔ آخر ہوا کیا؟''

''کچھ بھی نہیں۔ تم کیا چاہتے ہو کیا ہو؟ یہ دیکھو۔'' انھوں نے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے موم کے دو ٹکڑے علی کے ہاتھ میں دے دیے۔ علی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہے۔ حیران ہو کر پہلے اماں کو، پھر بہن اور آخر مہرانگیز کو دیکھنے لگا جو اب بھی باغیچے کے پاس پڑی تھی اور اونچی آواز میں رو رہی تھی۔ اماں کی آواز آئی، ''دیکھ لو، اب جادو بھی کرنے لگی۔ یہ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی موم کی گڑیاں باورچی خانے سے ملیں۔ میں نے اس سے پوچھا، یہ کیا ہے۔ کہنے لگی، آقا اور نیر خانم کے لیے ہیں کہ ان کا ملاپ ہو جائے۔ مجھے احمق سمجھتی ہے کہ سیاہ کو سفید کر کے دکھائے گی اور میں مان لوں گی؟ جیسے میں اس بڑھیا کو جانتی نہیں۔ گر جادو آتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ اس لڑکی کے واسطے کرے تاکہ اس کی قسمت کھلے۔ ہیں؟ میں نے اس سے کہہ دیا کہ علی کے آنے سے پہلے پہلے اس گھر سے دور ہو جائے۔ اس پر اس نے چھری نکال لی اور مجھے مارنے دوڑی۔''

مہرانگیز اب اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور مٹی اور خون میں لت پت ہو رہی تھی۔ بولی، ''آقا، خانم کی باتیں مجھ سے برداشت نہ ہوئیں۔ چھری اس لیے نکالی تھی کہ خود کو مار کر ختم کر ڈالوں۔ مجھ حبشن کی کیا مجال کہ خانم پر ہاتھ اٹھاؤں یا اپنے بچے کو چشم بد سے دیکھوں۔ میرا ایک ایک بال اسی گھر میں سفید ہوا ہے...'' اتنا کہہ کر وہ رونے لگی۔

رات کو علی گھر لوٹا تو مہرانگیز کو دیکھا کہ دروازے کے باہر چبوترے پر بیٹھی ہے اور اس کا بقچہ پاس رکھا ہے۔ علی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''اب مجھے اس گھر سے جانا ہی ہوگا۔ خانم ایسی ایسی باتیں کہتی ہیں کہ انسان کا دل جل کر سیاہ ہو جائے۔ جو اپنی ہی اولاد کے لیے ایسی باتیں کہے، اسے مجھ سیاہ رو کے لیے کچھ بھی کہنے کا حق پہنچتا ہے۔ جانم، یہ دونوں موم کی گڑیاں لے لو۔ ان سے کوئی بھاری چیز باندھ کر حوض میں ڈال دینا۔ اگلے ہفتے سے پہلے پہلے نیر تمھاری ہو جائے گی۔ اب میں رخصت ہوتی ہوں۔ جانم، میں نے تمھیں پال کر بڑا کیا ہے۔ میں...''

''اب کہاں جاؤ گی؟ کون سی جگہ ہے جانے کو؟''

مہرانگیز نے آنسو پونچھے اور بولی: "آقا، میرا رنج مت کرو۔ منور خانم کے گھر جاتی ہوں۔ خدا نے چاہا تو نیر خانم کے جہیز کے ساتھ اس گھر میں واپس آ جاؤں گی۔ ہم دونوں ایک ساتھ تمہارے پاس لوٹیں گے، اپنے آقا کے پاس۔ جانم، میں تمہارے پیروں کی خاک ہوں۔ لیکن اگر منور خانم نے مجھے نہ رکھا تو موچیوں کے بازار کے پاس بیٹھ کر بھیک مانگا کروں گی۔ کبھی کبھی وہاں آ کر مل جایا کرنا، آؤ گے نا؟"

کچھ مہینوں بعد نیر کی شادی ہو گئی۔ مہرانگیز دلہن کے جہیز کے ساتھ اس کی سسرال چلی گئی۔ لیکن دولھا علی نہ تھا۔ منور خانم اور نیر خدا حافظ کہنے اور شادی کا بلاوا دینے علی کے گھر آئی تھیں۔ وہ ان کے سامنے نہ آیا اور نہ اماں کے اصرار کے باوجود شادی میں شریک ہوا۔ نیر کی شب عروسی وہ پہلی رات تھی جب علی کی پلک نہ جھپکی۔ اسے خیال ہوتا رہا کہ بستر پر کوئی چیز آ گری ہے۔ کئی بار اٹھ کر دیکھا، بستر کو جھاڑا۔ کچھ بھی نہ تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت کسی نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اسے شادی کے گھر سے اماں یا بہن کے اتنی جلدی لوٹنے کی توقع نہ تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو مہرانگیز سر پر سیاہ کریپ کی اوڑھنی لیے کھڑی تھی۔ لیکن اوڑھنی پرانی تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ بڑے کمرے میں پہنچے۔ مہرانگیز نے رومال میں لپٹی ہوئی کوئی چیز اوڑھنی کے اندر سے نکالی اور اسے بہت اہتمام کے ساتھ علی کے سامنے رکھ دیا۔ یہ پھولدار رومال میں لپٹی ہوئی شیرینی کی طشتری تھی۔

علی نے پوچھا: "یہ کیا ہے؟"

"مجھے تمہارا خیال آ رہا تھا۔ شادی کی شیرینی ہے۔"

علی دل گرفتہ تھا۔ کچھ کہنے کی خاطر بولا: "دولھا دلہن کو چھوڑ کر یہاں چلی آئیں؟"

"نیر خانم کی اجازت سے آئی ہوں۔"

علی خاموش ہو گیا۔ مہرانگیز بولی: "دولھا گنجا ہے۔ کل رات مجھے پتا نہ چلا۔ شادی کی دعوت میں ٹوپی پہنے تھا۔ صبح میں بستر ٹھیک کرنے کمرے میں گئی تو دیکھا۔ بالکل گنجا ہے۔ پولیس کپتان ہے۔ مجھے تو پہلوان لگتا ہے۔ میرے آقا کی تو چھوٹی انگلی تک ایسے داماد سے کہیں بڑھ کر ہے۔"

علی کے گلے میں کچھ اٹکنے لگا۔ اس نے پوچھا: "نیر کیسی ہے؟ خوش ہے؟"

مہرانگیز نے سر ہلایا۔ اس کا نچلا ہونٹ لٹکا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا رونے کو ہے۔ بولی، "نہیں۔ کل رات شادی میں تخت پر بیٹھی تھی۔ عورتیں بہت کہتی رہیں کہ ہاتھ پکڑ لو۔ چاہتی تھیں دولھا دلہن ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیں۔ مگر وہ نہ مانی۔ عورتیں کہنے لگیں، رونمائی چاہتی ہے۔ نہیں آقا، نیر خانم رونمائی نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اس قدر خوبصورت لگ رہی تھی کہ کیا بتاؤں۔ بالوں میں سرخ پھول گندھے ہوئے تھے اور پھولوں میں ایک بجلی کا بلب سا روشن تھا۔ جانے کیسے؟ نیر خانم جب چاہتی بلب کو بجھا سکتی تھی۔ اس کی بیٹری اس کے ہاتھ میں تھی۔ جانم، آخر کار دولھا نے زبردستی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بالوں میں سے ایک پھول نکل کر تخت پر گر پڑا۔"

❁

نیر اور اس کا بیٹا بیون مہرانگیز کے ساتھ کبھی کبھی علی کے گھر آیا کرتے۔ لیکن پولیس افسر شادی کے بعد سے عید کے سوا ان کے یہاں کبھی نہیں آیا تھا۔ اور نہ کبھی علی سے دو باتیں کی تھیں۔ نیر نے اپنے بیٹے کے لیے فوجی یونیفارم سی دی تھی۔ بچہ اس لباس میں بہت بے آرام معلوم ہوتا تھا لیکن سینہ پھلا کر چلتا تھا۔ کمر سے لگی ہوئی ننھی سی تلوار بار بار اس کی ٹانگوں سے ٹکراتی تھی۔ ایک بار علی نے نیر سے پوچھا، "اسے ابھی سے یہ سب سکھا رہی ہو؟" نیر نے جواب میں کہا تھا، "پیارا لگتا ہے نا؟" لیکن اس کے بعد کبھی اسے فوجی لباس میں علی کے گھر لے کر نہ آئی۔

پولیس کپتان کسی کام سے گیا ہوا تھا اور نیر، مہرانگیز اور بیون دوپہر کے کھانے پر علی کے یہاں آئے ہوئے تھے۔ نیر کا بدن بھاری سا ہو گیا تھا اور چہرہ کھلا ہوا تھا۔ ہنستی تو گالوں میں گڑھے پڑتے۔ لیکن جب اس کی نظر علی پر پڑتی تو وہ اداس اور شاکی سا دکھائی دیتا۔ عزت خانم سہ پہر کو کمرے میں جا کر نماز پڑھنے کھڑی ہو جاتی۔ وہ بہت عبادت گزار ہو گئی تھی اور لمبی لمبی نمازیں پڑھا کرتی تھی۔

کھانے کے بعد مہرانگیز بیون کو بڑے کمرے میں لے آئی۔ علی اسی کمرے میں لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔ مہرانگیز اتنی بوڑھی ہو گئی تھی کہ اب علی کی ماں کو بھی علی کے اس کے پھیر میں جا پڑنے کا اندیشہ نہ رہا تھا۔

علی نے اخبار ہاتھ سے رکھ دیا اور بیون کی حرکتیں دیکھنے میں محو ہو گیا جو نیر کی بچپنے کی حرکتوں کی

یاد دلاتی تھیں۔ ہیون شرارتیں کر رہا تھا اور کسی طرح سونے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ علی سے تصویروں والی کتاب مانگ رہا تھا جو اس کے پاس نہ تھی۔ پھر رنگین پنسل اور کاغذ کے لیے ضد کرنے لگا۔ مہرانگیز بولی، "بیژن خان، جا کے آقا کو پیار کرو۔ پھر میں تمھیں کہانی سناؤں گی تو تمھیں نیند آ جائے گی۔ گرمیوں میں اگر سوؤ گے نہیں تو دماغ کو گرمی چڑھ جائے گی۔" علی آنکھیں بند کر کے ہیون کے پیار کرنے کا انتظار کرتا رہا، لیکن وہ نہ آیا۔

علی کو مہرانگیز کے آہستہ آہستہ کہانی سنانے کی آواز آئی۔ "وہ نورالصباح کی تعظیم میں جھک گئے۔ بار بار جھکتے رہے۔ اسے بناری لباس پہنایا۔ جواہرات دیے۔ پھر اسے اپنے ساتھ اپنے شہر لے گئے۔ ان کے شہر میں، جائم، ایک بادشاہ تھا جس نے حبشی غلاموں سے دریا کے کنارے پہاڑ بنوایا۔ اس کے شہر میں اور تو سب کچھ تھا، بس پہاڑ نہیں تھا۔ اس لیے بادشاہ پہاڑ بنوانا چاہتا تھا۔ حبشیوں نے پہاڑ بنانے کے لیے سوسومن کے پتھر اپنی پیٹھ پر لاد کر پہنچائے۔ اب نورالصباح اس پہاڑ کو دیکھتی ہے۔ لیکن اس پہاڑ پر ہرے بھرے پیڑ نہیں اگتے..."

علی نے آنکھیں کھولیں۔ مہرانگیز کو دیکھا کہ ہیون کے پاس بیٹھی ہے اور اس کی قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر اس کی پیٹھ سہلا رہی ہے۔ اس نے پوچھا، "مہرانگیز، پیڑ کیوں نہیں اگتے؟"

مہرانگیز بولی، "آقا، میں نے تمھاری نیند خراب کر دی۔ بیژن خان جب تک کہانی نہ سن لیں، سوتے نہیں ہیں۔ بالکل تمھاری طرح۔"

"مگر میں پوچھ رہا ہوں پیڑ کیوں نہیں اگتے؟"

"کیونکہ اس پہاڑ کے قدموں میں خون بہا ہے۔ آقا، کالی بلی اور کالے انسان کا خون بدبختی لاتا ہے۔"

علی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے ہیون کی آواز سنائی دی جو کہہ رہا تھا، "پھر سے سناؤ!"

اور پھر مہرانگیز کی آواز آئی جو دریا کے کنارے پہاڑ کی اور کوٹ پتلون پہنے سیاہ فام مردوں کی وہی پرانی کہانی دہرا رہی تھی۔ لیکن اس کے بعد ایک ایسی کہانی شروع ہوئی جو علی نے اس سے پہلے مہرانگیز سے کبھی نہیں سنی تھی۔

"میری اماں کو حبشیوں کی زبان آتی تھی، لیکن مجھے کسی نے نہیں سکھائی۔ ایک دن ایک کالا

آدمی علی آقا کے نانا جان کے پاس آتا ہے اور میری ماں کے ساتھ حبشیوں کی زبان میں باتیں کرنے لگتا ہے۔ خانم اور آقا کو بالکل نہیں معلوم کہ دونوں میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ اگلے روز میری اماں اپنا بقچہ بغل میں داب لیتی ہے۔ کہتی ہے، حمام جا رہی ہوں۔ چلی جاتی ہے۔ ایک سال تک اس کی کوئی خبر نہیں ملتی۔ ہر جگہ تلاش کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے پانی بن کر زمین میں جذب ہو گئی ہو۔ سب کہتے ہیں، حبشن بھاگ گئی۔ ایک روز دن ڈھلے لوٹ آتی ہے۔ لیکن اکیلی نہیں۔ میرے ساتھ۔ مجھے قنداق[1] میں لپیٹ کر اپنی چادر میں چھپا رکھا ہے۔ پھر روتی ہے، روتی رہتی ہے، روتی رہتی ہے۔ آخر خانم بزرگ اس کی خطا معاف کر دیتی ہیں۔ پھر ہر سال وہ مجھے لے کر دو چار دن کے لیے غائب ہو جاتی ہے...''

علی اٹھ بیٹھا اور پوچھنے لگا۔ ''مہرانگیز، تمھیں یاد ہے کہاں جاتی تھیں؟ کس کے پاس جاتی تھیں؟''

مہرانگیز بولی، ''خواب کی طرح کچھ کچھ یاد آتا ہے۔ ایک کنواں تھا جس کے قریب پہنچتے تھے، پھر ایک آدمی آتا تھا اور مجھے گود میں لے لیتا تھا۔ چومتا تھا۔ مجھے تازہ ککڑیاں توڑ کر دیتا تھا۔ پھر میں گایوں کے پاس رہتی تھی۔ مجھے ڈر لگتا تھا بیلوں سے، جو گھومتے رہتے تھے، گھومتے رہتے تھے۔ لیکن یاد آتا ہے کہ پانی کا ڈول کنویں سے اوپر آتا تھا اور اس میں سے پانی چھلکتا تھا تو اسے دیکھ کر میں بڑی خوش ہوتی تھی۔ کنویں کی چرخی مسلسل کنکناتی رہتی تھی، کنکناتی رہتی تھی۔ میری اماں اور وہ آدمی کمرے میں چلے جاتے تھے۔ دروازہ بند کر لیتے تھے۔ آخری سال جب وہاں گئے تو وہ آدمی نہیں تھا۔ ایک کوئی اور تھا جس نے اماں کو بتایا کہ لوگ اسے ڈھونڈتے ہوئے آ گئے تھے۔ پھر زنجیروں میں باندھ کر لے گئے۔ بوشہر۔ یہ سن کر اماں رونے لگی...''

ایک روز مغرب کے وقت علی کپڑے بدل کر گھر سے باہر جانے کو تھا کہ کسی نے جلدی جلدی دروازہ کھٹکھٹایا۔ نیر کا شوہر تھا۔ وردی پہنے، پیٹی باندھے، کندھوں پر ستارے اور تمغے لگائے، ہاتھ میں چھڑی لیے۔ تو کپتان صاحب دورے سے لوٹ آئے۔ علی کا دل ڈوبنے لگا۔ کبھی کبھی اسے اس آدمی سے ایسی نفرت محسوس ہوتی کہ جی چاہتا اس کی وردی پر لگے ستاروں اور تمغوں اور اس کی پیٹی کو نوچ کر

[1] قنداق: کپڑے کا تھیلا جس میں نوزائیدہ بچے کو گردن تک بند کر دیتے ہیں۔

پھینک دے، اور چھڑی چھین کر اس کی خوب مرمت کرے۔ لیکن کبھی کبھی اس کے لیے عجیب سی انسیت محسوس کرتا۔ آخر وہ کسی اور کی نسبت نیر سے سب سے زیادہ قریب تھا۔ علی اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ خود سے کچھ کہنے سے ڈر رہا تھا۔ نیر کا شوہر بولا: "ذرا اکیلے میرے ساتھ چلو۔" علی کا ڈر اور بڑھ گیا۔ دل میں کہنے لگا: "نیر یا مہر انگیز؟" کپتان صاحب سے چھڑی چھین لینے کو جی کرتا تھا۔ آخر پوچھا: "کیا ہوا؟"

دونوں چل پڑے۔ علی اس سے پہلے کبھی ان کے گھر نہیں گیا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے پھر پوچھا

"کیا ہوا؟ اکیلے کیوں؟"

"میرے اردلی کو تمہارا گھر معلوم نہیں تھا۔ مجبوراً مجھے خود آنا پڑا۔"

علی نے پوچھا: "میری خالہ زاد کا کیا حال ہے؟ مہر انگیز کیسی ہے؟ اور آپ کا بیٹا ہیرون..."

پولیس افسر بولا: "مہر انگیز تمہیں دیکھنا چاہتی ہے۔ بڑھیا بالکل سٹھیا گئی ہے۔ تیل کے چولہے میں ہوا بھر رہی تھی۔ اتنی ہوا بھری کہ چولہا پھٹ گیا۔ سر سے پیر تک جل گئی۔ کچھ دن پہلے کی بات ہے"

"اب کہاں ہے؟ اسپتال میں؟"

پولیس افسر نے کہا: "اسپتال لے جا نا بیکار تھا۔"

علی خاموش ہو گیا اور نیر کے گھر تک کچھ نہ بولا۔ دروازہ نیر نے کھولا۔ اس کا پیٹ پھر پھولا ہوا تھا اور اس نے ہیرون کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ علی کو اشارہ کر کے کہنے لگی

"بالا خانے میں ہے۔ مجھے اکیلے اس کے پاس بیٹھنے سے ڈر لگتا ہے۔"

علی نے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر گیا۔ مہر انگیز کو دیکھا کہ گوشت کے جلے ہوئے ٹکڑے کی طرح بستر پر پڑی ہے۔ چہرہ اس قدر سوجا ہوا تھا کہ آنکھیں ٹھیک سے کھلتی نہ تھیں۔ علی کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر شکستہ سی مسکراہٹ آئی اور وہ بولی: "میری آنکھیں تمھاری راہ دیکھ رہی تھیں، اپنے آقا کی۔"

علی نے کھڑے کھڑے پوچھا: "مجھے فوراً خبر کیوں نہیں بھیجی؟ میں ڈاکٹر کو لے کر آتا۔ تمہیں اسپتال لے جاتا۔"

Scanned with CamScanner

''آقا، کیا فائدہ تھا؟''

پھر علی نے دیکھا کہ مہرانگیز اپنا چہرہ کمرے کی جنوبی کھڑکی کی طرف پھیرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پوچھا،

''کھڑکی کھول دوں؟''

''نہیں آقا، قبلے کی طرف منہ کرنا چاہتی ہوں۔''

علی نے اس کے گدے کو ایک طرف سے پکڑا اور مہرانگیز سمیت اسے گھما کر اس کا چہرہ قبلے کی طرف کر دیا۔

نیر کمرے میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں سفید رومال تھا۔ مہرانگیز پرسکون معلوم ہو رہی تھی۔ نیر سے کہنے لگی، ''خانم، میری سجدہ گاہ طاق میں رکھی ہے۔ اسے لا کر میری آنکھوں پر رکھ دو۔''

نیر نے طاق سے سجدہ گاہ اتاری۔ اس پر سے گرد جھاڑی۔ بولی، ''اوہو، یہ تو ٹوٹی ہوئی ہے۔ میں تمھارے لیے سالم سجدہ گاہ لاتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، ٹوٹی ہوئی ہی ٹھیک ہے۔ کہتے ہیں حبشن کی ایک آنکھ پھوٹی ہوئی تھی اس لیے ٹوٹی ہوئی سجدہ گاہ رکھ دی۔''

علی مہرانگیز کے بستر کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔ نیر کی آواز سن کر چونکا، ''کرسی لا دوں؟''

''نہیں، نہیں۔''

پھر خاموشی ہو گئی۔ نیر اسی طرح کھڑی ہولے ہولے رو رہی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ لے جا کر بجلی کا بٹن دبایا۔ ایک گرد آلود بلب جل اٹھا۔ پھر مہرانگیز کے بولنے کی دھیمی آواز سنائی دی، جیسے کسی اور دنیا سے آ رہی ہو:

''میرے پیروں پر مہندی لگائی۔ میرے پیروں کو ٹھنڈک ملی۔ نورالصباح کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوئی۔ فر کی ٹوپیاں پہنے آدمی۔ فتح الایالہ کا کنواں تھا۔ اس نے تازہ ککڑیاں توڑ کر مجھے دیں۔ ٹھنڈی، ٹھنڈی، ٹھنڈی۔ پیٹ میں ایسی ٹھنڈک، ایسی ٹھنڈک... اس نے میرا بستر جھاڑ کر بچھایا۔ بولی، میں حمام جا رہی ہوں. . میری بچی میری ٹھوڑی باندھے گی... مجھے اس کی ٹھوڑی باندھنے سے ڈر لگتا تھا۔ اس کا منہ بالکل ٹیڑھا، بالکل ٹیڑھا ہو رہا تھا۔ حبشیوں نے پہاڑ بنایا۔ پہاڑ کے قدموں میں ایک شہر

ہے، بہشت جیسا۔ ہم وہاں جائیں گے۔ ٹھنڈا پانی، ٹھنڈا، ٹھنڈا، ٹھنڈا...''

علی مہر انگیز کی لاش کے پاس بیٹھا تھا۔ تیرا اپنے بڑھے ہوئے پیٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کا سایہ دیوار پر اس طرح پڑ رہا تھا جیسے کوئی پہاڑ کروٹ کے بل پڑا ہو۔

❀❀

سیمین دانشور

فارسی سے ترجمہ: رفاقت یزدان منش

کسے سلام کروں؟

"واقعی، کون رہ گیا ہے جسے میں سلام کروں؟ ہیڈ مسٹریس صاحبہ مر گئیں، حاجی اسمٰعیل لاپتا ہو گیا، میری اکلوتی بیٹی اُس صحرائی بھیڑیے کی نذر ہو گئی... بلی مر گئی۔ چمنا مکڑی پر گرا تو مکڑی بھی مر گئی۔ اور اب کیسی برفباری ہو رہی ہے! جب بھی برف پڑتی ہے، میرا دل اتنا گھبراتا ہے کہ دیوار سے سر ٹکرانے کو جی چاہتا ہے۔ بیمے کے ڈاکٹر نے کہا تھا، 'جب تمھارا دل گھبرائے تو باہر نکل جایا کرو۔' پھر بولا، 'جب تم دل گرفتہ ہو اور کوئی درد بانٹنے والا پاس نہ ہو تو اونچی اونچی آواز میں اپنے آپ سے باتیں کیا کرو، مطلب یہ کہ انسان خود سنگِ صبور کا پُتلا بن جائے۔' پھر کہنے لگا، 'بیابان میں نکل جاؤ، جی بھر کر چیخ چلاؤ اور جس شخص کو چاہو گالیاں دو۔' کیسی برفباری ہو رہی ہے! برف کے گالے ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں۔ اس وقت بھی ہلکی ہلکی برفباری ہو رہی ہے۔ لگتا ہے جلد رکنے والی نہیں۔ جاڑوں کے پہلے چلّے سے متواتر اسی طرح برف پڑ رہی ہے..."

پچھلی برف زمین پر جم گئی تھی۔ اور لوگ بھی اپنی چھتوں کی برف گلی کوچوں کے سوا اور کہاں ڈال سکتے تھے؟ اس جمی ہوئی برف کے ڈھیروں پر چلنا اب صرف پہلوانوں، نوجوان کھلاڑیوں اور نادان بچوں کے بس کی بات تھی جن کو اسکول سے چھٹی دے دی گئی تھی۔ برف پڑنے سے پہلے ہی مہنگائی بے تحاشا بڑھ جاتی، چیزوں کا قحط پڑنے لگتا اور پانی اور بجلی کی لوڈ شیڈنگ کی باتیں ہونے لگتیں؛ برفباری شروع ہونے پر تو اسکول بند ہو جاتے اور زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتی۔

کل رات خیابانِ علائی کی بجلی چلی گئی۔ کوکب سلطان کرسی[1] کے نیچے بیٹھی رہ گئی اور تاریکی سے خیرہ ہو کر سامنے تکتی رہی، یہاں تک کہ اس کا دماغ گھومنے لگا۔ وہ بے چین ہو گئی، اتنی بے چین ہوئی کہ اسے لگا جیسے اس کے دل میں کوئی کپڑوں کو پنچ پنچ کر دھو رہا ہو۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ کمرے اور اس میں چھائے ہوئے اندھیرے سے باہر نہ نکلی تو پاگل ہو جائے گی۔ چنانچہ وہ اٹھی، راستہ ٹٹول ٹٹول کر نیچے اتری اور سردی اور اندھیرے میں گھر کے دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔ وہ ٹھٹھر رہی تھی اور ہمسائے کا بچہ رو رہا تھا۔ پرسوں رات ان کا پانی کا پائپ پھٹ گیا تھا۔ کئی دنوں سے خاکروب نے ان کا کوڑا کرکٹ بھی نہیں اٹھایا تھا۔

کوکب سلطان، وزارت تعلیم کی ریٹائرڈ ملازم، کے پاس اٹھائے جانے کے لیے کچھ زیادہ کوڑا کرکٹ تھا بھی نہیں۔ پانی کا پائپ پھٹ جانے سے بھی اس کے سامان کو کوئی خاص نقصان نہیں ہوا تھا۔ اس کا کمرہ دوسری منزل پر، آقائے پنیر پور کی ہمسائیگی میں تھا جس کا گھر دو بڑے کمروں، ایک باورچی خانے اور ایک بیت الخلا پر مشتمل تھا۔ اس کے گھر میں تین جوان بیٹیاں اور ایک بھاری بھرکم بیگم رہتی تھیں۔ ہمسایوں اور دوستوں نے اسے 'پنیر پور' کا لقب اس لیے دیا تھا کہ وہ خیابانِ ژالہ کے کونے پر دودھ دہی کی دکان کرتا تھا اور کسی کو ادھار نہیں دیتا تھا، حتیٰ کہ کسی قریبی عزیز کو بھی نہیں۔ اس کا اصلی نام شریعت پور یزدانی تھا۔ کوکب سلطان وضو اور رفع حاجت کے لیے نیچے جاتی اور پانی نیچے کی منزل کے باورچی خانے کے نل سے لیتی تھی۔ کھانا وغیرہ وہ زیادہ نہیں پکاتی تھی۔ اس کے مصنوعی دانت بری طرح ہلتے رہتے تھے جس سے اس کی زبان اور مسوڑے زخمی ہو گئے تھے۔ اس کا کمرہ بالشت بھر سے زیادہ کا نہ تھا۔ سامان کچھ تھا نہیں، جو کچھ تھا وہ اس نے بیٹی کے جہیز کے طور پر اپنے داماد کے گھر بھجوا دیا تھا۔

کوکب سلطان کرسی کے نیچے سے اٹھی اور کھڑکی سے برفباری کو دیکھنے لگی۔ اب تک ساری چھتیں سفید ہو چکی تھیں اور برابر والے گھر میں لگے کاج کے درخت بھی برف سے ڈھک گئے تھے۔ سامنے والے مکان کی چھت کے چھجے سے برف آویزوں کی طرح کل بھی لٹک رہی تھی اور پرسوں بھی جو پہلے قوس کی شکل کے تھے۔ اس کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ کل رات سے اس کے ذہن سے حاجی اسمٰعیل

---

[1] بڑا سا اونچا تخت جس پر اس سے بہت بڑی پوشش ڈال دی جاتی ہے۔ جاڑوں میں لوگ گھروں میں اسی پوشش اور تخت کے نیچے سوتے اور بیٹھتے ہیں۔ برقی حرارت کے رواج سے پہلے گھروں میں کرسی کا استعمال عام تھا۔

کی یاد باہر نہیں جا رہی تھی۔

''ہم ایک دوسرے کو کتنا چاہتے تھے۔ افسوس کتنی جلدی وہ دن گزر گئے۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ گرمیوں میں اوین درکہ[1] چلی جاتیں۔ حاجی اسمٰعیل حمام گرم کرتا اور مجھے خوب مل مل کر نہلایا کرتا، مجھے خوب سہلاتا اور گدگداتا۔ ہم ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے خوب ہنسا کرتے اور ایک دوسرے کو شعر سنایا کرتے۔ ہم ہیڈ مسٹریس کا پلنگ باغ کے وسط میں ڈال کر اس پر قالین بچھا لیتے اور ساتھ بیٹھ کر افیون پیتے یا ودکا کی چسکیاں لیا کرتے، یہاں تک کہ ہمیں خوب نشہ ہو جاتا۔ ہم ہیڈ مسٹریس صاحبہ کی مچھر دانی تان کر کپڑے اتار کر اس میں گھس جاتے اور ایک دوسرے کو بانہوں میں لے کر سویا کرتے۔ اس نے مجھے لکھنا پڑھنا سکھایا تھا۔ میں اسے 'امیر ارسلان' پڑھ کر سنایا کرتی۔ 'امیر ارسلان' ہم نے پانچ بار پڑھی، 'شمس قمقمہ' تین بار اور 'یوسف غدرا' دو بار۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ کے پاس بہت سی کتابیں تھیں۔ ہم انھیں ایک ایک کر کے پڑھتے، پھر واپس ان کی جگہ پر رکھ دیتے۔ حاجی اسمٰعیل اسکول کا چپراسی تھا اور میں ہیڈ مسٹریس صاحبہ کی گھر کی خادمہ تھی۔ گھر میں کام کچھ زیادہ نہیں تھا۔ صبح دس بجے کے قریب انار کے دانے نکال کر ان کے لیے اسکول لے جانا ہوتا تھا۔ جب انار نہ ہوتا تو شربت لے جاتی۔ مجھے صرف دوپہر کا کھانا پکانا ہوتا تھا۔ رات کا کھانا وہ نہیں کھاتی تھیں، صرف ایک پیالہ دودھ پی کر سو رہتیں۔ خدایا! حاجی اسمٰعیل کے ساتھ میں نے شہر میں کیا کیا تفریحیں نہیں کیں۔ ہم ہر تھیٹر اور ہر سنیما میں گئے۔ 'بغداد کا چور'، 'ہنسائے عرب'، 'اسرار نیویارک'، 'آرشین مالالان'، ہر فلم ہم نے چار چار پانچ پانچ دفعہ دیکھی۔ ہماری کمائی میں برکت بہت تھی۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ مجھے الگ سے تنخواہ دیتی تھیں، اور حاجی اسمٰعیل کو تو وزارت خانے سے تنخواہ ملتی تھی۔

''جیمے کے ڈاکٹر نے خود مجھ سے کہا تھا: 'اپنے آپ سے باتیں کیا کرو۔ جو کچھ تمھیں خوشی یا رنج پہنچائے، اس کا ذکر کرو۔ دل میں کچھ مت رکھو۔'

''ہم کربلا گئے، گناہوں سے توبہ کی، امام حسین سے اولاد مانگی۔ خدا نے ہمیں رباب عطا کی۔ اس کے اگلے سال، ایک دن حاجی اسمٰعیل صبح اپنے کام پر گیا تو شام کو واپس نہیں آیا۔ ایک اچھا خاصا سیاچوڑا آدمی ایسا گم ہوا کہ پھر اس کا نشان تک نہ ملا۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ، پولیس، خفیہ والے، سب اس

---

[1] تہران کے قریب واقع ایک پہاڑی مقام۔

کی تلاش میں گھومتے پھرے۔ میں خود، ربابہ کو گود میں لے کر، ایک دفتر سے دوسرے دفتر تک ماری ماری پھرتی رہی۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ حاجی اسمٰعیل نام کا کوئی شخص تھا ہی نہیں۔ میں ربابہ کو سلا کر خود اکیلی بیٹھی افیون پیا کرتی۔ میں نے ہیڈ مسٹریس صاحبہ کی بلی کو بھی افیون کی عادت ڈال دی۔ افیون کی بو سونگھتے ہی وہ میرے پاس آ کر بیٹھ جاتی اور آنکھیں موند کر خرخرانے لگتی۔ میں اس پر افیون کا دھواں پھونکتی تو وہ انگڑائیاں لینے لگتی۔ لیکن وہ اپنی طبعی موت مر گئی۔ پھر میں نے مکڑی کو افیون کی عادت ڈال دی۔ اس نے کمرے کے ایک کونے میں جالا تان رکھا تھا۔ افیون کی بو آتے ہی وہ نیچے آ جاتی اور پھر انگیٹھی سے دور نہیں ہوتی تھی۔ مگر ایک دن چمٹا اس پر گر گیا، وہ بھی مر گئی۔

"ہیڈ مسٹریس صاحبہ نے درخواست لکھ کر اپنے اسکول میں حاجی اسمٰعیل کی جگہ مجھے چپراسن رکھوا دیا۔ جب تک زندہ رہیں، مجھے اپنے گھر میں ہی رکھے رہیں۔ اللہ انھیں جنت نصیب کرے، کہتی تھیں، 'تمھارا کام دگنا ہو گیا ہے، لیکن تمھارے لیے اس سے بہتر چیز کیا ہو گی۔ تم یہ پہاڑ سی عمر، اپنے ساتھی کے بغیر، مصروف رہ کر ہی کاٹ سکتی ہو۔' وہ میری افیون پینے کی عادت سے ناراض تھیں۔ انھوں نے مجھے اتنا ٹوکا کہ میں نے افیون پینا چھوڑ ہی دیا۔ اس کے علاوہ میرا کام اتنا زیادہ تھا کہ مجھے اس کا وقت ہی نہ ملتا تھا۔ میں گھر میں ہیڈ مسٹریس صاحبہ کے لیے کام کرتی، پھر اسکول جا کر صفائی کرتی، غسل خانے دھوتی۔ لڑکیوں کے امتحان کے نتیجے ان کے گھروں تک پہنچاتی اور ان سے انعام پاتی۔ ہر عید کو مٹی کے گملوں میں لادن کا پھول، گیہوں اور والیں اگاتی، پھر انھیں ہیڈ مسٹریس صاحبہ کے کمرے میں رکھتی یا استادوں کے گھروں پر لے جاتی — دو تومان سے لے کر دس تومان تک انعام ملتا تھا۔ میں یہ سب کام ربابہ کی خاطر کرتی تھی تاکہ اسے کوئی کمی نہ رہے۔ میں اسے امیر اور اعلیٰ طبقے کی لڑکیوں کی طرح کپڑے پہناتی۔ اس نے میٹرک کی ڈگری حاصل کی۔ اگر ہیڈ مسٹریس صاحبہ نہ مرتیں تو میں اس کی شادی نہ کرتی۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ کیا مریں، میں تو بالکل بے امان ہو گئی۔ اٹھارہ سال کی ملازمت کے بعد مجھے گھر بٹھا دیا گیا۔ کہا گیا کہ تمھاری ملازمت کی عمر پوری ہو چکی ہے۔ مجھے ہیڈ مسٹریس صاحبہ کے گھر سے بھی نکلنا پڑا۔ مجبور ہو کر میں نے اپنی بیٹی کی زندگی برباد کر دی۔ میں نے اسے اس مدکار اور بے مروت شخص سے بیاہ دیا۔ آقائے لاچینی کے دفتر میں ملازم ہے۔ خدا کا نیک بندہ نہیں ہے۔ مگر میں کیا کرتی؟ ربابہ حسین تھی، شرفا اور اعلیٰ طبقے کی لڑکیوں کی طرح کپڑے پہنتی تھی، ہر ہفتے مشاطہ کے پاس جاتی تھی۔

اپنی پنشن میں، اور کرائے کے کمرے میں رہتے ہوئے، میں اس کی خواہشیں کیسے پوری کر سکتی تھی؟ اور پھر اس نے یونیورسٹی کا امتحان بھی پاس نہیں کیا تھا۔

''بیٹے کا ڈاکٹر کہتا تھا: جس شخص کو بھی جی چاہے، اونچی اونچی آواز میں گالیاں دے کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کرو۔' میری زبان پر اب صرف گالیاں آتی ہیں۔ خدا جانتا ہے کہ میرا دل محبت سے بھرا ہوا تھا۔ نہریں، پیڑ پودے، آسمان پر چمکتا چاند، یہ سب مجھے اچھے لگتے تھے۔ کسی نے مجھے نماز روزہ، دعا و ثنا نہیں سکھائی تھی۔ جب کربلا گئی تو حاجی اسمٰعیل کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتی تھی۔ وہ اونچی آواز میں پڑھتا اور میں دل ہی دل میں دہراتی۔ تہران آنے کے بعد سب بھول بھال گئی۔ اب اس کے بجائے مجھے صرف گالیاں دینا آتی ہیں۔ میں زمانے کے سب نامردوں اور ناکسوں کو گالیاں دیتی ہوں۔ وہ سب جواب خائن اور بے مروت ہو گئے ہیں، میں ان سب پر نفرین بھیجتی ہوں۔ بہت سے لوگ اچھے بھی تھے، اپنی بات پر قائم رہنے والے۔ ان میں سے کچھ مر گئے اور کچھ گم ہو گئے۔ خدا سب جانے والوں پر رحمت کرے۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ کہتی تھیں، 'ہماری کم بختی یہ ہے کہ ہم اچھے لوگوں کو برا بنا دیتے ہیں۔' وہ کہتی تھیں: 'ایسا لگتا ہے کہ ہمارا خون رگوں سے نچوڑا جا رہا ہے جس کی وجہ سے ہم بے خون اور بے مروت ہو گئے ہیں۔'

''میرزا رضا کرمانی؎ کو جب اُس مجلس میں لایا گیا جہاں سب اعلیٰ طبقے کے شرفا اور صاحب منصب لوگ بیٹھے ہوئے تھے، تو اس سے بار بار کہا گیا کہ سلام کرو۔ اس نے ہر بار یہی جواب دیا کہ کیسے سلام کروں؟

''ہیڈ مسٹریس صاحبہ نے بتایا تھا کہ میرزا رضا کی دادی خود عین الدولہ، وزیر اعظم، کے پاس گئی تھیں۔ انھوں نے اپنے سر سے رومال اتار کر عین الدولہ کے سر پر ڈال دیا اور اس کی ٹھوڑی کے نیچے گرہ لگا دی۔ ''میرا جی کرتا ہے بازار جا کر دکانوں کا سارا کپڑا خرید لوں اور اس کے رومال بنا کر ان تمام

؎ میرزا رضا کرمانی ایران کے حکمراں قاچار خاندان (۱۷۸۵ء تا ۱۹۲۵ء) کے چوتھے بادشاہ ناصرالدین قاچار (۱۸۳۱ء، ۱۸۹۶ء) کا قاتل۔ ناصرالدین کے زمانے میں ایران میں جدیدیت کا آغاز ہوا لیکن ساتھ ہی غیر ملکی مداخلت اور تسلط کا بھی۔ میرزا رضا کرمانی نے ناصرالدین کو اس وقت گولی ماردی جب وہ اپنی بادشاہت کے پچاس برس پورے ہونے پر شہر رے میں واقع شاہ عبدالعظیم کی درگاہ پر گیا تھا۔ میرزا رضا کو بعد میں پھانسی دے دی گئی۔

Scanned with CamScanner

نامردوں کے سروں پر پہنا دوں۔ خدا آپ کی قبر کو روشن کرے، ہیڈ مسٹریس صاحبہ، آپ ٹھیک کہتی تھیں، عورتیں ان لوگوں سے ہزار گنا زیادہ غیرت مند ہیں...

''باہر جا کر شیر برنج بنانے کے لیے دودھ لے آؤں۔ نہیں، فیرنی بناؤں گی۔ لیکن باہر اتنی برف جمی ہوئی ہے، چل کیسے سکوں گی؟ جو امریکی بوٹ میں نے حال ہی میں خریدے ہیں وہ میرے ناپ سے بڑے ہیں۔ میرے دانت ہل رہے ہیں، گردن اور داہنے کان میں ٹیسیں اٹھ رہی ہیں، داہنے گھٹنے میں بھی درد ہو رہا ہے۔ اور کل رات سے متواتر حاجی اسمٰعیل کو یاد کر رہی ہوں۔ دماغ پھٹا جا رہا ہے۔ لیکن مجھے باہر نکلنا چاہیے۔ اگر یونہی کمرے میں اکیلی بیٹھی اپنے آپ سے باتیں کرتی رہی تو پاگل ہو جاؤں گی۔ اب پھر میرا دل الٹنے کو ہو رہا ہے۔ میں اپنے پیروں پر پہلے اخبار کا کاغذ لپیٹوں گی، پھر وہ اونی جرابیں جو میں نے خود بنی ہیں، کاغذ پر پہنوں گی۔ تب وہ بوٹ میرے پیروں میں ٹھیک آ جائے گا۔ ان دنوں بُنائی کرنے میں میرا دل بہت بہلتا ہے۔ سب خیال اور پریشانیاں ذہن سے دور رہتی ہیں۔ اب تک میں ربابہ کے بیٹوں، منصور اور مسعود کے لیے دس اونی جرسیاں بن چکی ہوں۔ ان پر میں نے بہت پیاری تصویر کشی بھی کی۔ لیکن ان کے باپ نے انھیں مجھ سے تحفہ لینے کو منع کر دیا۔ اب میں آپ ہی بُنتی اور ادھیڑتی رہتی ہوں۔ نہ میرا کوئی ہے جس کے لیے بنوں اور نہ میرے پاس اتنا پیسہ ہے۔ ہر چیز اس قدر گراں ہو گئی ہے، لگتا ہے جیسے قیامت آ گئی ہو۔ صرف آدمی کی جان ارزاں ہے۔

''میں نے اسے پہلے ہی دن بتا دیا تھا کہ دنیا میں میرا اس اکلوتی بیٹی کے سوا کوئی نہیں۔ اگر کسی نے میری بیٹی کو مجھ سے جدا کیا تو خدا کو اچھا نہیں لگے گا۔ لیکن وہ بدمعاش تو پہلے سے ہی میرے خلاف تھا، ورنہ پھر کیوں اس نے مجھ سے اتنی دور باغ صبا میں گھر لیا؟ اس کے بعد میں نے ایک بار سچ بات کہہ دی تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے میری بیٹی کے گھر سے نکال دیا۔ مگر میں جانتی ہوں مجھے کیا کرنا ہے۔ میں جا کر خانم پیر پور سے نمازِ رسوائی سیکھوں گی۔ اپنی شلوار سر پر باندھ کر، بیت الخلا کی چھت پر اپنے داماد کے لیے، اس کی جان پر آتش لگے، نمازِ رسوائی پڑھوں گی۔ اس پر لعنت اور نفرین بھیجوں گی۔ خانم پیر پور کو ہر قسم کی نمازیں آتی ہیں۔ اس دن انھوں نے خود ہی چھت پر مجھ سے نہیں کہا تھا کہ نمازِ رسوائی پڑھو؟ ان کے ہاں ہر جمعرات کی رات کو آقائے راشد کی مجلس سنی جاتی ہے۔ وہ اپنے ریڈیو کی آواز اونچی کر دیتی ہیں تاکہ سب ہمسائے سن سکیں۔ قمر الملوک وزیری کی آواز سننے کو میرا کتنا دل کرتا ہے۔ کیسی

بلبل کی طرح چہچہاتی تھی۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ کے پاس قمرالملوک کے کئی ریکارڈ تھے۔ پتا نہیں بعد میں کس کو ملے۔ خدا انھیں جنت نصیب کرے۔ گرمیوں میں وہ اوین ورک چلی جاتی تھیں اور اسکول کی بھی چھٹیاں ہو جاتی تھیں۔ ہم صحن میں چھڑکاؤ کرتے۔ ان اطلس کے پھولوں کو پانی دیتے جنھیں ہم نے خود لگایا تھا۔ انگوری بیل کے سائے میں بیٹھتے۔ گراموفون کو کوک دے کر گانے سنتے۔ قمرالملوک کے گانے، قلی کے، اقبال السلطان کے۔ میں لیموں کا شربت بنا کر حاجی اسمٰعیل کو دیتی۔ اس سے کہتی، 'نوش کرو۔ تمھاری جان پر گوارا ہو۔' وہ کہتا، 'پہلے تم پیو۔'... کاش ربابہ ذرا دیر کو منصور اور مسعود کو لے کر آ جاتی! میں کتنی خوش ہوتی۔ میں نے مسعود سے کہا تھا، 'چوہا تمھیں کھا جائے گا۔' اس نے کہا، 'چوہا تمھیں ہی کھائے گا۔' میں نے اس سے کہا، 'اپنی نانی کو ایک بوسہ دو۔' اور اس کا چہرہ اپنے ہونٹوں کے قریب لے آئی۔

کسی کے لیے نماز رسوائی بیت الخلا کی چھت پر پڑھنی چاہیے جب دھوپ نکلی ہوئی ہو، اور اس کے بعد یزید و معاویہ پر تبرا کرنا چاہیے۔ یہ سب خانم چیرپور صاحبہ نے بتایا ہے۔ سردیاں شروع ہونے سے پہلے کی بات ہے، وہ چھت پر بیٹھی ترکاری صاف کر رہی تھیں۔ دھوپ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ میں وہاں کپڑے پھیلانے گئی تھی۔ میرا دل بہت اداس تھا اس لیے میں نے ان کے پاس جا کر سلام کیا۔ اس دن ہم نے خوب باتیں کیں۔ دل کی باتیں سنیں اور سنائیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں نے زندگی سے خوب لطف اٹھایا ہے اور سب نعمتیں چکھی ہیں۔ پھر میں نے اپنے داماد کے بارے میں بتایا کہ اس نے کس کس طرح میرے دل کو خون کیا ہے۔ وہ بولیں، 'اس کی نماز رسوائی پڑھو تاکہ خدا اس کو بے آبرو کرے۔' لیکن اس دن کے بعد پتا نہیں کیا ہوا کہ ان کا برتاؤ میرے ساتھ بدل گیا۔ جب ہم دونوں کا آمنا سامنا ہوتا تو وہ یوں ظاہر کرتیں جیسے مجھے جانتی ہی نہ ہوں۔ میں نے بھی انھیں پھر کبھی سلام نہیں کیا۔ اس کے باوجود میں چاہ کر ان سے نماز رسوائی سیکھوں گی۔ کاش دھوپ نکلی ہوئی ہوتی اور بیت الخلا کی چھت پر اتنی برف نہ ہوتی۔ خدا نے اپنا پھٹا ہوا لحاف پھاڑ دیا ہے۔ اس بڑے سے لحاف کی روئی سب جگہ گری ہوئی ہے اور اب تک گر رہی ہے۔... استغفراللہ! جی نہیں، میرا دماغ خراب ہے۔ بھلا یہ انسانوں کی سی باتیں ہیں! اے عورت، کفر بکنے ہی کا نتیجہ ہے کہ تجھ پر اتنی مصیبتیں اور بلائیں پڑیں۔

"میں نے اس سے بس اتنی سی بات کہی تھی، 'تم کیسے مرد ہو؟ تم نے اور تمھارے نکمے بھائیوں نے میری بیٹی کو مار ڈالا ہے۔ پورے دنوں سے ہے، پھر بھی ایک ہاتھ میں اس تمھاری حرام کی اولاد

Scanned with CamScanner

مسعود کا ہاتھ تھامتی ہے اور دوسرے ہاتھ میں بچے کا کٹوردان پکڑتی ہے، تم سب لوگوں کے کپڑے دھوتی ہے، استری کرتی ہے، دوپہر کا اور رات کا کھانا پکاتی ہے۔ اور تمھاری ماں بیٹھی تسبیح پھیرتی رہتی ہے، حکم چلاتی رہتی ہے۔ تمھارے بھائیوں کو ایسا لگتا ہے کہ ملازمہ مل گئی ہے۔ تم خود جب وثیقہ نویس کے دفتر سے واپس آتے ہو (تمھاری موت کی خبر آئے) میری بیٹی گرم پانی لا کر تمھارے پیر دھوتی ہے، تمھارے پیروں کی میخوں پر جھانواں رگڑتی ہے۔ میں نے خود اپنی اندھی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'

''جب بھی میں ان کے گھر گئی ہوں، خوش خوش جا کر غمگین واپس آئی ہوں۔ وہ اس قدر منھ بناتا، اور اس کی ماں مجھ پر اور میری بیٹی پر ایسی نوکا ناکی کرتی اور اس کے بھائی اتنی بدتمیزی سے پیش آتے کہ میں اپنی زندگی سے تنگ ہو جاتی۔ بہت کم وہاں جاتی تھی۔ ایک روز سہ پہر کو میں مسعود کی صورت دیکھنے اس کی نرسری تک گئی۔ میں نے خود دیکھا، رباب ایک ہاتھ میں بچے کا کٹوردان اور خریداری کی ٹوکری اور دوسرے ہاتھ میں مسعود کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔ نو مہینے کی حاملہ عورت برف پر پھسل پھسل کر چل رہی تھی۔ مسعود اس کی گود میں آنے کی ضد کر رہا تھا۔ میں نے بچے کو گود میں لیا، اور اپنی بیٹی کے ساتھ اس منحوس گھر کی طرف چل پڑی۔ وہ مردک کرسی کے پیچھے آرام سے بیٹھا تخمے چھیل چھیل کر کھا رہا تھا۔ اس کی ماں بھی اسی کمرے کے کونے میں نماز پڑھ رہی تھی۔ اس کی نماز اس کی کمر پر پڑے! اس کے بھائی ابھی نہیں آئے تھے۔ میں نے کہا، 'تم انسان ہو؟ تمھاری موت کی خبر آئے، تم سے اتنا نہیں ہوتا کہ جا کر نرسری سے اپنے بچے کو لے آؤ؟' میں نے منھ پھاڑ کر جو کچھ کہنا تھا کہہ ڈالا۔ وہ حیرت سے مبہوت رہ گیا۔ پھر کرسی کے نیچے سے نکل کر آیا، ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا مجھے کمرے سے باہر لے گیا اور گھر سے باہر کر دیا۔ اس نے مجھے غول بیابانی، لڑاکا عورت اور بدشکل جادوگرنی کہا۔ اور بھی بہت کچھ برا بھلا کہا۔

'اور وہ میری بیٹی کو مارتا پیٹتا بھی ہے۔ مجھے ہمسایوں نے بتایا۔ یہ بھی بتایا کہ وہ رباب سے کہتا ہے کہ تمھاری ماں نے اسکول کی چپراسن اور نوکرانی کی کمائی سے تمھیں پالا ہے۔ میں نے یہ بھی سنا کہ میری بیٹی نے دایہ کے بغیر منصور کو جنم دیا ہے۔ اب تو وہ بیس مہینے کا ہو گیا ہوگا، باتیں بھی کرنے لگا ہوگا۔ اس منحوس کی ماں نے کہا، 'دوسرے بچے کے لیے دایہ کی کیا ضرورت ہے؟' اسے دایہ کے بغیر ہی زچگی کو جھیلنا پڑا۔ صرف ہمسایوں نے اس کی مدد کی۔ یہ سب سن کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ تین کلو نارنگی لے کر چکی

Scanned with CamScanner

سے ملنے گئی۔ بیچاری کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑا ہوا تھا۔ بہت برا حال تھا۔ بستر پر اٹھ کر بیٹھنے تک کے قابل نہیں رہی تھی۔ مجھ سے التجا کرنے لگی کہ 'اماں، یہاں نہ رہو، چلی جاؤ۔ پھل بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اگر اسے پتا چل گیا کہ تم یہاں آئی تھیں تو مجھے اتنا مارے گا کہ معلوم نہیں کب تک بستر پر لیٹے رہنا پڑے۔' مجھے ایک کونے میں میلے کپڑوں کا ڈھیر دکھائی دیا۔ میں آپے سے باہر ہو گئی۔ میں نے کہا، 'ربابہ، ماں تجھ پر قربان، یہ تیری کیسی زندگی ہے؟ یہ تو موت ہے۔ میں نے اور تیرے ابا نے، اللہ انھیں جنت عطا کرے، زندگی کو اتنی اچھی طرح گزارا۔ تو کیوں اس زندگی کو برداشت کر رہی ہے، اور کوئی احتجاج بھی نہیں کرتی؟ زندگی انسان کو کتنی دفعہ ملتی ہے؟ تیرے ابا تیرے پوتڑے بدلتے تھے، لوری دیتے تھے، نہلاتے دھلاتے تھے، سیر کرانے لے جاتے تھے...' وہ بولی، 'اماں، میرے دو بچے ہیں۔ میں طلاق نہیں لے سکتی۔ اس کے علاوہ وہ میرے ساتھ بدسلوکی نہیں کرتا۔' میں نے کہا، 'تمھیں اگر نوکرانی ہی بننا تھا تو پھر پڑھنے لکھنے کی کیا ضرورت تھی...'

''آہ ربابہ، تم مجھے بچہ سمجھتی ہو کیا؟ اس سے زیادہ اور کیا بدسلوکی ہو گی؟ اس نے میرے مسعود کی نرسری تک جانے پر بھی پابندی لگا دی۔ میں اس کے گھر کے پاس کی گوشت، دودھ دہی اور سودا سلف کی دکانوں کے چکر کاٹتی ہوں، تاکہ اپنی بیٹی کے کسی ہمسائے سے مل سکوں۔ وہ میری بیٹی کو دیکھتے ہوں گے یا اس بدکار کتے کی آواز سنتے ہوں گے۔ میرے سننے میں آیا ہے کہ ربابہ عینک لگانے لگی ہے، ہاں، پڑھنے لکھنے والی لڑکی ہے۔... اے دل غافل، یہ بات نہیں! ضرور اس مردک نے میری بچی کے سر پر مارا ہو گا جس سے اس کی آنکھیں کمزور ہو گئیں۔ کیسی کیسی ہولناک باتیں سنتی ہوں۔ کہتے ہیں اس نے میری بچی کا سر پھاڑ دیا، مسعود کو بھی مارا، بچے کے کان سے خون بہنے لگا۔ کیا کیا سننا پڑتا ہے... اپنے اس داماد کے لیے میرے دل سے ایسی بددعائیں نکلتی ہیں کہ ان میں سے ایک بھی پوری ہو جائے تو اس کی ستر پشتوں کے لیے کافی ہو۔ لیکن کیا کروں کہ ظالم ہمیشہ ہنا کٹا ہی رہتا ہے۔

''اے ربابہ، میں نے اور تمھارے ابا نے اس دنیا سے خوب حظ اٹھایا۔ تمھیں بھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی۔ میں نے کہا، جب تک تم میرے گھر میں ہو اس وقت تک تمھیں کوئی تکلیف نہ ہو؛ شوہر کے گھر جا کر ہو تو ہو۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ تمھاری زندگی یوں جہنم بن کر رہ جائے گی۔ اس بدمعاش کی ناقدر شناس بہنیں جب بیمار ہوتی ہیں تو اپنی اماں جان کے گھر میں آ کر ڈیرا ڈال دیتی ہیں۔

تمھیں اور تمھاری اماں جان کو موت آئے، بھلا کون تمھاری تیمارداری کرتا ہے؟' ربابہ، جلدی سے جوس لے کر آؤ، جلدی سے چوزے کی یخنی بناؤ، جلدی سے بازار سے دودھ لا کر گرم کرو ہمارے زہر مار کرنے کے لیے 'خدا ہیڈ مسٹریس صاحبہ کو جنت نصیب کرے، مجھ سے کہتی تھیں، 'اس بچی کو کوئی دکھ محسوس نہ ہونے دینا۔ اسے خوب پڑھانا لکھانا۔ تم اسے اپنے طبقے سے اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہی ہو، لیکن تم کو معلوم نہیں ہے کہ عورت ہوتی ہی محنت کش طبقے سے ہے۔' خانم، خدا آپ کی قبر کو نور سے بھر دے، آپ کی باتوں میں کتنی دانائی تھی!

''اٹھوں، دودھ لینے جاؤں۔ فیرنی بناؤں گی۔ نہیں، شیر برنج۔ میری بتیسی کس بری طرح ہل رہی ہے۔ بیمے کے ڈاکٹر نے بھی تو کہا تھا کہ جب تنہا بیٹھے بیٹھے پریشان ہو جاؤ تو باہر نکل جایا کرو ''

اس نے اٹھ کر آئینے میں دیکھا۔ اس کے بالوں کی جڑیں سفید تھیں، بیچ میں وہ سرخی مائل رنگت کے اور سروں پر سیاہ ہو رہے تھے۔ اس کے داماد نے اسے بلاوجہ بدشکل جادوگرنی کا لقب نہیں دیا تھا۔ مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ جب انسان ٹھنڈی آہ بھرتا ہے تو سفید بال اس کے دل سے اگتا ہے۔ جب ربابہ اس کے پیٹ میں تھی تو نویں مہینے میں اسے اپنے دل میں خارش محسوس ہوتی تھی۔ تب ہیڈ مسٹریس صاحبہ نے کہا تھا: 'بچے کے بال نکل رہے ہیں۔ بچے کے بال اس کی ماں کے دل سے اگتے ہیں۔' وہ کہا کرتی تھیں: 'ہم جس طرح بھی سوچیں، حقیقت یہ ہے کہ عورت کا تعلق محنت کش طبقے ہی سے ہے۔'

اس نے کرسی کا پردہ ہٹا کر دری کے نیچے سے ایک تومان نکالا۔ افسوس، اس نے اپنے دو گردی غالیچے بیٹی کے جہیز کے طور پر داماد کے گھر بھجوا دیے تھے۔ سر پر چادر اوڑھ کر اور اپنی عنابی چھتری ہاتھ میں لے کر وہ صحن کے دروازے سے باہر نکلی۔ بہت احتیاط سے، لوگوں کے مکانوں کی دیواروں، لوہے کی سلاخوں اور کھڑکیوں کو پکڑ پکڑ کر چل رہی تھی۔ کاش اپنے دانت نکال کر گھر رکھ آئی ہوتی۔ لیکن وہ بتیسی کے بغیر پوپلے منہ کے ساتھ لوگوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے پوری خیابان علائی کو پیدل طے کر کے جانا تھا۔ اس کے بعد منکہ منصوبہ بندی کی عمارت کے پیچھے سے ایک راستہ خیابان شاہ آباد پر نکلتا تھا جہاں ہر قسم کی دکانیں تھیں۔ وہاں سے تھانے کے بغل کی گلی سے ہو کر وہ خیابان ژاله پر آ سکتی تھی جہاں آقائے شیر پور کی دودھ دہی کی دکان تھی۔

دودھ ختم ہو چکا تھا۔ نہ بوتل والا دودھ ملا، نہ ڈبے والا دودھ اور نہ عام دودھ۔ ''اے تہران، برباد

ہو جا، بے مروت اور خائن اور نامرد لوگوں کے سروں پر مسمار ہو جا۔ تیری سردیاں سخت ٹھنڈی اور گرمیاں خشک ہیں۔ تیرے پاس نہ کوئی دریا ہے، نہ پیڑ پودے اور نہ کوئی نہر۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ کہا کرتی تھیں کہ تہران سیاہی چوس پر کسی روشنائی کے داغ کی طرح ہر سمت میں پھیلا ہوا ہے، اس نے کسی کیکڑے کی طرح ٹانگیں پھیلا کر اپنے اردگرد کو پکڑ لیا ہے۔ اے چڑچڑے اور بدمزاج شہر، ویران ہو جا!"

وہ قصاب کی دکان پر پہنچی۔ وہاں خانم پنیر پور گوشت لے رہی تھی۔ اس نے ایک پوری ران کے گوشت کی فرمائش کی تھی۔ قصائی جعفر ران کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں بناتے ہوئے بغدے سے ہڈیوں کو آدھا کر رہا تھا۔ وہ ایرانی بھیڑ کا تازہ گوشت تھا، نہ کہ برف میں لگایا ہوا۔ اس نے کہا، "دو کلو سات سو گرام۔" تو لوگ اس طرح موٹے تازے اور لمبے تڑنگے ہوتے ہیں! خانم پنیر پور نے سر پر اونی شال اوڑھ رکھی تھی اور ہاتھوں میں دستانے تھے۔ قمیص اور کوٹ کے اوپر پوستین پہن رکھی تھی۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے پچاس تومان کا نوٹ نکال کر قصائی جعفر کو دیا۔ جعفر کا ہاتھ چھری سے کٹ گیا تھا اور اس پر بندھی ہوئی پٹی سے خون رس رہا تھا۔

وہ خانم پنیر پور کے جانے کا انتظار کرتی رہی پھر ہاتھ بڑھا کر جعفر کو اپنا ایک تومان کا سکہ تھمایا۔ جعفر نے چربی اور کھال اور ذرا سا گوشت اور ایک جمی ہوئی ہڈی تختے سے اٹھا کر ترازو میں ڈالی۔ کوکب سلطان نے کہا، "آقا جعفر، یہ جما ہوا گوشت مجھے نہ دو، پتا نہیں کس قبرستان کا ہے۔ یہ تو اس قابل ہے کہ درخت کی جڑوں میں کھاد کے طور پر ڈالا جائے۔" قصائی جعفر نے درشتی سے کہا، "جو کچھ ہے یہی ہے۔ ایک تومان میں کیا تمھیں پسندے ملیں گے؟" اس نے وہ سب چھیچھڑے اور ہڈیاں اخبار میں لپیٹ کر کوکب سلطان کے ہاتھ میں پکڑا دیں۔ اگر حاجی اسمٰعیل زندہ ہوتا تو کیا وہ ایسی ہمت کر سکتا تھا؟

کوکب سلطان پر کیسا خوف طاری تھا! یہ خوف خود ایک قسم کی بیماری تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اسے ساری عمر اسی طرح تنہا رہنا پڑے گا، اس کا داماد کبھی اس سے صلح نہ کرے گا اور وہ کبھی اپنی بیٹی کا منھ نہ دیکھ سکے گی۔ پٹرول پمپ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کا پیر پھسلا اور وہ گرنے کو ہوئی۔ زمین پر جمی ہوئی برف شیشے جیسی ہو رہی تھی، اور اس جمی ہوئی برف پر تازہ برف گر رہی تھی۔ اس کے خوف کی دوسری وجہ برف تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں برفباری اتنی نہ بڑھ جائے کہ اس کے لیے گھر سے باہر نکلنا ناممکن ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ نہ باغ صبا جا سکے گی اور نہ وہاں کی گوشت، دودھ دہی اور سودا سلف کی دکانوں

سے پوچھ تاچھ کر کے اپنی بیٹی کا کچھ سراغ پا سکے گی۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں اتنی برف نہ پڑ جائے کہ گھروں کے دروازے بند ہو کر رہ جائیں اور لوگوں کو چھتوں پر سے ہو کر آنا جانا پڑے۔ سوائے اس کے سب کمریوں سے مکانوں کی چھتوں پر کھونے رسے لگے ہوئے ہیں۔ ایک وہی اپنے کمرے میں قید ہو کر رہ جائے گی۔ اور پھر اسے وہی بیماری ہو جائے گی جو لوگ کہتے ہیں جاپان سے آئی ہے، جس میں اتنی قئیاں ہوتی ہیں کہ جسم کا تمام پانی خشک ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو وہ اکیلی، کسی تیماردار کے بغیر، اپنے کمرے میں مر کر بوسیدہ ہو جائے گی۔ اسے موت سے ڈر نہیں لگتا تھا، کیونکہ محبت بھرے دل والا آدمی موت سے خوف نہیں کھاتا۔ وہ برف، بیماری، تنہائی، بند دروازوں اور اپنے داماد کے قہر سے ڈرتی تھی۔ موت سے نہیں، بشرطیکہ اسے کوئی درد محسوس نہ ہو اور پتا نہ چلے کہ موت آ رہی ہے۔ بس وہ ایک نیند سے نکل دوسری نیند میں چلی جائے۔ اسے خانم پیچ پور کے بیان کیے ہوئے منکر نکیر اور قبر کی پہلی رات اور پچاس ہزار سال والے دن سے بھی ڈر نہیں لگتا۔ وہ ان میں سے ایک پر بھی یقین نہیں کرتی۔

اسے چاہیے کہ اپنے آپ کو اتنا مصروف رکھے کہ تنہائی کا خوف طاری نہ ہو۔ بنائی کرے، سیے پرانے، اور اچھے کپڑے سیے۔ اس نے سوچا کپڑے کی کترنوں کو جمع کر کے رلی بنانے کے کام میں مصروف ہو جائے۔ اپنے صندوقچے میں ڈھونڈ کر قینچی نکالے، اور کپڑے کی کترنیں اکٹھی کر کے رلی بنائے۔ لیکن کس کے لیے؟ اس کی بیٹی تو اس سے کوئی چیز لیتے سے ڈرتی ہے۔ پھر کس کی خاطر؟ وہ کیوں اور کس کے واسطے زندہ رہے؟ وہ کسے سلام کرے؟ کون رہ گیا ہے جسے انسان سلام کر سکے؟

نہ جانے کتنے دن سے جہنم سے نکل کر گلی کوچوں میں برف سے کھیل رہے تھے۔ وہ ہنسی ہوئی تھیں، پھسل رہے تھے اور راہ گیروں کے لیے راستے کو اور پھسلواں بنائے دے رہے تھے۔ اس کی چھتری پر برف کا ایک بڑا سا سفید گولہ آ کر لگا جس سے زوردار آواز آئی۔ وہ چھتری بند کر کے گالی دینے سے پیشتر مڑی۔ بچوں کا کھیل ہو رہا تھا۔ وہ خوشی خوشی برف پر پھسلنے کا کھیل کھیل رہے تھے۔ اسے ان پر ترس آنے لگا۔ کیا ایک زمانے میں وہ خود بچی اور نوجوان نہیں تھی؟ کیا اس نے دنیا سے خوب حظ نہیں اٹھایا ہے؟ کیا اس نے خود کم آفتیں سہی ہیں؟

حیدر علی کے سامنے بچوں نے برف کا بہت بڑا سا آدمی بنا رکھا تھا۔ ایک ایسا آدمی جس کی ایک آنکھ نظر آتی تھی اور دوسری آنکھ پر کالے چمڑے کا ایک گول ٹکڑا، کالی الاسٹک سے بندھا ہوا تھا۔ سر

Scanned with CamScanner

پر کالی ٹوپی دھری ہوئی تھی۔ وہ بڑھ بڑھ کر اپنے بنائے ہوئے برف کے آدمی پر حملہ کر رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے دل کی نفرت نکالنا چاہتے تھے۔[۴] انھوں نے اتنی چھلانگیں لگائی تھیں کہ ان کے گالوں سے خون ٹپکتا معلوم ہو رہا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکا برف پر پھسلتا ہوا کوکب سلطان کے سامنے سے آ رہا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کے گھر کے قریب ایک بڑے سے مکان کے پرنالے کے نیچے پہنچ گئی تھی۔ اس کے پاس آ کر اچانک لڑکے کا پیر پھسلا، وہ زور سے کوکب سلطان سے ٹکرایا اور دونوں گر پڑے۔ لڑکا اٹھ کر بھاگ گیا۔ کوکب سلطان زمین پر ایک طرف پڑی ہوئی تھی اور اس کی چھتری دوسری طرف۔ اس نے جو گوشت لیا تھا (گوشت کیا تھا، چھیچھڑے) وہ گر کر برف پر بکھر گیا تھا۔ کوکب سلطان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس قدر کمزور ہو گئی ہے۔ لگتا تھا کہ وہ جمی ہوئی اور تازہ گرتی ہوئی برف کے ایک لق و دق صحرا میں گری پڑی ہے۔ بیٹے کے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق وہ اونچی آواز میں چیخ چیخ کر گالیاں دینے لگی۔

"بدقماش لڑکو! حرامزادو! اسکول کی چھٹیاں اس لیے ہوتی ہیں کہ تم لوگوں کی جان لے لو؟ معلوم نہیں کس قبرستان میں تخم وان پھٹا ہے جس سے یہ حرام کے بیج نکلے ہیں۔ اے لوگو، مجھے بچاؤ! اس حرام کے تخم نے مجھے دھکا مار کر زمین پر گرا دیا اور خود بھاگ گیا۔ میرا ہاتھ یا پاؤں ضرور ٹوٹ گیا ہوگا۔ ارے کوئی آئے، میرا ہاتھ پکڑ کر زمین سے اٹھائے! تمھاری موت کی خبر آئے، تم لوگوں کو صرف اپنی شان دکھانا آتا ہے؟ صرف اپنے کوٹ کی جیب سے پچاس تومان کا نوٹ نکال کر دو کلو گوشت لینا آتا ہے؟ ایسا کبھی ہوا کہ دہی کی ایک پیالی اپنے ہمسائے کو پیش کی ہو؟ تمھاری ماں تمھاری جوان موت دیکھے! خدا کرے میں تمھاری موت کی خبر سنوں! تمھاری زندگی میں کوئی خوشگوار دن نہ آئے ہائے، تو نے مجھے میری بچی سے دور کر دیا، ربابہ، تم کہاں ہو؟ دیکھتی ہو تمھاری ماں کیسے ذلیل ہو رہی ہے! حاجی اسمٰعیل، تم کہاں ہو؟ میرے ہونٹوں پر ہزار مسکراہٹیں رہتی تھیں۔ اور اب ذرا میرا حال دیکھو! خدا کسی عزیز کو یوں حقیر نہ کرے۔ اے ذلیل بدتمیز بچو! اگر تمھیں کوئی ذرا سا ٹوک دے تو تمھارے ہزار پوچھنے والے نکل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت سب کے سب پتا نہیں کہاں مر گئے ہیں"

کچھ راہگیر اس کی طرف آئے۔ کالی ڈاڑھی اور عینک والے ایک نوجوان نے جھک کر کوکب

---

۴ اسرائیل کے سابق وزیر دفاع موشے دایان کی طرف اشارہ ہے۔

سلطان کا ہاتھ تھاما اور اسے زمین سے اٹھایا۔ اس نے زمین سے اس کی چادر اٹھا کر اس پر سے برف جھاڑی اور اسے اس کے سر پر رکھ دیا۔ وہ اسے سہارا دیتے ہوئے بولا، ''میں آپ کو پہنچا دیتا ہوں۔'' ایک خوش وضع عورت نے کہا، ''اگر آپ کو لگ رہا ہے کہ آپ کی کوئی ہڈی ٹوٹ گئی ہے تو میں آپ کو ہسپتال لے چلوں؟''

کوکب سلطان کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور منھ کا ذائقہ کڑوا ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ عورت کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ ایسے ہی کسی نوجوان کو اپنے داماد بنانے کی خواہش رکھتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اور یہ عورت جیسے اس کی بیٹی ہے۔ پھر اس نے سوچا جیسے شہر کے سب لوگ اس کے رشتے دار اور دوست ہیں، اور اس خیال سے وہ خوش ہو گئی۔ اس نے سب کی طرف منھ کر کے سلام کیا اور پھر ایک دم رو پڑی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو یوں بہہ رہے تھے جیسے حاجی اسمٰعیل ابھی کل ہی گم ہوا ہو۔

❀ ❀

سیمین دانشور

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

پیدائش

مغرب کے وقت اکرم، جو بڑی بہن تھی، شہر کے جنوبی حصے میں واقع مطب سے تھکی ہاری گھر لوٹی۔ اپنا بیگ اس نے ہال کمرے کی میز پر رکھ دیا۔ مہین نے، جو اسی میز پر بیٹھی خط لکھ رہی تھی، سر اٹھایا اور اپنی بہن کے گرد آلود اور اداس چہرے کو غور سے دیکھا۔ بولی، ''ابھی خط پورا کرلوں تو باہر گھومنے چلتے ہیں۔'' زند چوک، عوامی سیرگاہ، ان کے گھر کے جنوب کی طرف واقع تھا۔ جنگ کے آخر آخر کے دن تھے اور ان کے باپ کی موت کو تھوڑا عرصہ ہوا تھا۔ مہین باپ کی موت کے وقت تہران یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی۔ اس نے انھیں مرتے ہوئے اپنی آنکھ سے نہ دیکھا تھا اور دور رہ کر ان کا غم کیا تھا۔ اب شیراز آئی تھی کہ اپنے گھر والوں سے مل کر خود کو تسلی دے سکے۔ خاص طور پر اس لیے کہ تہران میں آدمی کو بہت خوف محسوس ہوتا ہے۔ شہر میں بے اسلحہ فوجی، کھلے کالروں والی قمیصیں پہنے اور اپنا سارا سامان ٹین کے کنستروں میں لیے ادھر اُدھر پھرا کرتے تھے۔ اور وہاں کے نان اینٹ کے ٹکڑے کی طرح سخت تھے۔

دونوں زند چوک کی طرف چلنے لگے۔ ان کے مکان کے سامنے فوج کی چھاؤنی تھی جس کی بتیاں جلی ہوئی تھیں۔ مہین نے پوچھا، ''یہاں رات کو اتنی دیر تک کام ہوتا ہے؟'' اکرم بولی، ''آج کل غیر معمولی دن ہیں۔'' پھر کہا، ''بھائی بھی دو ایک روز میں آنے والا ہوگا۔ خدا کرے جلدی آجائے، ورنہ ان دنوں شہر سے دور اس گھر میں کسی مرد کے بغیر زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔'' اگرچہ مہین نے گھر کے حالات کی کوئی شکایت نہ کی تھی، اکرم بولی، ''اس کا اردلی بہت ہوشیار ہے۔ وہ ہوگا تو ہماری زندگی

میں ٹھہراؤ آ جائے گا۔" سمین سے اب تک مہمانوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا، ماں اور بہن اس کو بہت عزیز جانتی اور اس کی ہر چیز کا خاص خیال رکھتی تھیں۔

زند چوک میں اندھیرا تھا، صرف ایک بلب چوک کے وسط میں جل رہا تھا اور شہرداری (بلدیہ) کی عمارت کو روشن کر رہا تھا۔ سمین خاموشی سے اندھیرے میں اپنی بہن کا جائزہ لے رہی تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ اس کی تھکن کا ذکر نہ کرے۔

خود اکرم نے ذکر چھیڑا۔ "پوچھو گی نہیں کیا بات ہے؟"

"کیا بات ہے؟"

اور دل میں سوچا کہ باجی، تمھیں ضرور عشق ہو گیا ہے۔ اور ہونا بھی چاہیے۔ اب نہ ہوا تو کب ہو گا؟ بائیس برس کی عمر ہو گئی ہے۔ لیکن تم اس قدر تو مصروف رہتی ہو کہ اس بارے میں سوچنے تک کی فرصت نہیں ملتی۔

لیکن اکرم کو چھوٹی بہن کے ان خیالات کا کچھ اندازہ نہ ہوا۔ اندھیرا ابھی تھا۔ بولی،

"تم جانتی ہو، جب سے تہران سے آئی ہوں مسلسل کام میں جتی ہوئی ہوں۔ پورا ایک سال ہونے کو آیا۔ مگر تمھیں ایک بات بتا دوں، دایہ کا کام سیکھنے پر بہت پچھتاتی ہوں۔ اتنے بڑے شیراز میں صرف ایک دایہ ہے۔ جب کسی پیدائش کے لیے جاتی ہوں، یوں لگتا ہے جیسے خود بچہ جن رہی ہوں۔ جیسا اسے درد ہوتا ہے ویسا مجھے محسوس ہوتا ہے۔ اور میرے پاس آلات تک نہیں ہیں۔ حیف!"

سمین نے کہا، "آدمی جب تھکا ہوا ہو تو اسے اپنا کام برا لگنے لگتا ہے۔ میرا خیال ہے تمھیں کچھ دن کی چھٹی کرنی چاہیے۔"

اکرم نے اس کی بات کا کچھ جواب نہ دیا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی، "لیکن الحمدللہ، اس ایک سال میں میرے ہاتھ کے نیچے کسی عورت کی جان نہیں گئی۔ یہ خود ایک بڑی بات ہے۔ صرف ایک مریضہ ایسی ہے جس کے لیے میرا بہت دل دکھتا ہے۔"

"کیا ہوا ہے اُسے؟"

"ہمیں قسم کھانی ہوتی ہے کہ کسی کا راز نہیں کھولیں گے۔"

سمین نے اصرار کیا، "تو ٹھیک ہے، نام مت بتانا۔"

اکرم نے بتایا، ''مجھے تھکن بھی محسوس ہو رہی ہے اور رنج بھی۔ تم بھی اب تک یہاں سے اکتا چکی ہوگی۔ چھوٹے شہر میں آدمی خود کو کیونکر مصروف رکھ سکتا ہے؟ یہ مریضہ مجھے سخت مصروف رکھے ہوئے ہے، لیکن تمھارے پاس کرنے کو کیا ہے؟ بس یہی گھر پر بیٹھے رہنا اور جب رشتے دار اور ملنے والے پُرسے کو آئیں تو مجبوراً نئے سرے سے سوگ کرنا۔ اور جب روتے روتے تھک جاؤ اور بہت زور لگانے پر بھی ایک آنسو نہ نکلے تو سب کی تیز نظروں کا سامنا کرنا...''

مہین نے بہن کی بات کاٹ کر کہا، ''میں خود کو تمھارے دل کے درد سے مصروف رکھ سکتی ہوں۔ درد بانٹنے سے آدمی کو راحت ملتی ہے۔''

''جانتی ہوں، جانتی ہوں۔''

مہین ہنسنے لگی اور بولی، ''میں کہتی ہوں کہیں تمھیں عشق تو نہیں ہو گیا۔ آخر تم بھی جانتی ہو کہ سب سے زیادہ لذت عشق کے درد ہی میں ملتی ہے۔''

''میں سمجھی نہیں تم کیا کہہ رہی ہو۔''

مہین نے پھر اسی طرح فلسفہ چھانٹا، ''آدمی کو عشق ہو جائے تو ساری تھکن اور اداسی اس کے ذہن سے فراموش ہو جاتی ہے۔''

اکرم بولی، ''تو تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ ایک مطب کھول لو اور باہر دروازے پر اعلان لکھ کے لگا دو کہ اعصابی کمزوری کا علاج بذریعۂ عشق کیا جاتا ہے۔''

مہین سنجیدہ ہو کر بولی، ''جتنا چاہو مذاق اڑا لو مگر حقیقت یہی ہے کہ زندگی کا حسین ترین تحفہ عشق ہے۔''

اکرم بولی، ''مذاق کی بات نہیں ہے۔ لیکن میں نے عشق کو تمھاری طرح رومان کی نگاہ سے نہیں دیکھا ہے۔ میں نے عشق کو آنول نال سے لٹکا ہوا دیکھا ہے۔ یہاں تک کہ میں نے عشق کے شگاف میں ٹانکے بھی لگائے ہیں۔ عشق سے ایسا بے تحاشا خون بہتے دیکھا ہے کہ ساری دنیا کی ارگنا مین سے بھی بند نہ ہو۔ میں نے عشق کو خوف کے عالم میں دیکھا ہے، ماں اور باپ کا خوف، بیوی اور بچے کا خوف، حمل ٹھہرنے کا خوف۔ عشق کو حمل ساقط کرانے کے عمل میں دیکھ چکی ہوں۔ اس چاقو کی شکل میں دیکھا ہے جو ران پر زخم ڈال دیتا ہے۔ اور یہ سب محض سونے کے دانت والی ہوم کے ابرو کے ایک

اشارے کی خاطر۔"

مہین نے کہا، "اور یہ آخر والی صورت، جس میں خون بند نہیں ہو رہا؟ یہ تمھاری کون سی خطرناک مریضہ ہے؟"

اکرم ہنسنے لگی۔ "واقعی جاننے کو جی چاہ رہا ہے؟"

"بہت۔"

اکرم بولی، "عشق خون بہنے کی حالت میں... ایک قدیم اور عزت دار گھرانے کی لڑکی ہے۔ سب کچھ کر کے دیکھ لیا، اس کا خون بند ہی نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حاملہ ہے۔ اور یہ بھی یقین ہے کہ اس نے اپنے ساتھ ضرور کچھ کیا ہے۔ لیکن کچھ بتا کے ہی نہیں دیتی۔"

مہین نے کہا، "کسی طرح اس کا اعتماد حاصل کرو۔ اسے بتاؤ کہ اس کی جان کو خطرہ ہے... اس کی ماں سے بات کرو۔"

"اپنے ماں باپ سے تو ایسا ڈرتی ہے کہ کیا کوئی کتے سے ڈرتا ہوگا۔ اگر ہو بھی پا جائیں تو اسے پھاڑ کر رکھ دیں۔ میں نے اسے سب کچھ پوری طرح سمجھایا ہے، لیکن اس کا بس یہی کہنا ہے کہ میں کنواری ہوں اور معائنہ نہیں کراؤں گی۔"

"اسے اسپتال میں داخل کرا دو۔"

دونوں گھر کی طرف واپس مڑیں۔ فوجی چھاؤنی کے پاس انھیں ایک سوار دکھائی دیا جو کمر دہری کیے جھکا ہوا تھا۔ پھر ان کے بھائی نے انھیں آواز دی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف دوڑیں۔ بھائی نے سر پر پگڑی سی باندھ رکھی تھی اور فوجی کمبل کندھوں پر لپیٹے ہوئے، گھوڑے پر سوار تھا۔ مہین مسکرا کر پوچھنے لگی، "یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ ضرور قشقائی قبیلے کے علاقے سے گزر کر آ رہے ہو گے۔ یہ سب اس لیے کیا ہوگا کہ کہیں وہ لوگ پہچان نہ لیں۔"

انھوں نے تین برس سے ایک دوسرے کی صورت نہ دیکھی تھی اور مہین کو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ گھوڑے سے نیچے اتر کر انھیں گلے کیوں نہیں لگاتا۔ آخر وہ اب تک گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ ہر رات اس کے لیے وہی خورش پکائی جاتی تھی جو اسے بچپن میں پسند تھی۔

بھائی بولا، "کسی سے کہنا مت۔ فیروز آباد میں مجھے ملیریا ہو گیا تھا۔ اب بھی بید کی طرح کانپتا

ہوں۔ درد سے سر پھٹا جاتا ہے۔ سپاہیوں کو کارپورل کے سپرد کر کے گھوڑے پر بیٹھ کر یہاں چلا آیا ہوں۔ بیچارہ جانور بھی پسینے پسینے ہو رہا ہے۔'' اس نے سر جھکا کر گھوڑے کی گردن کو چوما۔ پھر کہنے لگا، ''میں چھاؤنی میں اطلاع دے کر گھر آتا ہوں۔'' دونوں بہنیں گھر کی طرف دوڑیں۔ وہ ان سے پکار کر بولا، ''اماں کو مت بتانا کہ میں بیمار ہوں۔'' اور یہ کہہ کر اپنی پگڑی کھول کر مبین کے ہاتھ میں دے دی۔ مبین نے اسے کھول کر دیکھا، یہ پاجامہ تھا جسے وہ پگڑی کی طرح سر پر باندھے ہوئے تھا۔ اکرم بولی، ''اسے مت چھونا۔ کہیں اس میں جوئیں نہ پڑی ہوں۔ اسے ضرور ٹائیفس ہوا ہوگا۔''

مبین کی آنکھ ابھی بمشکل لگی ہوگی کہ گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ گھنٹی بھی بجی۔ پھر کوئی پتھر لے کر دروازے کو زور زور سے پیٹنے لگا۔ یہ آوازیں کتے کے بھونکنے کے شور میں ملی ہوئی تھیں۔ سب گھر والے صحن میں سو رہے تھے۔ مبین نے اماں کے سرہانے سے ان کی نمار کی چادر کھینچ کر سر پر ڈالی اور دروازے کی طرف لپکی۔ اماں اپنے بستر پر اٹھ بیٹھیں اور کہنے لگیں، ''تم رہنے دو۔ میں جا کر دیکھتی ہوں۔ تم زحمت مت کرو۔ ہائے، میرے بچے پر کیسی مشکل پڑی ہے۔'' مبین اور کتا دونوں ایک ساتھ دروازے کے پاس پہنچے تھے۔ بھائی کا گھوڑا دروازے کے پاس طویلے کے کھونٹے سے بندھا کھڑا تھا۔ کپڑے دھونے کی ایک ناند جو سے اور ایک پانی سے بھری ہوئی، اس کے سامنے رکھی تھی۔ جب مبین اس کے پاس سے گزری تو اس نے اپنا ایک سم زمین پر مارا۔ جونہی اس نے دروازہ کھولا، ایک ان گھڑ سے شخص نے اندر داخل ہونے کی کوشش کی۔ مبین نے اس سے کہا، ''ہلنا مت، ورنہ یہ کتا بوٹی بوٹی کر ڈالے گا۔'' دروازے کے اوپر لگے ہوئے بلب کی روشنی اس آدمی پر پڑ رہی تھی۔ عجیب وحشی آدمی تھا! لمبا تڑنگا، سر پر نمدے کی ٹوپی، سیاہ گھیردار شلوار اور اس پر سفید کمر بند۔ ابھی وہ اس کے آنے کا مقصد پوچھنے ہی کو تھی کہ چادر میں لپٹی ایک عورت گلی میں سے سامنے آئی اور منت کرنے لگی، ''مجھے ڈاکٹر صاحبہ سے ملنا ہے۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میری بچی مر رہی ہے۔ تین دن سے سانپ کی طرح بل کھا کھا کر تڑپ رہی ہے۔ گاؤں کی دائی نے سب کچھ کر لیا۔ بچے کا ہاتھ دکھائی دے رہا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے کی چوکھٹ سے سر ٹکرانے لگی۔

سب اٹھ بیٹھے تھے۔ صحن کی بتی جل گئی تھی اور اکرم اپنے بالوں میں بندھی گھونگھر ڈالنے والی

ڈنڈیاں کھولنے میں مصروف تھی۔ مہین نے پوچھا، "جاؤ گی کیا؟"

"اور چارہ ہی کیا ہے۔"

اماں اس سے التجا کرنے لگیں۔ "رات کے دس بج رہے ہیں۔ کرفیو لگنے والا ہے۔ اس وقت کہاں جا رہی ہو؟ صبح تو ہو جانے دو۔ جب تک تم لوٹو گی ڈر کے مارے میری آدھی جان نکل چکی ہو گی۔"

"اماں، مجبوری ہے۔"

مہین بھی کپڑے بدلنے لگی۔

چادر پوش عورت اور اس ان گھڑ آدمی کے ساتھ وہ دونوں روانہ ہوئیں۔ ڈھلتا ہوا چاند گویا پہرے پر کھڑا تھا اور آسمان ستاروں سے روشن تھا۔ مہین، بہن کا بیگ اٹھائے ہوئے، ان تینوں کے تیز تیز بڑھتے ہوئے قدموں کا ساتھ دینے کی کوشش کرتی، گلی کی بجری پڑی زمین پر چلی جا رہی تھی۔ ان کے قدموں کی چاپ کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ یہاں تک کہ پرندے بھی خاموش تھے۔ کوئی راہگیر بھی دکھائی نہ دیا، حالانکہ کرفیو لگنے میں ابھی دو گھنٹے تھے۔ مہین کو تعجب ہو رہا تھا کہ ان کا رخ شمال کی سمت کیوں ہے۔ ان کے مکان کے بعد کئی باغ تھے اور باغوں کے بعد بیابان جو پہاڑی تک چلا گیا تھا۔ مہین نے بہن کو پکارا۔ تینوں رک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے پوچھا، "ان کا گھر کہاں ہے؟" عورت نے جواب میں کہا، "بلوردی سے ذرا پہلے۔" مہین بولی، "بھلا ہوگا کہ ہمیں فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار نہ کروا دو۔" عورت نے کہا، "آپ کی بلا ہمارے سر پر۔ کچھ نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ بہت اچھا ہے۔ ذرا سا چھوویں گی تو میری بیٹی کے بچہ ہو جائے گا۔ بس، اس کے بعد ہم خود آپ کو صحیح سالم آپ کے گھر کے دروازے تک چھوڑنے آئیں گے۔"

وہ ہانپتے ہوئے پہنچے۔ ٹاٹ کا پردہ ہٹایا اور چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئے جو بظاہر گھر کا واحد کمرہ تھا۔ بالکل بھیڑ بکریوں کا باڑا معلوم ہوتا تھا۔ دھوئیں اور غبار سے اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ مہین کو بہت سی عورتیں دکھائی دیں جن میں سے معلوم نہ ہوتا تھا کہ زچہ کون سی ہے۔ کمرے کا آدھا فرش بنا تھا اور آدھے پر چٹائی بچھی ہوئی تھی، جس پر اکرم نے زچہ کو تلاش کر لیا۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو

رہا تھا۔ سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا اور منہ کھلا ہوا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود کو سیدھا نہیں رکھ پا رہی اور اِدھر اُدھر ڈول رہی ہے۔ دو عورتیں اسے کندھوں اور پیٹھ سے سہارا دیے ہوئے تھیں اور بار بار کہتی تھیں، ''کہو یا علی!'' لیکن اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلتا تھا۔ اس میں طاقت ہی نہ تھی۔ سامنے چٹائی پر ایک اینٹ رکھی تھی جس پر کوئلے سے ایک چہرے کا نقش بنا ہوا تھا۔ آنکھیں اور بھنویں کوئلے سے بنائی گئی تھیں اور ہونٹوں اور گالوں کی جگہ لال رنگ تھوپ دیا گیا تھا۔ نقش بہت جلدی میں بنایا ہوا لگتا تھا۔ اس پتلے سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ بچے کو بہلا پھسلا کر پیٹ کے اندھیرے سے باہر دنیا میں آنے پر آمادہ کرے گا۔ اس کے برابر میں ایک انگیٹھی رکھی تھی جس میں اسپند سلگایا جا رہا تھا۔ زچہ کے پیروں کے پاس ایک عورت یوں ہاتھ آگے کو پھیلائے اکڑوں بیٹھی تھی گویا بچے کو باہر آتے ہی تھام لے گی۔ بس اتنی سادہ سی بات! مہین نے غور سے اس عورت کا جائزہ لیا۔ اس کے ہاتھ بڑے بڑے اور گندے تھے اور کلائیوں تک ننگے، اور ان پر قسم قسم کے عجیب نقش گدے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک چھپکلی بنی ہوئی تھی، یا شاید بچھو تھا۔ عورت کے ناخن مہندی سے رنگے ہوئے تھے اور دوسری انگلی میں عقیق کی انگوٹھی تھی۔ ململ کی چادر اوڑھے تھی اور سر پر ہرے حاشیے والا کالا ریشمی رومال باندھ رکھا تھا۔ زور زور سے کہہ رہی تھی، ''یا خضر و یا الیاس، ایں بندہ از آں بندہ خلاص۔''

بچے کو دنیا میں لانے کی یہ واحد کوشش تھی جو کی جا رہی تھی، وہ پیدا ہونے کو تیار معلوم نہ ہوتا تھا اور باہر یہ سب لوگ اس کے منتظر تھے۔ ان منتظر لوگوں میں بچے کا کوئی بہن بھائی بھی تھا جسے انتظار کی شدت سے نیند آ گئی تھی اور وہ زچہ کے سر کے پیچھے چٹائی پر سو گیا تھا۔ باقی سب کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ کر نہیں رہے تھے، بس تماشا دیکھ رہے تھے۔ کمرے کے کونے میں رکھی ہوئی لکڑی کی پیٹی پر تیل کی اونچی سی لالٹین رکھی تھی جس کی لو ہوا میں ٹمٹما رہی تھی۔ لالٹین کا کانچ ایک طرف سے ٹوٹا ہوا تھا اور اسے اخبار کا کاغذ چپکا کر بند کیا گیا تھا۔ کمرے کے واحد طاقچے میں دستے اور پایوں والا ایک سیاہ برتن رکھا ہوا تھا اور ایک کوزہ جس کے کنارے جھڑے ہوئے تھے۔ کمرے کی دیواریں بھوسا ملے گارے کی بنی ہوئی تھیں اور چھت بلّیوں پر ٹکی تھی۔ بلّیوں کے بیچ میں چٹائی لگائی گئی تھی جو جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی لیکن گارا نہیں جھڑ رہا تھا۔ مہین نے دیکھا کہ اس کی بہن نے زچہ کے ہاتھ ہاتھوں میں لے کر چھوڑ دیے اور اونچی آواز میں کہا، ''بڑی مصیبت میں ہے بیچاری۔'' پھر وہ عورتوں کی طرف مڑی اور حکم دیا کہ سب کمرے

سے باہر چلی جائیں اور سماوار میں پانی گرم کریں۔ عورتوں نے ادھر اُدھر جنبش کی لیکن کمرے سے باہر نہ گئیں۔ مہین کو معلوم نہ ہوا کہ کس کونے سے ایک عورت نکل کر آئی جس نے سر پر قرآن رکھا ہوا تھا۔ وہ اکرم کے پاس پہنچ کر بولی: "قربانت شوم، کیسا سماوار؟" مہین نے طاقچے سے پانی کا کوزہ اتارا۔ اکرم نے اپنے بیگ میں سے صابن نکالا۔ کمرے کا دروازہ کھولا گیا۔ کسی آدمی کے اذان دینے کی آواز سارے صحن میں بھری ہوئی تھی۔ اکرم نے اسپند سلگانے والی انگیٹھی اور اینٹ باہر صحن میں ڈال دی اور پھر مہین نے کوزے کے پانی سے اس کے ہاتھ دھلوائے۔ اکرم نے اس عورت کو جو سر پر قرآن رکھے ہوئے تھی ہدایت کی: "اس بچے کو یہاں سے اٹھاؤ۔" عورت زچہ کے پاس سوتے ہوئے بچے کی طرف دیکھ کر بولی: "میرا بچہ شور مچانے لگے گا۔" مہین نے بچے کو گود میں لے لیا۔ القلی کی تیز بو سے اس کی طبیعت مالش کرنے لگی۔ ایک عورت نے لکڑی کی چٹی پر رکھی لالٹین اٹھالی اور مہین نے بچے کو چٹی پر تقریباً پٹک دیا۔ کمرے میں ہر طرح کی بوئیں پھیلی تھیں۔ سڑے ہوئے گوشت کی، سلگتے ہوئے اسپند کی، زچہ کے بدن کی، تمباکو اور مویشیوں کے گوبر کی بدبو۔ لیکن بچے سے اٹھتی ہوئی بساند مہین کے لیے ان سب سے زیادہ ناقابل برداشت تھی۔

اکرم نے زچہ کو چٹائی پر اسی حالت میں لٹا دیا تھا۔ گاؤں کی دایہ کی آواز اب تک متواتر کانوں میں پڑ رہی تھی: "یا خضر و یا الیاس۔ ۔ ۔" مہین نے متلی روکنے کے لیے سر اوپر اٹھالیا اور چھت کی کڑیوں کو گننے کی کوشش کرنے لگی، لیکن اندھیرا تھا۔

اکرم کے اشارے پر اس نے بیگ سے ٹارچ نکالی اور اس کی روشنی چٹائی پر لیٹی ہوئی زچہ کے بدن پر ڈالی۔ اکرم نے دستانے پہن لیے تھے۔ گاؤں کی دایہ زچہ کے پاس سے اٹھ گئی تھی اور دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ایک بار مہین نے متلی روکنے کے لیے سر اٹھایا تو اس پر نظر پڑی۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ کیسی عجیب نگاہ تھی! یہ کسی جوان پر پڑنے والی عمر رسیدہ شخص کی نگاہ نہ تھی، نہ کسی ناخواندہ شخص کی دانا پر ڈالی ہوئی نگاہ تھی۔ یہ کسی بھیڑیے کی سی نگاہ تھی جس سے وہ کسی نوعمر بھیڑ کو دیکھتا ہے۔ اکرم پسینے پسینے ہو رہی تھی۔ اس نے زچہ کو انجکشن لگایا اور اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر زور سے پیٹ دبایا۔ پھر دائرے کی شکل میں پیٹ پر دونوں ہاتھوں سے دباؤ ڈالا۔ عورت کا پیٹ اس کے ہاتھ کے نیچے لرز رہا تھا۔ وہ عورت کی کھلی ہوئی ٹانگوں کے تقریباً بیچ میں بیٹھی تھی۔ سفید گاؤن پہن

رکھا تھا۔ مہین نے اسے گاؤن پہنتے نہیں دیکھا تھا۔ مہین کے ذمے ٹارچ سنبھالنے کا کام تھا۔ بالوں بھرے شگاف میں سے ایک ننھا سا خون آلود ہاتھ باہر کو نکلا ہوا تھا۔ شگاف سے خون بہہ رہا تھا۔ مہین پر خوف طاری ہو گیا۔ عورتیں آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں اور گاؤں کی دایہ کا "یا خضر و یا الیاس..." کا وظیفہ جاری تھا۔ مہین کو ڈر تھا کہ بچہ جلد پیدا نہیں ہوگا اور انھیں صبح تک یہیں رکنا پڑ جائے گا۔ اسے پتا نہ چلا کہ اس کی بہن نے پیٹ نے اندر بچے کا رخ کس طرح پھیر دیا۔ اس نے اکرم کو بچے کا ہاتھ دبا کر اندر کرتے ہوئے دیکھا، گو اس کی کوشش تھی کہ اُس طرف نہ دیکھے۔ کمرے میں موجود ساری عورتیں تماشا دیکھنے میں محو تھیں۔ یہاں تک کہ وہ عورت بھی جو سر پر قرآن رکھے ہوئے تھی۔ معجزہ ہو گیا۔ کسی کو پتا نہ چلا کہ اکرم نے کیا ترکیب کی کہ شگاف میں سے کالے بالوں والا سر ظاہر ہوا۔ بالکل شعبدہ سا لگتا تھا۔ اکرم نے دوبارہ زچہ کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دبایا۔ وہ عجیب طور سے پیٹ کو دبا رہی تھی اور پسینہ پہنے کی حالت میں چیخ چیخ کر عورت سے کہہ رہی تھی، "زور لگاؤ! ڈرو مت! اور زور لگاؤ!" عورت میں بالکل جان نہ تھی۔ اس کے منھ سے نکلا، "یا جدّہ سادات!" اکرم نے کہا، "تم زور نہیں لگاؤ گی تو بچے کا دم گھٹ جائے گا۔" عورت نے اپنے ہونٹ دانتوں میں دبا لیے۔ وہ پیروں میں پیوند لگی لمبی جرابیں پہنے تھی جنھیں سمیٹ کر اس کی پنڈلی سے نیچے کر دیا گیا تھا۔

ایک دم اکرم نے بچے کو باہر کھینچ لیا۔ گوشت کے اس لمبے سے لوتھڑے کو پیروں سے پکڑ کر اٹھایا اور ماں کے پیٹ کے اوپر ہلانے لگی۔ کس قدر بھیانک لگ رہا تھا۔ ماں نے چٹائی سے اپنا سر تھوڑا سا اوپر اٹھا لیا اور دیکھنے لگی۔ جب بچہ چیخ مار کر رویا تو اکرم نے اسے ماں کے پیٹ پر رکھ دیا۔ عورت ہنسنے لگی، جیسے اسے گدگدی ہو رہی ہو۔

اکرم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا سفید گاؤن خون میں لتھڑ گیا تھا۔ مہین تک کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ اکرم کے ہاتھ کہنیوں تک خون میں لت پت تھے۔ جو عورت قرآن سر پر رکھے ہوئے تھی آئی اور آ کر اکرم کے خون آلود ہاتھوں کو چومنے لگی۔

جب زچگی کا کام نمٹ گیا تو مہین نے پانی کا کوزہ دوبارہ اٹھایا، لیکن اس میں اب پانی کا ایک قطرہ نہ تھا۔ اکرم نے پوچھا، "ہاتھ کہاں دھوؤں؟" کسی نے اس کی بات پر توجہ نہ دی۔ جو لحیم شحیم آدمی انھیں لے کر آیا تھا اب کمرے میں آ گیا تھا اور بچے کو ہاتھوں میں لیے ہنس رہا تھا۔ عورتیں بھی اس کے

گرد جمع تھیں اور ان کے سر ایک دوسرے کے بالکل قریب آ گئے تھے۔ مہین کو یقین تھا کہ ضرور اس کی بہن کے مختنا نے کے بارے میں مشورہ ہو رہا ہوگا۔ بظاہر گاؤں کی دایہ کو دیے جانے والے معاوضے پر بحث ہو رہی تھی جو غصے میں اپنے بازو لہرا رہی تھی۔ مہین نے دل میں سوچا، "اس عورت کو کچھ نہیں ملنا چاہیے۔ میں اسے کچھ نہیں لینے دوں گی۔" آخر وہ عورت جو قرآن سر پر رکھے تھی ان کے پاس آئی اور بتانے لگی کہ وہ اپنے ہاتھ اس نہر میں دھو سکتے ہیں جو گھر کے سامنے سے گزرتی ہے۔ اب اس کے سر پر قرآن نہیں رکھا تھا۔

دونوں بہنیں گھر سے باہر آئیں۔ تھکن سے اس قدر چور تھیں کہ پیروں پر کھڑے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہاتھ منہ دھویا تو کچھ جان میں جان آئی۔ اندھیرے، خنک پانی کے پاس سے ہٹنے کو ان کا دل نہ کرتا تھا۔ نہر کے کنارے بیٹھ گئیں۔ وہ اس اجنبی مقام پر اکیلی تھیں۔ اس نہر کے پاس بیٹھی تھیں جو معلوم نہیں کہاں سے آتی تھی اور کہاں جاتی تھی۔ اکرم کس قدر خوش تھی۔ ہنسے جا رہی تھی۔ مہین نے ہیولے جیسی پہاڑی کو دیکھا اور پھر آسمان کو، جو پہاڑی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ سوچنے لگی کہ ان دونوں کے عشق کا ثمر کیا ہوگا؟ آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے؟ بارآور ہونے والی زمین؟ نہر میں کنکناتا ہوا پانی؟ اس نے اکرم سے، جو اپنے پیر پانی میں ڈالے بیٹھی تھی، پوچھا، "تو تم نے عشق کو دیکھا؟"

"ہاں۔"

"کس طرح؟"

"اسپند سلگانے والی انگیٹھی میں۔ زچہ کے سامنے رکھی اینٹ پر بنے ہوئے نقش میں۔"

مہین اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی، "نہیں۔ یہ ایک تھکے ہوئے آدمی کا نقطۂ نظر ہے۔ میں نے اس مویشیوں کے باڑے تک میں عشق کو پھول کی طرح کھلتے ہوئے دیکھا ہے۔ جب تم نے بچے کو ماں کے پیٹ پر رکھا تب میں نے ماں کی مسکراہٹ میں اسے دیکھا تھا۔ اور مرد کی ہنسی میں..."

جب انھوں نے گھر میں دوبارہ داخل ہونا چاہا تو انھیں دروازہ بند ملا۔ دستک دی تو کوئی جواب نہ آیا۔ دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا مگر اندر سے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ یوں لگتا تھا جیسے گھر کے تمام لوگ مر چکے ہوں۔ اندر سے نہ کوئی آواز آ رہی تھی اور نہ کوئی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ انھوں نے زمین سے پتھر اٹھا کر

دروازے کو زور زور سے کوٹا، لیکن کسی نے ان کے لیے دروازہ نہ کھولا۔ رات کے پچھلے پہر میں خوف نے ان کے دلوں کو جکڑ لیا۔ اکرم نے چلا کر کہا، ''کم سے کم میرا بیگ تو مجھے دے دو۔'' کوئی جواب نہ آیا۔ پھر بولی، ''تمھارے کس کام کا ہے؟'' اس بار التجا کے لہجے میں بولی، ''میرا کریو پاس بھی اس میں ہے۔ کم سے کم وہ تو دے دو۔'' خاموشی چھائی رہی۔ صرف دروازے کے بجنے کی آواز تھی جو رات کے اندھیرے میں پہاڑی سے ٹکرا ٹکرا کر گونج رہی تھی۔ اور بس۔ کوئی باہر نہ نکلا۔ مہین نے چیخ کر کہا، ''اس نے تمھاری بیٹی کی جان بچائی ہے۔ اس کا بیگ تو واپس دے دو۔'' اسے رونا آ گیا اور پھر اپنے ہی رونے سے خوف محسوس ہونے لگا۔ بہن نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں اور بولی، ''چلو رہنے دو۔ بیچارے غریب ہیں۔ دیکھا نہیں تھا کیا حالت تھی؟ کیسے پھٹے پرانے چیتھڑوں میں بچے کو لپیٹا تھا؟''

انھوں نے چلنا شروع کیا۔ خوف کے مارے ان کے دانت بج رہے تھے۔ پھر وہ دوڑنے لگیں۔ دوڑتیں، لڑکھڑا کر گرتیں، پتھروں سے ٹھوکریں کھاتیں، پھر دوڑنے لگتیں۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے دوڑ رہی تھیں۔ اکرم بولی، ''ڈرو مت، ابھی پہنچ جائیں گے۔'' حالانکہ اسے بھی پتا تھا اور مہین کو بھی کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ نہ ستارے، نہ پتھر، نہ ٹیلیگراف کے کھمبے، کوئی چیز حرکت کرتی معلوم نہ ہوتی تھی۔ کسی شے سے ہمدردی نہ جھلکتی تھی۔ آخر وہ رک کر ہانپنے لگیں۔ ایک پتھر پر بیٹھ گئیں۔ اکرم بولی، ''ہم بلاوجہ ڈر رہے ہیں۔ یہاں کوئی ہے ہی کہاں جس سے ڈریں۔'' مہین نے کہا، ''اگر وہ وحشی ہمارے پیچھے یہاں تک آ گیا تو میں تو خوف سے مر جاؤں گی۔'' اکرم بولی، ''ڈرو مت۔ وہ نہیں آئے گا۔ جو کچھ ہمارے پاس تھا وہ تو وہیں رہ گیا۔ اب آ کے کیا کرے گا؟'' مہین نے کہا، ''نہیں، وہ آئے گا۔ آ کے ضرور ہمارے سر کوئی بلا لائے گا۔ میں نے اس کی آنکھیں دیکھی تھیں، بالکل گدھ کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔''

وہ پھر اٹھ کر دوڑنے لگیں۔ صرف ان کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز رات میں سنائی دے رہی تھی اور خاموشی کو پارہ پارہ کر رہی تھی۔ ابھی وہ پہلے باغ تک ہی پہنچی تھیں کہ ایک کرخت آواز نے چلا کر حکم دیا، ''رک جاؤ! ہلنا مت!'' مہین بولی، ''دیکھا بہن، آ گیا نا؟ میں نے کہا نہیں تھا؟'' یہ کہہ کر وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اکرم اس کے پاس کھڑی رہی۔ ایک ٹارچ کی روشنی ان پر پڑی۔ دو آدمی تھے۔ مہین خوشی سے چلائی، ''آپ لوگ ہیں؟'' ان میں ایک پولیس والا تھا اور دوسرا فوجی۔ فوجی بولا، ''ٹھیک ہے،

آگے چلو۔ رات کو اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں؟" اکرم نے وضاحت کی، "میں شہر کی دایہ ہوں۔" اور پھر پورا ماجرا سنایا۔ فوجی نے کہا، "تمھارے پاس کارڈ ہونا چاہیے۔ کارڈ کہاں ہے؟" اکرم بولی، "ابھی بتایا تو ہے کہ میرا کارڈ اور بیگ اور ٹارچ اور سب کچھ ان لوگوں نے رکھ لیا۔" فوجی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی، لیکن پولیس کا سپاہی بالکل ساکت رہا۔ اب وہ چلتے چلتے ان کے گھر کے پاس پہنچ گئے تھے۔ مہین نے کہا، "یہ رہا۔ یہ ہے ہمارا گھر۔ آپ لوگوں کو پہچاننا چاہیے کہ ہم کون ہیں۔ ہم ابھی تک سوگ میں ہیں۔ دیکھتے نہیں ہم نے کالے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ ہمارا بھائی بھی فوج میں افسر ہے۔ ہمیں جانے دیں۔ ہماری اماں ہول کے مارے جان دے دیں گی۔"

فوجی بولا، "یہ سب کچھ افسر اعلیٰ کو بتانا۔ مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ جو کوئی باہر پھرتا دکھائی دے اسے گرفتار کر کے لے آؤ۔" پولیس والا ہچکچا رہا تھا لیکن فوجی سے خوفزدہ بھی تھا۔

وہ زند چوک سے گزرے۔ چوک کی بڑی سڑک اور بند دکانیں پیچھے رہ گئیں۔ پولیس والا خاموشی سے ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ فوجی کبھی آگے آگے اور کبھی ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا مسلسل بول رہا تھا۔ کہنے لگا:

"تم لوگ تیسرے ہو جنھیں میں نے آج رات پکڑا ہے۔" پھر بولا، "تمھیں صبح تک رکھیں گے۔" پھر وہ کچھ زیادہ بے تکلف ہو گیا۔ بولا، "سچ سچ بتاؤ، کہاں سے آ رہی ہو؟ اگر سچ سچ بتا دو گی، اور اس میں ہمارے لیے بھی کچھ ہو گا، تو چھوڑ دیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے آنکھ ماری۔ پولیس والا پہلی بار زور سے بولا، "شرم کرو۔ ان کے مرحوم باپ..."

"تو یہ سچ کہتی ہیں؟"

"بالکل سچ کہتی ہیں۔ ان کا سیاہ لباس نہیں دیکھتے ہو؟"

"مجھے ان چیزوں کا کچھ پتا نہیں۔ یا تو ان کے پاس کارڈ ہونا چاہیے، یا پھر تھانے چل کر حساب کتاب دیں۔"

تھانے پر سب لوگوں نے انھیں پہچان لیا۔ نگراں افسر نے ان کے لیے چائے منگوائی جو نہیں آئی۔ جب انھوں نے سارا ماجرا پھر سے سنایا تو اس نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور اپنی آنکھیں پونچھنے لگا۔ اس نے فوجی کو ایک تھپڑ بھی مارا، اور دوسرا مارنے کو تھا کہ اکرم نے اسے روک لیا۔ مہین نے

Scanned with CamScanner

سوچا، ''اگر میں اس افسر کی جگہ ہوتی تو مار مار کے اس کا کچومر نکال دیتی۔''

وہ ہمیشہ عشق کی باتیں کیا کرتی تھی، لیکن اس وقت اس کا دل عشق اور ہمدردی سے بالکل خالی ہو چکا تھا۔

انھیں گھوڑا گاڑی میں گھر پہنچایا گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی انھوں نے اماں کو دیکھا جو صحن میں پھولوں کی کیاریوں کے پاس بیٹھی رو رہی تھیں۔ ان کا بھائی کپڑے بدل کر تیار ہو چکا تھا اور اس نے اماں کی کالی چادر اپنے سر پر باندھ رکھی تھی۔ وہ گھوڑے پر زین ڈال رہا تھا۔ انھیں دیکھتے ہی اس نے گھوڑے کی گردن کو تھپتھپایا۔ اماں نے اٹھ کر ان دونوں کو گلے سے لگایا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

مہین نے ابھی لیٹ کر اپنے سر پر چادر کھینچی ہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی پھر بجی۔ بھائی کا گھوڑا ہنہنایا۔ پڑوسیوں کے مرغے بانگ دینے لگے تھے۔ کیا یہ بے وقت بانگ دے رہے تھے یا سچ مچ صبح ہو رہی تھی؟ کسی نے دروازے کی گھنٹی دوبارہ بجائی۔ وہ کسی طرح اٹھ کر دروازے تک پہنچی اور اسے کھولا تو سامنے ایک خوش وضع اور خوش پوش عورت کھڑی تھی اور اس کے ساتھ ایک خوش قیافہ نوکر بھی تھا۔ عورت نے اسے سلام کیا اور نوکر نے اپنی ٹوپی اتار کر ہاتھ میں لے لی۔ عورت نے کہا، ''ہم ڈاکٹر صاحبہ کو لینے آئے ہیں۔ آقافلاں کے گھر سے۔ نسرین خانم کے پھر خون جاری ہو گیا ہے اور وہ بے ہوش ہو گئی ہیں۔ اگر وقت سے نہ پہنچے تو کہیں ان کی جان...''

❁ ❁

عالمی ادب کا سہ ماہی جریدہ

سہ ماہی ''آج'' کی اشاعت ستمبر ۱۹۸۹ء میں شروع ہوئی اور اب تک اس کے ۴۹ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ''آج'' کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابریئل گارسیا مارکیز، ''سرائیوو سرائیوو'' (بوسنیا) اور ''کراچی کی کہانی'' کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

''آج'' کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں اور ''آج کی کتابیں'' اور ''سٹی پریس'' کی شائع کردہ کتابیں ۵۰ فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔

شرحِ خریداری: چار شماروں کے لیے: تین سو روپے

مستقل خریدار بننے کے لیے اپنے مکمل پتے کے ساتھ تین سو روپے کا منی آرڈر مندرجہ ذیل پتے پر ارسال کیجیے:

سٹی پریس بک کلب

316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

۵۰

قیمت
۸۰ روپے

آج کی کتابیں
۳۱۹ مدینہ ٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،
صدر، کراچی ۷۴۴۰۰

Scanned with CamScanner